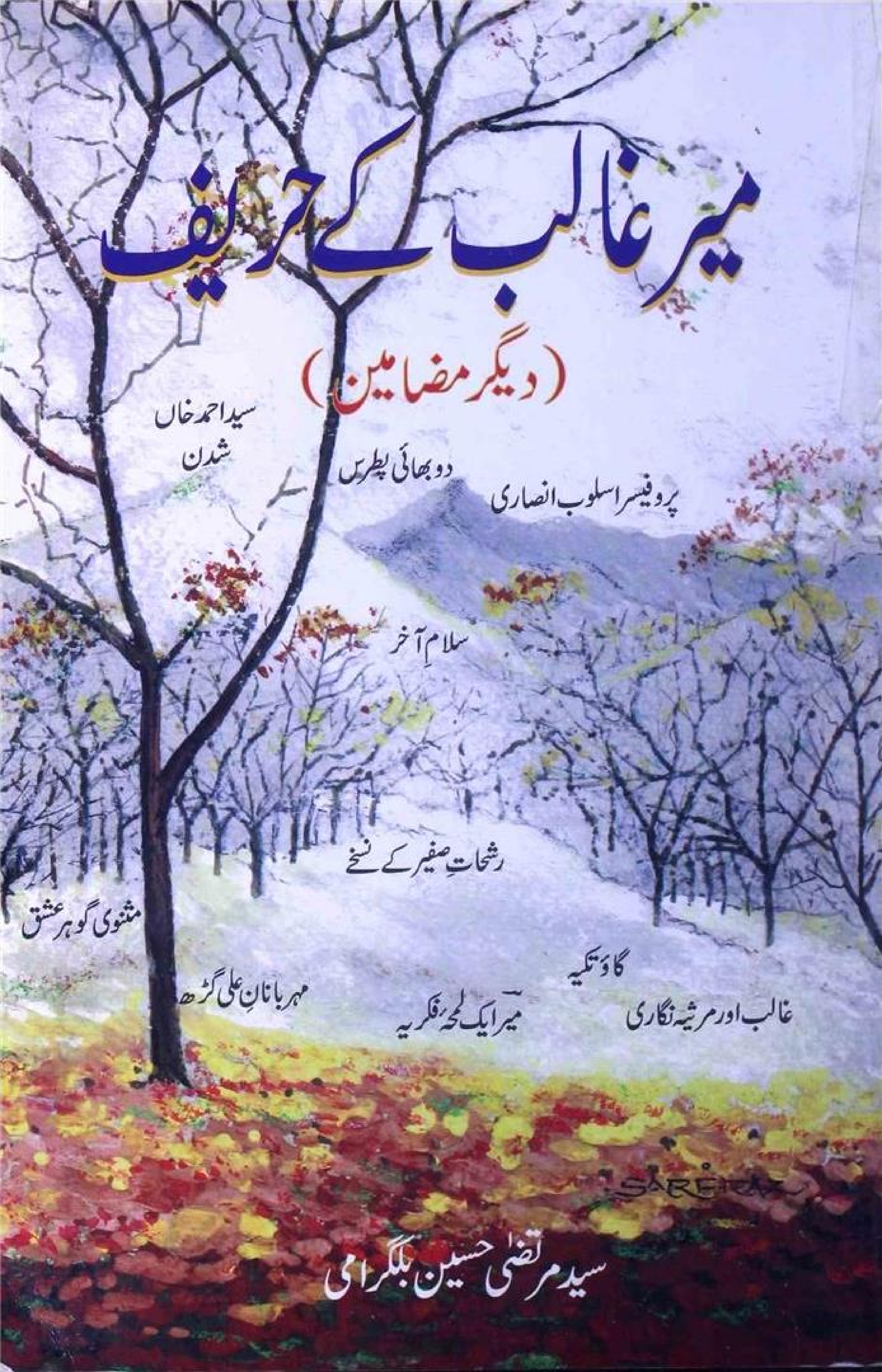


میر غالب کے حریف

(دیگر مضامین)

سید احمد خاں
شدن

دو بھائی پطرس

پروفیسر اسلوب انصاری

سلامِ آخر

رشحاتِ صفیر کے نسخے

مثنوی گوہر عشق

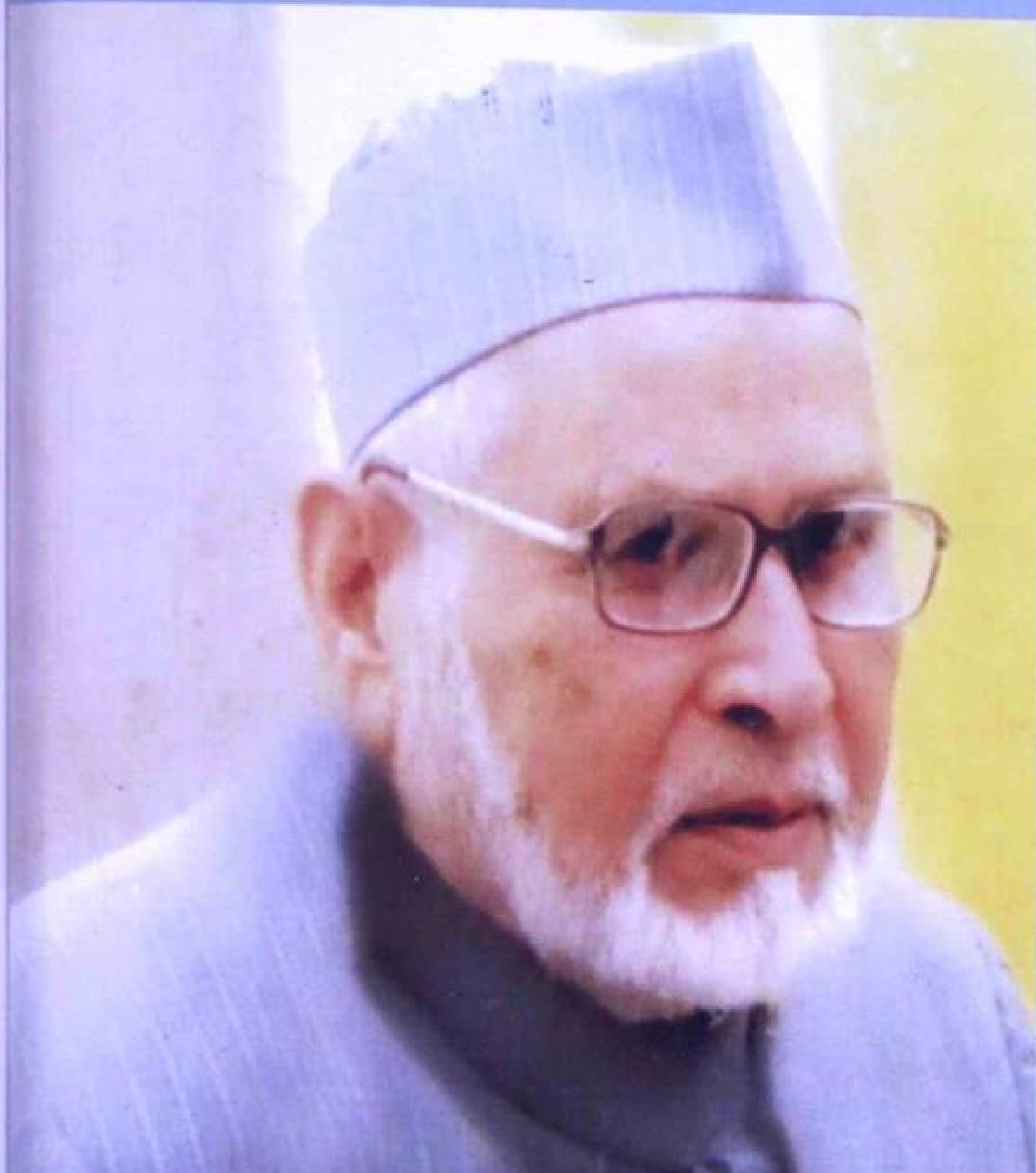
گاؤ تکیہ

مہربانانِ علی گڑھ

میر ایک لمحہ فکریہ

غالب اور مرثیہ نگاری

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی



سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

میر غالبؔ کے حریف

(دیگر مضامین)

الحاج سید مرتضٰی حسین بلگرامی

بک سینٹر، دگّی روڈ، علی گڑھ

نام کتاب : میر غالب کے حریف

مؤلف : الحاج سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

سال اشاعت : ۲۰۱۳ء

قیمت : ۲۵۰ روپے

صفحات : ۳۱۲

کمپوزنگ اینڈ پرنٹنگ : مشکوٰۃ پرنٹرس، علی گڑھ، 09897674550

ناشر : بک سینٹر، ڈگی روڈ، علی گڑھ

ملنے کے پتے : ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

نئی کتاب پبلشرز (D-24) کالندی کنج روڈ،

پارٹ نمبر ۱، ابوالفضل انکلیو، پارٹ ۱،

جامعہ نگر، نئی دہلی – ۲۵

انتساب

دانشورانِ اُردو کے نام

میر غالب کے حریف

(دیگر مضامین)

فہرست مضامین

پیش لفظ

سید مرتضٰی حسین بلگرامی، عمر کی اسّی سے زائد منزلیں طے کیے، ذہنی اور علمی طور پر متحرک اور فکر مند اور طولِ عمر کی مسافت سے بے نیاز چاق و چوبند آج بھی کسی نہ کسی علمی نکتے کی تلاش و جستجو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کم سے کم تین دہائیاں گزریں جب میں علمی اور ادبی طور پر متحرک ہوا، بلگرامی صاحب کو اپنا مشفق اور کرم فرما پایا۔ عین ممکن ہے موصوف کے اس رویے میں میرے سسرالی عزیزوں سے ان کے خاندانی مراسم کا بھی کچھ دخل رہا ہو۔

بلگرامی صاحب کی دلچسپی کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ وہ علمی اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ شیعہ عقائد، روایات اور شخصیات کے علمی اکتسابات سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں اور مختلف مسالک اور عقائد سے علی العموم بھی ان کو سروکار رہتا ہے۔ زیرِ نظر مضامین کے مجموعے کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اب ذرا اسی پہلو پر غور کر لیا جائے تو بعض عجیب انکشافات ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی بات کہ اردو میں بھی اب لوگ یک فنتہ ہونے لگے ہیں۔ تنقید لکھتے ہیں تو تنقید و تبصرہ کے علاوہ کسی اور اسلوب اور اندازِ تحریر سے رابطہ نہیں رکھتے۔ بعض لوگ سوانحی یا تذکرہ نگاری جیسا انداز اختیار کرتے ہیں اور تنقید اور تعینِ قدر سے لاتعلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ شاعری کرتے ہیں تو نثر سے خدا واسطے کا بیر اور نثر نگاری کو اپنا شغف بنایا تو شاعری سے محض لاتعلق ہی نہیں رہتے، طبیعت تک موزوں نہیں بن پاتی۔ اس پوری صورت حال میں اگر ہمیں کوئی ایسا مصنف نظر آ جاتا ہے جو ہر طرح کے موضوع پر اس موضوع کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے، حاصل مضامین لکھ سکے تو اسے مغتنم روزگار ہی قرار نہ دیا جائے تو کیا کہا جائے۔ ان کی کئی دہائیوں کے معمولات بتاتے ہیں کہ وہ جہاں کہیں بھی رہے اور جس طرح کے فرائض منصبی میں مصروف رہے، کبھی لکھنے پڑھنے اور علمی تلاش و جستجو سے لاتعلقی اختیار نہیں کی۔ یہ اس زمانے کے ایک انسان کی بات ہے جس میں کوئی شخص مالی یا مادّی منفعت کی امید کے بغیر اپنا ایک لمحہ بھی صرف کرنا تضیعۂ اوقات سمجھتا ہے۔ اس پس منظر میں ان کی ہر علمی کاوش ایک الگ معنویت کی حامل بن جاتی ہے۔

بلگرامی صاحب یوں تو اپنی ملازمت میں دفتری کاموں سے وابستہ رہے، مگر ان کی حیثیت رابطہ عامہ کے سربراہ کی بھی رہی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کے معاون و مددگار کی بھی۔ انھوں نے یوں تو متعدد شیوخ الجامعہ کی صحبت میں اپنے فرائض انجام دیے، مگر اردو اور عربی کے عالم بے بدل اور ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز دانش ور ڈاکٹر عبدالعلیم سے ان کا تعلق طویل بھی رہا اور متنوع بھی۔ ان کی قیادت میں انھیں زندگی کے سرد و گرم کو چکھنے اور یونیورسٹی کے علاوہ ترقی اردو بیورو (متعلق وزارت تعلیم ہند) کے ادارے کے بھی دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ راقم الحروف نے خود بھی زمانۂ طالب علمی میں ڈاکٹر عبدالعلیم کو کم گو اور حد سے زیادہ خاموش طبع دیکھا۔ مگر ان کی تحریریں پڑھیے تو ان کے باساختہ اندازِ بیان کا بھی اثر پڑتا ہے اور سہولیتِ اظہار کے ساتھ زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس بھی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے پروفیسر عبدالعلیم کے اسلوب زیست اور انداز تحریر دونوں سے اثر قبول کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مضامین، جو عام سوجھ بوجھ کی مدد سے لکھے جانے کا تاثر قائم کر سکتے تھے، ان میں علیم صاحب ہی کے انداز کے علم و دانش اور فکری عمق کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے سوا پروفیسر خسرو اور سید حامد صاحب جیسے دانشوروں کی ہمراہی کا بھی شرف حاصل رہا۔

بلگرامی صاحب نے 'بولتی ہوئی خاموشی' کے عنوان سے پروفیسر عبدالعلیم کا جو قلمی خاکہ لکھا ہے، وہ علیم صاحب کے مزاج، افتادِ طبع، کم آمیزی، خاموشی اور گویائی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ پھر یہ کہ خاکے کی شخصیت سے جب لکھنے والے کو قلبی لگاؤ ہو تو اپنے آپ خاکہ شش جہت بھی ہو جاتا ہے اور ذاتی و جذباتی پہلو کی آمیزش اسے دو آتشہ بھی بنا دیتی ہے۔ علیم صاحب کی شخصیت پر اس سے بہتر ان کا خاکہ ملنا شاید ناممکن سی بات ہو۔

شاید یہ چیز عین متوقع معلوم ہو کہ بلگرامی صاحب کو بلگرام کی اہم علمی شخصیات کے ساتھ اس سرزمین کے علمی پس منظر سے بھی خاصی گہری دلچسپی ہے۔

بلگرام کے اہل علم و عرفان اور ادباء کی فہرست طویل ہے۔ ان میں سید مرتضیٰ حسین زبیدی بلجرامی علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی، سید مبارک محدث بلگرامی، ڈاکٹر سید علی بلگرامی، سید صاحب عالم صاحب مارہروی، پروفیسر سید علی احسن مارہروی، سید اولاد حید رفوق بلگرامی وغیرہ قابل شخصیتوں، شہرت علمی و دانشوری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس ذیل میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا فرمان حرفِ آخر کا درجہ رکھنے کے لائق ہے، کہ ''بلگرام اہل علم'' پیدا کرتا

ہے، ''علی گڑھ بناتا'' ہے۔ اب بنانے اور پیدا کرنے کے فرق کو خود سمجھ سکتے ہیں۔

چنانچہ معاملہ خواہ صفیر بلگرامی اور قدر بلگرامی، تلامذۂ مرزا غالب کا ہو یا سید وصی احمد فانی بلگرامی اور آرزو بلگرامی کا، ان کے وسیلے سے بلگرام کی علمی و شعری روایت کی بازیافت کا سلسلہ موصوف نے ہمیشہ قائم رکھا۔ انھیں شاد عظیم آبادی کا یہ پہلو سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے اور مشفق خواجہ کی علم دوستی اور انہماک مطالعہ کے ساتھ صفیر بلگرامی پر ان کی ریسرچ بلگرامی صاحب کے مشفق خواجہ سے روابط کا بنیادی وسیلہ بن جاتی ہے۔

انھوں نے میر تقی میر اور مرزا غالب سے متعلق جو مضامین لکھے ہیں وہ ہر چند کہ بلگرامی صاحب کے مزاج سے الگ ہیں مگر ان میں بھی رچے ہوئے ادبی مذاق کی چاشنی ہے، شعر فہمی کا انداز ہے اور سچے معنوں میں ایک سخن شناس کا ردِ عمل ملتا ہے۔ اردو میں شاعری کو پڑھنے، اچھا قاری بن کر دکھانے اور حسی اور جذباتی طور پر شاعری کا اثر قبول کرنے والے کم ملتے ہیں۔ ہر لکھنے والا ایک نقاد کا منصب ادا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جب کہ اصل چیز نقاد ہونا نہیں، ادب فہمی اور ادبی شعور ہے۔ بلگرامی صاحب جیسا کوئی ہمہ جہت نثر نگار جب اپنے ادبی شعور اور شعر شناسی کا ثبوت دیتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شعر و ادب کا ذوق انسان کی شخصیت میں کیسی شائستگی، رچاؤ، تہذیب و ثقافت کا شعور اور مجموعی طور پر ذہنی بیداری پیدا کر دیتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں کئی انداز اور کئی اسالیب کے مضامین شامل ہیں، اس لیے مصنف کو یک رُخا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مصنف جہاں، مشفق خواجہ، رشید احمد صدیقی، نجیب اشرف یا سید آل عبا حضرت آواہ پر شخصی نوعیت کے مضامین، یادوں کی بازیافت کے اندز میں لکھ کر ان میں تخلیقی شان پیدا کر دینے کا اہل ہے، وہیں مہربانانِ علی گڑھ کے عنوان سے مسلم یونیورسٹی کی بعض ناقابلِ فراموش ہستیوں سے متعلق یادوں کو تازہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں وہ اپنے ادبی اور شعری ذوق کا ثبوت میر تقی میر، مرزا غالب، غلام غوث بے خبر اور صفیر بلگرامی کی ادبی کاوشوں کے تعینِ قدر کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ وہیں وہ بعض تہذیبی شخصیتوں اور نمائندہ مذہبی علماء کو بھی اپنے معاشرے کی تہذیب و شائستگی کی تشکیل میں معاون و مددگار دکھانے سے گریز نہیں کرتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زیرِ مطالعہ مجموعہ میں بعض مضامین اس قدر سامنے کی باتوں

سے سروکار رکھتے ہیں کہ کتاب میں پھر بھی ان کی شمولیت کا کوئی جواز فراہم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں تک سوال مذہبی شخصیات اور بعض معاصر علماء، جیسے حضرت مولانا سید علی نقی صاحب وغیرہ کا ہے تو اس نوع کی شخصیات سے عقیدت کے باوجود بلگرامی صاحب نے ان سے متعلق اظہار خیال میں خاص طرح کی غیر جانب داری بھی برتی ہے، جو بہر حال قابلِ تعریف ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر شہریار اور سید آل عبا (حضرت آوارہ) کا شمار اردو شعروادب کی نمائندہ شخصیات میں ہوتا ہے۔ بلگرامی صاحب نے ان کی ادبی حیثیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ اپنے روابط کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ جس کے سبب ان مضامین میں شخصی اور انسانی وابستگی کا پہلو بھی شامل ہو گیا ہے۔

مجموعی طور پر مضامین کا یہ مجموعہ ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ذاتی مراسم سے لے کر ادبی اور تہذیبی زندگی کی پُرکشش جھلکیاں ہر جگہ کتاب کو منور کیے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف کو خالص ادبی اور تنقیدی تحریریں لکھنے اور اسی نوع کے ردعمل کا اظہار کرنے کی عادت ضرور ہے۔ مگر اسے معلوم ہے کہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات کیسے ہوتا ہے اور انسانی اظہار کے کتنے ایسے پہلو ہیں جن کو اسی تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ احاطۂ تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ ان معروضات کے ساتھ، میں سید مرتضیٰ حسین صاحب بلگرامی کی اس علمی و ادبی کاوش کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس کتاب میں شامل مضمون کی ہمہ جہتی اور رنگارنگی کو انبساط بخش تصور کرتا ہوں۔

الحاج پروفیسر ابوالکلام قاسمی
سابق ڈین وصدر شعبۂ اُردو
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۵/مارچ ۲۰۱۳ء

اپنا آپ

نام : سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

ولدیت : الحاج سید ابو محمد صاحب بلگرامی (علیگ)

مولد : پٹنہ سٹی

والدہ : سیدہ کرم فاطمہ بلگرامی نبیرہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

تاریخ پیدائش: ۲۵/ اگست ۱۹۲۵ء

وطن : ہندوستان (مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے۔ مومن کا مقام ہر کہیں ہے)

تعلیم : بقول تسنیم سلیم چھتاری۔ ''قطعی نہیں''، ویسے ابتدائی تعلیم 'چٹائی' کی حاصل کی۔ اس کے بعد درس نظامیہ کے حصول کے لیے مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام ملحقہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے درجہ آخر فوقانیہ کی کامیابی کے بعد مولوی تک کی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سٹی سے حاصل کی۔ پٹنہ کے قیام میں جہاں اور اہل علم سے ملاقات ہوئی وہیں مختار الدین احمد صاحب جو مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے طالب علم تھے۔ ان سے بھی روابط قائم ہو گئے، دراصل مدرسے خانقاہ کبیریہ کی طالب علمی کے دوران۔ ہمارے ہم سبق اور ہم درجہ، جن کا نام کلیم سہسرامی تھا۔ ہم دونوں محض باجماعت نہ تھے۔ ہم خیال و ہم فطرت بھی تھے۔ چنانچہ ہم دونوں نے مل کر ایک اخبار نکالنے کی طرح بھی ڈالی تھی۔ مضامین کا جمع کرنا، ترتیب دینا، میرا کام تھا۔ اس کی کتابت کلیم کا فریضہ تھا۔ یوں کہ وہ خوش خط تھے۔ کلیم کے سوا ایک اور طالب علم، محلّہ چوکھنڈی کے سلیم نامی تھے، مگر وہ بس واجبی سے ہی تھے، ہم عمر تھے مگر ہمارے گاؤں کے نہ تھے، اس لیے دوری اور فاصلہ بنا رہا۔ مگر کلیم سے تعلقات عمر کے آخری لمحہ تک رہے۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے راج شاہی، مشرقی پاکستان کی بودوباش اختیار کر لی، تب بھی واسطہ اور تعلق رکھا۔ خط و کتاب بھی رہی اور پیام وسلام بھی، اس ضمن میں اُن کا تعلق مختار الدین صاحب سے بھی ہو گیا۔ اور جب ہم دونوں کے سامنے، کلیم کا نام آیا اور یہ کہ میرے ہم سبق بھی رہے، تو مختار الدین صاحب نے مجھ سے مزید اختلاط کی راہ پیدا کی۔ پٹنہ سے

درسِ نظامی کی تحصیل علم کے بعد عصری تعلیم کے سلسلے میں مسلم یونیورسٹی کو بہتر جانا۔ یہاں کی دنیا اپنے لیے نئی نہ تھی، چونکہ میرے ایک دادا سید ابن مرتضٰی صاحب بلگرامی نے عہد سر سید میں یہاں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد باپ چچا نے بھی ظہور وارڈ میں مقیم رہ کر، حصول علم کیا۔ میرے والد کے ہم درس سید بشیر حسین زیدی اور سید مجتبیٰ حسین زیدی (سابق پرنسپل، دلّی کالج اسکول، دلّی) تھے، جن سے والد کے خصوصی مراسم تھے۔ مجتبیٰ زیدی کو والد نے کبھی نام سے نہ خطاب کیا۔ ہمیشہ ان کی گھریلو عرفیت ''منگو'' سے ہی خطاب کیا۔ کرنل سید بشیر حسین زیدی کو ہمیشہ بشیر کے نام سے یاد کیا۔ اور کرنل زیدی صاحب نے دمِ آخر تک والد کو اپنا دوست اور محبّ ہی جانا۔ بہر کیف، اپنی تعلیم کے تکملہ کے بعد کاروبار شوق کی طرف راغب ہوا۔ پہلی ملازمت، مسلم یونیورسٹی کے شیعہ دینیات کی میسر آئی۔ مگر اس راہ کے رُوڑے مجھ سے نہ ہٹائے جا سکے۔ لہٰذا ترک ملازمت سال دو سال بعد کر دیا۔ البتہ اس دوران یونیورسٹی کے اہم اساتذہ کی قدر افزائی میسر آئی۔ مثلاً پروفیسر شیخ رشید (صدر شعبۂ تاریخ)، جناب سید ظہیر الدین علوی (استاد شعبۂ اردو) کے سوا، طالب علموں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، آفتاب صدیقی، سید شبیہ الحسن نونہروی، ہنّے بھائی اور بہت سے ہم نوا۔

ملازمت: مسلم یونیورسٹی کی ابتدائی ملازمت کے بعد شعبۂ تاریخ کے شیخ عبدالرشید نے اپنے محکمہ میں قلمی مسودات کے نقول کی ذمہ داری میرے سپرد کی۔ اس لیے بھی کہ عربی، فارسی اور اردو کی استعداد کا اندازہ ان کو ہو گیا تھا۔ سال دو سال تک یہ کام جاری رہا، معاوضہ بھی مناسب ملتا اور نام آوری بھی ہوتی۔ مگر خاندان کی طبع کے مطابق، شہرت یا نام آوری سے مجھے کبھی تعلق نہ پیدا ہوا۔ ان ہی دنوں جناب ظہیر الدین علوی (رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ) نے جامعہ اردو کی خدمات قبول کرنے کی بات کہی۔ اس وقت یہ ادارہ محض ذاتی تھا۔ مگر فاصلاتی امتحانات کا مرکز تھا۔ علی گڑھ کے علاوہ دور دراز علاقہ کے افراد بھی اس کے امتحانات میں شرکت کرنا مناسب خیال کرتے تھے، مگر لطف یہ کہ اس ادارہ کی خاص شہرت کے اسباب اُس وقت نہ تھے۔ بس ایک معلم اردو جو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے تھے۔ ان کی لگن، فکر اور تعلقات کے سبب لوگ باگ اس کے امتحانات میں شرکت کرتے تھے۔ آذوقہ کی فراہمی کا کوئی سلسلہ یا ذریعہ نہ تھا۔ مگر علوی صاحب کی تگ و دو اور ذہنی و عملی فکر نے جامعہ اردو کو ہر ممکن ترقی مہیا کرا دی۔ یہاں تک کہ پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور

ڈاکٹر ذاکر حسین (شیخ الجامعہ مسلم یونیورسٹی) کو اس کا ہم نوا بنا دیا۔ اور جو کہاوت ہے کہ چشمہ کا پانی خود اپنی منزل کی راہ بنا لیتا ہے۔ جامعہ اردو نے بھی اسی طرح اپنی منزل متعین کر لی۔ لیکن ان ہی دنوں اخبار میں ایک سرکاری ملازمت کا اشتہار نظر سے گزرا۔ راقم نے سادہ کاغذ پر درخواست روانہ کر دی۔ جب کہ اشتہار میں صاف درج تھا کہ ایک روپیہ بھیج کر، فارم منگا کے اور درخواست برائے ملازمت ارسال کر دو۔ مگر میں نے ایسا نہ کیا۔ پھر بھی دو تین ماہ بعد انٹرویو کا خط وصول ہوا۔ تاریخ مقررہ پر دلّی جا کر، پارلیمنٹ اسٹریٹ پر ریڈیو اسٹیشن کی علیحدہ عمارت میں حاضر ہوا اور انٹرویو میں شرکت کی۔ بہت سے اشخاص کے پاس سفارشی خطوط بھی تھے۔ مگر راقم کے پاس خدا کی ذات کے سوا کوئی سفارش یا پروانہ نہ تھا۔ کئی ماہ بعد تقرری کا پروانہ آیا اور میں نے انفارمیشن براڈ کاسٹنگ بیوریو میں حاضر ہو کر، جوائن کر لیا۔ یہاں بہت سے نئے افراد سے ملنا جلنا ہوا اور خصوصی طور پر صحافتی ارکان سے واسطہ زیادہ پڑا۔ افسران میں جگن ناتھ آزاد، جناب رتن، (ماہر پریم چند) وغیرہ سے قربت قریبہ حاصل ہو گئی۔

ملازمت دوم: انفارمیشن بیوریو کی ملازمت کے دوران مجھ سے شعبہ اردو دلّی یونیورسٹی کے ذمہ داران نے اصرار کیا کہ تم یونیورسٹی جوائن کر لو۔ اس لیے کہ تمہارا ذہن علمی اور کتابی ہے۔ تمہارے مضامین میں پختگی اور اصابتِ رائے ہے۔ ظہیر صدیقی صاحب کے شدید اصرار پر دلّی یونیورسٹی جوائن کر لیا۔ مگر چند سال بعد ہی صدر شعبہ اردو کی بداعمالی کے سبب اپنی ملازمت ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ میرے مخلصین کو یہ ادا پسند نہ آئی۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (نائب صدر ہند)۔ پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور جناب نورالدین مئر دلّی و بیرسٹر کے سوا پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس عملیہ کے خلاف قدم اصلاح دی۔ آخر کار مجھے دلّی یونیورسٹی کی ملازمت پر بحال کر دیا گیا۔ اس سے قبل ایک اہم ملازمت، خدمت کا ذکر بیان کرنے سے رہ گیا۔ کہ انفارمیشن بیوریو کی ملازمت اختیار کرنے سے قبل چند سال مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دلّی میں، اسٹنٹ پرنٹنگ انچارج کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ جہاں بہت سارے اہل علم سے واسطہ اور ملازمت کا موقع میسر آیا اور واقعہ یہ ہے کہ مکتبہ جامعہ کی ملازمت نے اہل دانش سے جو راہ و رسم قائم کی۔ وہ میرے لیے مقدرات کی بات ہے۔ مجاز لکھنوی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی کے سوا پروفیسر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر مجیب صاحب اور مولانا اسلم صاحب جے راج پوری کے علاوہ غلام ربانی تاباں، محمد شفیع (بچوں کے شاعر) اور مرزا آغا طاہر (عزیز مولانا

محمد حسین آزاد) نیز جناب محمد اجمل خاں (معتمد مولانا ابوالکلام آزاد) وغیرہ سے شناسائی، اسی ملازمت کی دین ہے۔

ملازمت سوم: دلّی یونیورسٹی کی ملازمت دوم کے درمیان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم صاحب نے ایک سال تک اس جگہ کو خالی رکھ کر ایک ملاقات میں، خواہش ظاہر کی کہ تم یہاں آجاؤ۔ تفصیل سے قطع نظر، میرا تقرر یکم جنوری ۱۹۶۹ء کو بحثیت پرسنل اسٹاف وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی میں ہوگیا۔ جہاں آٹھ ماہ بعد ہی روز قبولیت ملازمت سے مستقل کردیا گیا۔ اور پھر جب پروفیسر عبدالعلیم صاحب بحثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہوکر، وزارت تعلیم حکومت ہند کے لیے، ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین ہوکر دلّی تشریف لے جانے لگے تو راقم کو اپنے ہمراہ لے جانے پر اصرار کیا۔

ملازمت چہارم: اس صورت حال سے میں ذاتی طور پر خوش نہ تھا کہ بچوں کی تعلیم، اُن کی سرپرستی اور نگہداشت اس وقت زیادہ ضروری تھی۔ لیکن پروفیسر عبدالعلیم صاحب کی خواہش کے احترام پر اپنے آپ کو آمادہ کیا۔ اور ترقی اُردو بورڈ وزارت تعلیم ہند، کے سکریٹری کی حیثیت سے جوائن کرلیا، یہاں مزید اکابر سے ملاقات کے مواقع میسر آئے۔ رانچی، پٹنا، گیا، چنڈی گڑھ اور دیگر مقامات پر حاضری نے وہاں کے افراد سے تعلق کرانے میں مدد کی۔ مگر پروفیسر عبدالعلیم صاحب کی وفات کے بعد پھر واپس علی گڑھ آگیا۔ یہ عہد پروفیسر علی محمد خسرو صاحب کا تھا۔ آپ کے بعد جناب سید حامد صاحب تشریف لائے۔ جو صاحبِ قلم اور مفکر شخصیت کے حامل تھے۔ سید حامد صاحب کے بعد حیدرآباد دکن سے سید ہاشم علی صاحب نے آکر وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔ آپ نے جو بساط سید حامد صاحب نے بچھائی تھی۔ اسی پر گامزن رہنا پسند کیا، اور اپنی وائس چانسلری کی مدت گزار کر رخصت ہوگئے۔ آپ کے دور میں ایسا کوئی کارنامہ نہیں انجام پایا۔ جو لائق تذکرہ ہو، نہ ہی آپ کے دور میں یونیورسٹی میں تالابندی ہوئی۔ مگر کسی نئے کام کی ابتدا بھی نہ ہوسکی۔ بس واجب سا دور رہا۔ آپ کی رخصت کے چند ماہ بعد میری ملازمت کی مدت بھی تمام ہوگئی۔ اگرچہ اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر وصی الرحمٰن صاحب نے دفتر کے اراکین کی موجودگی میں فرمایا، کہ جب تک میرا قیام ہے، آپ سبکدوش نہیں ہوں گے۔ اس ذیل میں موصوف سے عرض کیا کہ ''جب ملازمت کی ہے تو مجھے سبکدوش بھی وقت مقررہ پر ہونا چاہیے، اس لیے کہ میرے بعد کے شخص کی ترقی میں تاخیر کیوں ہو؟'' میری اس گزارش پر موصوف نے

خاموشی اختیار کرلی، اور ۳۱ ر مارچ ۱۹۹۰ء کو میری سبکدوشی نہایت احترام و اعزاز کے ساتھ ہوگئی۔ اس طرح میں نے تقریباً ۳۱ ر سال کی مدت گزار کر مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

عہدے:

☆ سکریٹری ترقی اُردو بورڈ، وزارت تعلیم حکومت ہند دلّی۔
☆ سکریٹری شعبۂ اردو، دلّی یونیورسٹی، دلّی۔
☆ انچارج، اسٹوڈنٹ سیکشن دلّی یونیورسٹی لائبریری، دلّی۔
☆ پرسنل اسسٹنٹ، وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
☆ انچارج ڈگری سند، جامعہ اردو، علی گڑھ۔
☆ اسسٹنٹ پرنٹنگ انچارج، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دلّی۔
☆ متعلق پریس انفارمیشن بیوریو، گورنمنٹ آف انڈیا، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دلّی۔
☆ اسسٹنٹ و معاون شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
☆ منیجر شاخ مکتبہ جامعہ علی گڑھ۔

اعزازات: سکریٹری عزاءِ حسین، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
مدیر اعزازی رسالہ نجات، علی گڑھ۔
ممبر رسالہ رابطہ، یو. پی. رابطہ کمیٹی، علی گڑھ۔
مدیر اعزازی رسالہ وظیفہ، انجمن وظیفہ سادات و مومنین۔
جوائنٹ سکریٹری انجمن وظیفہ سادات و مومنین اور منصبی ممبر انجمن۔
ممبر آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت، دلّی۔
ممبر یو. پی. رابطہ کمیٹی و نائب ٹریژرار، یو. پی. رابطہ کمیٹی۔
سرپرست کربلا فنڈ، کواتھ (بہار)۔
ممبر زکوٰۃ فنڈ، علی گڑھ۔
ممبر امام بارگاہ نیشنل کالونی، علی گڑھ

مضامین: مختلف موضوعات پر جن رسائل میں مضامین شائع ہوئے، اُن کی مختصر ترین تفصیل یہ ہے۔
اخبار انصاری دلّی (سال ۱۹۴۵ء)۔ پہلا مضمون 'ایک شام' شائع ہوا تھا۔

اخبار روز نامہ الجمیعت، سرفراز، مورچہ (گیا)، نجات، نقوش لاہور۔
مسلم یونیورسٹی گزٹ، تعمیر، آج کل، مہر نیم روز وغیرہ وغیرہ۔

کتب مطبوعہ: انشائے بے خبر، بال جبرائیل معہ مقدمہ وفرہنگ،
مکالمہ غالب، غالب نما، صحیفہ نسب نامہ بلگرام۔
اعمال زیارات عراق، اعمال زیارت شام، اعمال عمرہ وحج۔
حالات جناب زید شہیدؒ، اکابر بلگرام حصہ اول، اکابر بلگرام حصہ دوم،
تاریخ بلگرام (مقدمہ اپنی بات)، تذکرہ جلوۂ خضر (از صفیر بلگرامی)
مقدمہ اپنی بات۔

رسائل: (۱) آج کل دلّی (۲) نیا دور لکھنؤ (۳) پگڈنڈی امرتسر و یونیورسٹی گزٹ
(۴) نقوش، لاہور (۵) مہر نیم روز، کراچی (۶) صبح نو پٹنہ
(۷) کتاب نمائی دلّی (۸) جامعہ، جامعہ ملیہ نئی، دلّی (۹) درس،
علی گڑھ (۱۰) تہذیب الاخلاق، علی گڑھ (۱۱) جعفری، نوگاواں سادات
(۱۲) کانفرنس گزٹ، علی گڑھ (۱۳) فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
(۱۴) نئی کتاب، جامعہ نگر نئی، دلّی (۱۵) روزنامہ ایکسپریس، کراچی

اَرکان دین مبین: حج ☆ اول بار سال ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۰ء، چوتھا حج ۲۰۰۷ء۔
عمرہ ☆ ۱۹۸۵ء ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۴ء، ۱۹۹۷ء، ۲۰۰۷ء، ۲۰۱۱ء
زیارات عراق ☆ ۱۹۸۵ء، ۱۹۹۰ء، ۲۰۰۷ء۔
زیارات ایران ☆ ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۲ء، ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۷ء۔

بیرونی سفر: لندن (تین بار)، کویت (دو بار)، ابوظبی ودبئی (متعدد بار)،
ایران، شام، عراق، سعودیہ، ترکی (استنبول)، اور پاکستان۔

حق آشنا: سید العلما مولانا سید علی نقی صاحب، علامہ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی،
مولانا سید نجم الحسن کراروی، مولانا سید ذیشان حیدر جوادی،
مولانا سید علی تقوی (امام جمعہ و جماعت دلّی)، مولانا سید فیروز حیدر عابدی،
پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی،
پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی، مولانا تقی امینی صاحب، پروفیسر اسلوب احمد انصاری،

پروفیسر ضیا احمد بدایونی، پروفیسر ضیا الحسن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد حسنین، پروفیسر محب الحسن، پروفیسر محمد مقبول، پروفیسر مختار الدین احمد آرزو، پروفیسر سالم قدوائی، پروفیسر اطہر حسین صدیقی، مولوی عبدالحق بابائے اردو، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر احسان رشید، مشفق خواجہ صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، پروفیسر یوسف حسین، قاضی عبدالستار، پروفیسر شہریار، شاہد علی خاں (جنرل مینیجر مکتبہ جامعہ) اور محمد طفیل (مدیر نقوش، لاہور) ان کے علاوہ وہ حضرات بھی جن سے ملاقاتیں کیں، باتیں ہوئیں، ان میں سے بہت سے حضرات کے قلمی حالات قلم بند کرائے۔ جن کی تعداد کم وبیش دوڑھائی سو کی ہوتی ہے۔

عمر کی جس منزل میں ہوں، اس میں اتنے امور پر خامہ فرسائی کرنا آسان بات نہیں۔ حافظہ جس قدر بھی ہے، مگر ہمہ وقت ساتھ نہیں دے سکتا۔ پھر بھی جو کچھ یاد آتا گیا، اسے فی الوقت رقم کر دیا ہے۔ بقیہ کا تکملہ قارئین کر دیں گے۔

ایک اہم بات یہ عرض کرنی ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ کبھی کبھی وقتی اور جذباتی طور پر، کسی ایسے لمحہ پر جب کوئی سانحہ گزرے یا کوئی لمحہ خوشی کا میسر آئے تو میں تک بندی کے بطور، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مافی ضمیر بیان کر لیتا ہوں۔ لیکن اسے کبھی بھی ہم نے احتیاط سے یا حفاظت سے، قلم بند کر کے، نمونہ کے بطور اپنے پاس نہیں رکھا۔ اگر کسی کے پاس کوئی میرا کلام محفوظ رہ گیا ہو تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ میرا کلام نہیں ہے۔

☆☆☆

میر غالب کے حریف؟

غدر کے بعد مغربی علوم اور نئے طرز تعلیم کے اثر سے اردو ادب میں ایک انقلابی لہر اٹھی۔ روشن خیال اور زمانے کے مزاج میں نگاہِ بشریت رکھنے والے ادیبوں نے محسوس کیا کہ اردو کا جامہ نئے زمانے کے جسم پر تنگ ہے، اس لئے غدر کے بعد انگریزی علوم سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا خیال پیدا ہوا۔ کہ انگریزی ادب تاریخی طور پر انسانی مذاق کے بالکل قریبی دَور کا آئینہ دار ہے، یورپ میں ۴، ۵ سو برس سے علمی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے مگر ہندوستان میں نئی زبان نے جب قدم پھیلانا شروع کیا۔ تو علمی تحقیق اور ذوق نے تنقیدی اَدب کا ایک واضح معیار قائم کیا۔ اس کے لئے حُدود قائم اور اصولوں کی روشنی میں وسیع اور واضح طریقے سے شعر و ادب کے جائزہ کی بات بھی سوچی گئی۔ کہ اس طرح فکر کے مختلف دَبستاں، سوچنے کے مختلف زَاویے اور بیان کے مختلف اسلوب قائم ہوئے۔ اردو ادب میں سب سے پہلی بار زندہ جاوید ادیب غالب نے عملی طور پر قدم اٹھایا۔ اس سلسلے میں دو تذکروں کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

سید فخر الدین حسن تخلص سخنؔ بن سید جلال الدین نے ۱۲۸۱ھ میں فسانہ عجائب کے مقابلے میں 'سر دش سخن' کے عنوان سے ایک فسانہ حسن و عشق نول کشور پریس سے شائع کیا۔ ختم داستان کے بعد جناب سخن شاگرد صفیر بلگرامی، غالب کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"حضرت جناب تقدس مآب گردوں رکاب سر دفتر محققات سخن افسر شاعرانِ زمن، نجم الدولہ، دبیر ملک نواب اسد اللہ خاں بہادر سُہراب جنگ عرف مرزا نوشہ تخلص غالب اعلی اللہ درجہ و تعالیٰ اللہ شانہ، جو حد فاسد محرر داستاں ہیں، سر آمد شاعران حال، گذشتہ گان ہیں۔ عرصۂ دراز تک کمترین کو معظم الیہ سے درس و تدریس میں اِستفادہ رہا، تحریر نظم و نثر پارس اور اُردو کی مزاولت پر دل آمادہ رہا۔ سبحان اللہ حضرت غالب مدظلہ العالی امام شعرائے ذی کمال اور پیشوائے نثاران صاحب دانش و شعور ہیں۔ قبلۂ ارباب دیوان ہیں۔ ہم کیا کہیں وہ تو ہند سے شیراز تک بلکہ دُور دُور آفتاب سے زیادہ مشہور ہیں۔ شاعر بہت سے گزر گئے، حضرت کے ہم عصر، ہمسری کا دعویٰ کر کے لکھتے لکھتے مر گئے، مگر آج تک کوئی آپ سے بہتر نہ ہوا۔

بہتر تو کیا کوئی آپ کے برابر نہ ہوا۔ منصف مزاج آپ کا کلام دیکھے اور غور فرمائے۔ طبع عالی دقت پسند اور مائل بندش معانی بلند ہے۔ اگر سمجھے تو لطف اُٹھائے، دیوان اُردو جب تصنیف فرمایا معنیٰ رس اور سخنداں لوگوں نے ایک ایک شعر میں سو سو طرح کا مزا پایا۔ لیکن بعض شاعر جو بڑے مشاق تھے اپنے فن میں طاق شہرہ آفاق تھے، اکثر اشعار نہ سمجھے اور ہر ایک مصرعہ پر اُلجھے یہاں تک کہ اضلاع و امصار سے خطوط آنے لگے۔ لوگوں نے نواب صاحب کی خدمت میں مطلب دریافت کرنے کی خواہش ہوئی۔ آپ نے اس دیوان کو وَریابُرد کیا، اور دوسرا دیوان موافق فہم اَبنائے رُوزگار کے ترتیب دیا، پھر یہ رباعی لکھ کر لوگوں کو سنادی اور دیوان کے آخر میں لگادی۔ غالب مدظلہ:

مشکل ہے زِبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنداں کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

جناب سخن اپنے استاد جناب صفیر بلگرامی کی شان میں اس داستان دل آرام اور ملکہ حسن افروز۔ جس کا تاریخی نام ''سردشِ سخن'' ہے۔ جس سے ۱۲۷۶ھ سنہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ داستان ''نغمہ عندلیب'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا، مگر منظر عام پر ''سردِ سخن'' کے نام سے ۱۲۸۱ھ میں آئی۔ مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے استاد حضرت غالب دہلوی کے پاس برائے ملاحظہ ایک خط کے ساتھ بھیجا۔ اس کا جواب غالب نے دیا۔ ''مولوی سید فرزند احمد .... اس پیر ہفتاد سالہ کی دُعا پہونچے، آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستر واں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے:

سنین عمر کے ۷۰/ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نُورِ دل میں سُرور آیا۔ اور قصہ سردش سخن اس کے دوسرے دن پہونچا .... لو بس اب میں ضیاء الدین خان سے باتیں کر رہا ہوں تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک اِن کو چُپکا بیٹھا رکھا۔ وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہونچاتے ہیں۔

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا۔

سُنا صَفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اَعدادِ غَین کی ہے دُعا
خدا کرے مرزا غالب جئے ہزار برس

(س ش ص صفحہ ۱۹۷)

سروش سخن، کتاب مذکور کا تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۷۶ھ سن ظاہر ہوتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ داستان ''عندلیب'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا، لیکن منظر عام پر ''سروش سخن'' کے نام سے ۱۲۸۱ھ آئی۔ چنانچہ آخر کتاب میں ایک مقدمہ، ایک جلسہ [تذکرہ ادباء واحباب] بہ نام ''انجمن احباب'' اور چند غزلیات سخن پھر قطعات تاریخ مندرج ہیں۔ قطعات ۱۲۷۶ھ دونوں ملتے ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مروجہ دستور کے مطابق احباب نے پیشتر ہی مصنف کی اطلاع پر قطعات نظم کر کے بھیج دیئے ہوں گے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۸۱ھ میں پانچ سال کی طویل مدت باقی رہتی ہے۔ رقمطراز ہیں:

''سید فرزند احمد صفیر بلگرامی جو صاحب دیوان ہیں، تحریر ان کی چست رُوزمرہ درست نہایت خوش بیان ہیں، ہر شہر و دَیار میں ان کے علوم خاندانی کی شہرت ہے۔ ہر جگہ ان کی قدر و منزلت ہے۔ بیان کرنے کی کیا حاجت ہے۔''

صفیر بلگرامی کا نام سید فرزند احمد تھا۔ آپ حضرت سید صاحب عالم صاحب بلگرامی ثم مارہروی کے حقیقی نواسے تھے۔ صفیر بلگرامی نے بھی غالب کے حالات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ جلوہ خضر حصہ اول مطبوعہ ۱۲۸۵ھ میں لکھے ہیں۔ اقتباسات قابل غور ہیں:

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اکبر آبادی مولد دہلی مسکن المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر لملک نظام جنگ۔ یہ وہ خوش مزاج شخص گذرا ہے۔ جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اُردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا فرمایا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر دلائتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا:

اول امیر خسرو، دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جان جاناں مَظہر، اور غنی کشمیری اور غنیمت، اور خان آرزو، اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ اُلفت حسین فریاد، یہ سب کے سب خوش گوار

شاعر بے دل تھے۔ مگر جامۂ ایجاد جو خدا داد ہے ان میں چاروں کے راست قامت آیا اور ان چاروں کے سواجن کے نام نامی لکھے گئے ہیں اون پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔

(جلوہ خضر مطبوعہ ۱۲۸۵ھ)

لیکن میرے پاس جلوہ خضر حصہ اول و دوم کا جو مسودہ حضرت صفیر بلگرامی کے دست وقلم کا موجود ہے اس میں:

''اول امیر خسرو، دوم میر حسن، سوم میر تقی، چہارم مرزا بیدل، پنجم مرزا غالب'' تحریر ہے۔ میر تقی کے سلسلے میں حاشیہ پر عبارت بھی درج ہے:

''میر تقی صاحب کو اگر اردو نثر نگاری کا موقع ملتا تو ان کی نثر اور نظم میں سوز گداز ایک سا ہوتا۔ شاعر وہ تو با کلام تھے، نثر کی با کلامی کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔''

مگر یہ عبارت قلمزد کر دی گئی ہے اور نہ جانے کیوں ترتیب بھی بدل دی گئی۔ حالانکہ میر تقی کے حالات میں صفیر بلگرامی صفحہ ۱۴۷ پر لکھتے ہیں:

''میر غزل کے بادشاہ تھے، جو بات کہ غزل میں انہوں نے اختیار کی اوس کی تقلید سب پر واجب ہو گئی اور سب اس ڈھرے پر چلنے کو مستعد ہوئے، مثنوی میر صاحب کی اگرچہ ممدوح انام ہے مگر غزلیات کے سبب سے زیادہ مطبوع ہے۔'' (جلوۂ خضر حصہ اول)

جناب سخن ''سر دشِ سخن'' میں میر کی بابت لکھتے ہیں:

میر تقی صاحب غفران مآب تو بادشاہ شاعران اُستاد سارے جہاں کے تھے، اس میں تو کسی کو جائے گفتگو اور تقریر نہیں اور اگر ہو تو، ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

جناب صفیر کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی عظمت کا رجحان محض غزل کے نام پر روا رکھنا اُنہیں منظور نہ تھا۔ بلکہ وہ نثر میں بھی میر کو اسی شان اور تمکنت سے دیکھنا چاہتے تھے، جو درجہ غزل میں مقرر تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس تحقیق میں صفیر کو ناکامی ہوئی اور اُردو نثری میدان سے میر کو قلمزد کرنا پڑا۔ چنانچہ میر و مرزا کے سلسلہ میں تحریر کا جو نمونہ جلوہ خضر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مرزا (مرزا سودا سے مراد ہے) کا نثری نمونہ اُردو میں ہے لیکن میر کا نمونۂ فارسی پیش کیا گیا ہے۔ گویا صفیر بلگرامی کے ذہنی گوشہ نے میر کو غالب کا حریف بنانا چاہا۔ لیکن پھر خود ہی اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ یا یہ کہ اپنے اُستاد غالب کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں اس موضوع سے جُدا ہونا پڑا۔ بہر حال اس سے انکار نہیں۔ کہ

غالب پہلا شخص ہے جس نے فارسی جو کہ اس زمانے میں مروجہ زبان تھی، اس کے برخلاف آسان اور سلیس اُردو میں نثر لکھی۔ یہ درست ہے کہ دلی کی نئی ادبی زندگی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان، نیز دلی کالج سے ہوئی لیکن اس سے بھی کسی کو انکار ممکن نہیں کہ دلّی کے ادب نواز یا ادیب صرف چار تھے: شاہ نصیر، ذوق، مومن اور غالب، لیکن غالب نے اپنے فطری رجحان سے اردو ادب میں تبدیلی کی۔ اس کے جمود کو توڑا بلکہ ہماری نئی شاعری کی صحیح قدروں کو اجاگر کرنے اور رُوشناس کرنے میں غالب کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ یہی نہیں، اگر غالب کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت سے ایسے نقوش ملیں گے۔ جو سادگی و پُرکاری سے بھرپور ہوں گے اور کیف وجامعیت کا امتزاج بھی ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ تمام چیزیں یہاں مل جاتی ہیں جن کا ایک اَدب میں ہونا لازمی ہے۔ مثلاً اصلاح زبان، صحیح الفاظ شستگی، مناسب تراش خراش، ذومعنی الفاظ، سادہ اور سلیس انداز۔ غرض وہ تمام لوازم جن سے زبان میں زندگی اور اُس کا رَچاؤ پایا جائے۔ بہ درجہ اُتم موجود ہے۔ سادہ اور سلیس استعمال زبان غالب نے میر سے ترکہ کے طور پر پایا۔ میر نے اپنی غزلوں کو چونکایا ہی نہیں بلکہ اپنا لینے پر مجبور کیا۔ مگر ہوا یہ کہ میر نے سادگی و پُرکاری غزل میں سموئی، لیکن غالب نے مشکل پسندی کے باوجود اردو غزل اور نثر کو آسان اور بامحاورہ بنادینے کی ایک بہتر مثال قائم کردی۔ یہ ان کی عظمت کی نشان دہی کرتے اور ان کے معاصرین سے ممتاز بھی کرتے ہیں چنانچہ تمام تذکرہ نویس غالب کی عظمت، ان کے فن اُن کی سوجھ بوجھ اُن کے جدید رجحانات کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نشانِ راہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگر چہ اس حقیقت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا، لیکن مغلیہ سلطنت کے تاجدار کے اِحکام سارے ملک میں جاری وساری تھے۔ یا کم سے کم دلی اور گردونواح میں یہ سکہ رائج تھا۔ اس طرح ہم اسے عبوری دَور کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ دَور پرانی دِیوار کے گرنے اور نئی دِیوار کے تیار ہونے کا وقفہ تھا۔ چنانچہ اگر اس وقت کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو صرف غالب کی شاعری اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ بصیرت، پیش بینی سے بہر وَر دکھائی دیتی ہے۔ گرچہ غالب بیک وقت رِند، فلسفی اور صوفی بھی دکھائی دیتے ہیں غم ان کی آنکھوں سے جھلکتا ہے، لیکن وہ اس کشائش کو دنیا کا مضحکہ اڑا کر چپ رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل غالب کی عظمت اور ان کا فن ہے جو ایک دَور کی عکاسی اور نمائندگی بھی کرتا ہے اور پُرانے دَور واِقتدار کی صحیح

حالت کا تجزیہ بھی پیش کرتا ہے ورنہ:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

یا

ضعف سے اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کے دامن میں نہیں

کے تمثیلی اشعار پردۂ غیب سے ظہور میں نہ آتے۔

اس خاکے میں غالب کو اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو وہ میر تقی میر کے حریف یا ان کے مرید کہلانے کے مستحق نظر آئیں گے۔ اس کا فیصلہ اہل علم و دانشوروں کو کرنا ہے۔

میر ایک لمحہ فکریہ

اردو کی ابتدا خواہ آریوں کی آمد سے ہوئی یا مسلمانوں کی آمد ہند کے بعد، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب سے اس زبان کا آغاز ہوا ہے۔ اسی وقت سے اس میں سماجی رجحانات اور خوش حالی کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ نیز دنیا کی دوسری بڑی زبانوں (خصوصاً غزل) میں ہوتی رہی۔ لیکن میر تقی میر سے پہلے کوئی اردو شاعر ایسا نظر نہیں آتا جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی (ولادت ۱۷۲۴ء۔ وفات ۱۸۱۰ء)! غالب سے قطع نظر میر کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی جس بے سروسامانی میں گزری وہ خود ایک المیہ ہے۔

میر قنوطی ہے؟ میر بڑا شاعر ہے؟ ہوگا۔ مگر وہ ایک انسان بھی ہے۔ وہ دل پُرنم بھی رکھتا ہے۔ اس کے احساسات اور اس کی اپنی نفسیات بھی ہیں۔ یہ بات ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ اس سے درگذر ممکن نہیں۔ اسی طرح میر کے یہاں رنج والم اور غم واندوہ کی داستان سرائی بہت ہے۔ سوال یہ نہیں کہ کس قدر ہے بلکہ یہ کہ وجہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ یا یہ کہ کیا واقعی میر کی عشقیہ شاعری کا دارومدار بوالہوسی پر ہے؟ اگر محض بوالہواسی ہے تو یہ شاعری، شاعری نہیں لیکن اگر یہ عشق وہ عشق ہے جس سے انسان کا ضمیر ہوشیار ہوتا، جس سے تخلیقی مادّہ اُبھرتا اور جس سے انسانیت بنتی، سنورتی اور معراج حاصل کرتی ہے، تو پھر میر کے قنوطی ہونے میں کیا بُرائی ہے؟ اور جب کوئی برائی نہیں تو بڑا شاعر ماننے میں کیا برائی ہے؟ یہ سارے سوالات ذہن میں کبھی الگ الگ اور کبھی گڈمڈ ہو کر آتے ہیں اور دل و دماغ کو ایک عجیب کش مکش میں مبتلا کر دیتے ہیں، مگر میر کسی آفاقی صفت انسان کا نام نہیں ہے۔ وہ عشق حقیقی اور مجازی دونوں کی درمیانی کڑی ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر میر کے سلسلۂ نسب اور زمانہ کے مزاج وعادات اور اطوار کا جائزہ لیا جائے تو یہ سارے شبہات خود بخود دُور ہو جاتے ہیں۔

زندگی کیا ہے؟ مادہ اور رُوح کے اجتماع کو زندگی کہتے ہیں مگر محض کسی اجتماع سے زندگی مکمل تو نہیں ہو جاتی؟ اس کے کچھ اور مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ اس کے لئے کچھ اور بھی کرنا ہوتا ہے، وہ ہے عوام سے رابطہ۔ ان سے تعلق ان کے درد وغم کو اپنانا، ان کی حسیات سے واقف ہونا اور معاشرتی، تمدنی، تہذیبی اقدار کا پرکھنا، سمجھنا اور ان سے نہ صرف اپنے آپ کو

بلکہ دوسروں کو بھی واقف کرانا۔ میر نے اپنی شاعری کے ذریعے اس فرض کو بخوبی انجام دیا ہے۔ ان کے کلام میں محض سرمستی زبان کی بندش، خیالات کی پختگی اور نازک مزاجی اور رکھ رکھاؤ، اَدائے بیان پر قدرت اور معنی آفرینی کو نئے انداز واقدار سے پیش کرنا ہی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی کسی نہ کسی حد تک ہمیں میسر آجاتا ہے۔ میر کا فن دراصل سادگی بیان اور اظہار غم کے نیئے اور اَچھوتے پُراثر انداز کو اپنانا ہے۔ انہوں نے ساری کائنات کے غم کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا اور اسی جذب نے ان کی زندگی کو مکمل احساسات کا مجموعہ بنادیا تھا اور وہ یہ بات کہنے پر مجبور ہوگئے تھے:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
دَرد و غم جمع کئے کتنے تو دیوان کیا

یا یہ شعر

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پَردے سے اِنسان نکلتے ہیں

''شعر برائے گفتن است۔'' میر اس تصور کے بھی معتقد نہ تھے۔ وہ اپنے دَور میں، اس وقت جب کہ انگریزی ادب کی ہلکی شعاعیں بھی ہندوستانی ادب پر نہیں پڑ رہی تھیں، جب کہ زندگی کا یہ تصور نہ تھا جو آج ہے۔ اس وقت جب کہ اُردو میں اصول شعر اور اصول تنقید کا رواج نہ تھا، جب شاعری صرف حصولِ زَر کا ذریعہ تھی، مخالف ہی رہے۔ میر نے اس دَور میں بھی اس کو تفنن طبع نہیں بلکہ انسانیت کی معراج سمجھا اور زبان و بیان اور فن کی قدر و منزلت کا جو خاص پیمانہ انہوں نے بنا رکھا تھا، اس سے سرِ موانحراف نہیں کیا۔

کیا تھا شعر کو پَردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

یہی نہیں بلکہ کتنا عمیق تجزیہ ہے:

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

شاعر اور ادیب کا فرض ہے کہ وہ واقعات اور حقائق پر ذہنِ صالح کے ذریعہ غور کرے اور اسے ہضم کرے، اسے مادّہ نہیں، رُوح بنائے۔ پھر جو اَدب تخلیق ہوگا وہ دَوامی ہوگا۔ اس میں نہ شکستگی ہوگی، نہ خوف مدّت!۔ ہم جس صدی میں سانس لے رہے ہیں وہ ترقی یافتہ ہے، سائنس نے جس قدر ترقی کرلی ہے، اس کے ایک حصہ سے بھی میر واقف نہ

تھے۔لیکن کیا یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس صدی کے بعد جو صدی آئے گی یا یہ وقت گزرنے کے بعد جو وقت آئے گا، اس میں جو صنعتی او۔ میکانکی ردّ و بدل ہوں گے، اس سے آئندہ نسلیں ہمارے ادب کے بارے میں کوئی بہتر رائے قائم کریں گی؟ یا یہ کہ ان کی نگاہوں میں موجودہ ادب کا معیار کیا ہوگا؟ یہ بات محض روایتی طور پر کہنے یا سننے کی نہیں، یہ حقائق ہیں اور بہت غور و فکر اور فیصلہ کی ضرورت ہے۔ کیا جوش، فراق، فیض، روش، ساغر اور حفیظ کی شاعری اس پایہ کی ہے کہ آنے والا موٗرخ اپنے دور کے آئینہ میں اسے اپنے ماحول کا بتا سکے؟ یہی نہیں بلکہ اس دور کے سارے ادبی سرمایہ میں سے وہ اپنے مقصد کا کوئی حصہ پاسکے گا؟ اس کا فیصلہ آسان نہیں..... لیکن یہ بات ہم آج بھی دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میر کی شاعری کو زوال ممکن نہیں۔ کیونکہ میر نے فانی کی طرح محض اپنے غم سے متاثر ہوکر کسی شعر کی تخلیق نہیں کی، بلکہ اپنے غم کو سماج کا غم سمجھا اور اس غم میں سارے عالم کا غم سمو کر، اپنے مُوقلم کو استعمال کیا ہے ورنہ ایسے اشعار کہنا آسان نہ تھا۔

کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے اِنتظار ہے اپنا
کوفت سے جان لَب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
جی کو جنجال دل کو ہے اُلجھاوٗ
یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
ہوگئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

اردو کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے اچھے شاعر بہتر ادیب کو سکون اور اطمینان نہیں مل سکا۔ دلّی، لکھنوٗ، عظیم آباد، اور رام پور وغیرہ کی شاہی نے اگرچہ سرپرستی کی، مگر اس سے فائدہ کم، نقصان زیادہ ہوا۔ نقصان ان معنوں میں کہ نواب یا شاہ کی طبع کے مطابق، شاعر کو اپنا ذہن ڈھالنا پڑا۔ اس طرح اسے آزادیٔ خیال نہ مل سکی۔ اسے وہ شعوری سکون نہ ملا، جس سے کوئی تخلیقی ادب پروان چڑھتا ہے۔ تاریخ و تذکرے کے اَوراق شاہد ہیں کہ

آصف الدولہ جیسا ذی علم اور ذہین نواب بھی میرؔ کو اپنی آتش شوق کی سیرابی کے لئے وقت بے وقت طلب کر لیا کرتا تھا۔ یہی حالت انشاء، مصحفی، آتش اور دوسرے درباری شعراء کے ساتھ تھی۔ اسی روش نے شعراء کی استعداد اور صلاحیت کو لازمی طور پر نقصان پہنچایا۔ ورنہ ممکن تھا کہ آزاد ماحول اور آزاد تصور پا کر ان کے کلام میں وسعت اور زبان میں نئی روح پیدا ہوتی۔ اس طرح آج ہم اردو شاعری پر کوئی الزام نہیں رکھ سکتے۔ انگریزی اور یورپ کی دیگر السنہ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہاں کے ادیب اور شاعر کسی کی رعیت نہیں ہوتے، وہ حکومت کے مطیع یا زیر اثر نہیں ہوتے۔ ان کی صلاحیتیں آزاد اور ان کے افکار بے قید ہوتے تھے۔ سودا کا شعر ہے:

نہ بلبلِ چمن، نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں

یا یہ شعر:

موسمِ گل ہے ولے کچھ بھی دلِ شاد نہیں
تابِ پروانہ نہیں، طاقتِ فریاد نہیں

یہ شعر نہیں، شہر آشوب ہے، مرثیہ ہے، دل کی آواز، وقت کی پکار اور ایک عہد کی تاریخ ہے۔

اس کے باوجود ادب اور زبان کا جو مزاج میرؔ کے عہد میں تھا وہ دھڑکن موجودہ ادب میں باقی نہیں ہے۔ میرؔ کی شاعری کو عشقیہ یا صوفیانہ شاعری کہا جاتا ہے۔ لیکن میرؔ کی عشقیہ شاعری میں جو کیف والم، سوز وگداز، جذبہ کی شدت انسانیت کی کسک، سماج کا دُکھ، ماحول کی عکاسی، زندگی اور اس کے لوازم کی چاشنی ملتی ہے۔ اس سے احساس میں تازگی، ذہن کو جلا، اَدب میں لذت اور ذوق میں شوق کی چسک پیدا ہوتی ہے۔ کلامِ میرؔ کے مطالعہ سے ہمیں روشنی کی ایک ایسی کرن ملتی ہے، جو تاریکی اور گھور اندھیرے کو دُور کر کے صبح کاذب کے بجائے صبح صادق کا یقین دلاتی ہے۔ اگر ایقان ہے تو آپ اَتھاہ گہرائی کے باوجود راستہ پالیں گے۔ ان کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں تنہائی پسند نہیں بناتا۔ غمِ جاناں اور غمِ دَوراں دونوں کی لذّت ان کے کلام میں ملتی ہے۔

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے، پوچھو مرے جی سے
متصل رُوتے ہی رہئے تو مجھے آتش دل

ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

صفائی زبان اور آرزو وتمنا کے ذیل میں یہ شعر ملاحظہ ہو!

چاہیں تو تم کو چاہیں ، دیکھیں تو تم کو دیکھیں
خواہش دلوں کی تم ہو، آنکھوں کی آرزو تم

بے ثباتی دنیا پر اکثر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے لیکن اس پایہ کے شعر کہاں کہے گئے ہیں؟

میں خاک میں ملانہ کروں کس طرح سے میر
مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام
جس کو تم آسان کہتے ہو
سو (۱۰۰) دلوں کا غبار ہے اپنا
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان حقیقی اور رداردراتی باتوں کے ذکر پر بھی اگر میر کو قنوطی کہا جائے گا تو پھر اردو کا ہر شاعر قنوطی ہے ، جگر، حسرت، فانی، اور عرش، فیض، قتیل اور فراق کی شاعری بھی قنوطی ہے۔ روایتی ہے۔ آخر میں داخلی اور خارجی کیفیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان اشعار کا مطالعہ کیجئے۔ یہ غزل نما نظم ہے یا نظم نما غزل ہے؟ اس کا فیصلہ قارئین خود کریں۔

رفتگان میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر
بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
مرگئے، نہیں تو نہیں
خاک سے منھ کو ڈھانکے ہم بھی ہیں

یعنی میر کی شاعری پر محاکمہ بتاتا ہے کہ ان کی بابت ہر دور میں لمحہ فکر یہ رہیگا۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

☆☆☆

غالب اور مرثیہ نگاری

اُردو ادب میں غالب کی شخصیت ایک فردِ واحد کی نہیں بلکہ جماعتی ہے، وہ ایک منزل نہیں بلکہ کئی منزلوں کی علامت ہے۔ ان کی شخصیت ایسی پہلو دار ہے، جس میں آسمانوں کی بلندیوں اور زمین کی پستیوں کے لیے بے شمار مناظر پوشیدہ ہیں۔ شاعری ان کی میراث نہیں تھی، نثر نگاری ان کی جاگیر نہیں تھی، تاریخ و سیرت نگاری ان کی منزل نہیں تھی۔ قصیدہ خوانی کا نظریہ اور تنقید نگاری ان کی زندگی نہیں تھی ...... لیکن غالب نے ان تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس سے کوئی ادب زندہ و پائندہ رہ سکتا ہے، اور اب صورت حال یہ ہے کہ شاعروں میں ان سے بہتر اور نثر نگاروں میں ان سے افضل، تاریخ و سیر پرا (ان کے عہد میں) نگاہِ دورس رکھنے والا اور نقد و تبصرہ میں ان کا ہم سر، کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس مدّ و جزر اسلام کا تصور غالب کا اثر نہ سہی، فیضان ضرور ہے، ورنہ حالی اگر محض: شیفتہ : کے حلقہ بگوشوں میں رہتے، تو اچھے شعر کہہ لیتے، مگر علامتی شاعری نہیں کر سکتے تھے، نہ ہی نقد و شعر کا ڈانڈا نقد حیات سے ملا سکتے تھے، یہی حال اقبال کا ہے۔ اقبال کا سارا فلسفۂ خودی اور اسلامی مزاج سے ہم آہنگی: کلام غالب : کے اثرات ہیں۔ اقبال نے خودی کا تصور اور اسلامی مزاج کی سلامت روی کے سبق غالب کی تحریروں سے حاصل کئے ہیں۔ اس کے ثبوت میں خطوطِ غالب اور کلام غالب سے بے شمار مثالیں مہیا کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کی طویل نظم :خضر راہ: کو لیجیے اور غالب کے اس شعر کو۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

خضرِ راہ میں اس شعر کو بڑے کینوس پر پھیلا کر اور واضح و نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ غالب نے اس شعر میں جس خودی، استغناء کا تصور پیش کیا ہے، اُسی خودی اور استغنا کو اقبال نے اپنی شاعری کے لیے :علامت: قرار دیا ہے۔ اسی طرح نظریاتی اور واقعاتی اشعار میں غالب کی اپنی تصوراتی شاعری پوشیدہ ہے۔ اس کے خدو خال میں صرف

ان کی شخصیت ہی نہیں، سماجی پس منظر بھی مضمر ہوتے ہیں :

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غالبؔ کا یہ شعر اپنے کسی عزیز کے بجائے، کسی دوست، ساتھی یا محلّہ کے رہنے والے کے اوپر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اس شعر میں مرثیہ کی جو کیفیت ہے اس سے کہیں زیادہ حقیقی اور واقعی منظر نگاری موجود ہے، جس نے شعر کو ہمہ جہت بنا دیا ہے۔ دراصل غالب نے شخص کو سامنے رکھ کر بھی عوام کی بات کی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جب لالہ و گل، مہؔ و انجم اور حور و قصور کی بات کرتے ہیں، اس وقت بھی پسند عام کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ غالب کا شعر ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

اس شعر میں نہ الہام ہے نہ ابہام، بلکہ صاف، واضح اور دوٹوک بات کی گئی ہے۔ اسلامی قانون اور اسلامی مزاج اور اسلامی فقہ سے جو لوگ واقف ہیں، قیامت اور روز جزا کی کیفیات کا جسے علم ہے، وہ اس شعر میں بے حد لطف پائے گاؔ، بعض لوگ اس شعر کی تشریح کے ضمن میں کہتے ہیں کہ یہ شعر: الحاوی : ہے۔ اس میں غالب نے خدا کے مد مقابل کا تصور پیش کیا ہے۔ اس شعر سے بغاوت کی بُو آتی ہے۔ یہ شعر انقلابی ہے۔ حالاں کہ اس شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ صاف اور سیدھی ہے حق بینی و حق آگاہی کا تقاضا ہے کہ خدا، جو منصف حقیقی ہے، عادل ہے وہ بھی انصاف کے اصولوں پر کاربند رہے۔ مگر انسان کی بے بسی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، کہ وہ، نہ گناہ کرنے پر قادر ہے، نہ ہی ثواب کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی نہیں۔ وہ اشرف المخلوقات تسلیم کئے جانے کے باوجود : فرشتوں : کی زد میں ہے۔ ان کے لکھے پر، اس انسان کو جس کو فرشتوں نے سجدے کئے تھے، سزا ملے گی، یہ تصور بغاوت نہیں حقیقت کا اظہار ہے۔ گلہ، شکوہ نہیں، واقعہ نگاری ہے۔ منصف حقیقی سے فیصلہ طلبی ہے۔ یہی تصور روشن صورت میں، اقبالؔ کے یہاں اجاگر ہوا، اور انہوں نے علم جدید کی روشنی میں، ان نقوش کو اُبھار کر ہمارے سامنے کیا، جن کو غالب نے نقطہ کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اور نقطہ کی اہمیت، ان خطوط سے زیادہ اہم ہوتی ہے، جو ہر سمت پھیلے ہوئے ہوں، اسی لیے ابتداء میں یہ بات کہی تھی کہ غالبؔ کی شخصیت پہلودار ہے۔ ان کی زندگی، ان کی شاعری، ان

کی نثر اوران کے لطائف وظرائف بھی جاذب نظر اور پرکشش ہیں۔ دوسرا وصف ان کا یہ ہے کہ وہ مصائب اور آشفتہ حالی کے دور میں بھی، نہ اپنے کو بھولتے ہیں، نہ دوسرے کو، نہ زمانے کو فراموش کرتے ہیں، نہ شخصیتوں کو، جو سوچتے، جو چاہتے ہیں وہ کہہ دیتے اور لکھ دیتے ہیں، ایک خط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں :

۱- مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے، خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق ودق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہوجائے۔

۲- قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہوجائے گا۔ اللہ اللہ

۳- ارے بندۂ خدا! اُردو بازار نہ رہا۔ اُردو کہاں؟ دلّی...... واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار نہ نہر......

(اُردوئے معلیٰ)

یہ خط شہر آشوب ہے، دلی کی داستان ہے، ان کے عہد کا حال ہے بلکہ دلی اور اس کے رہنے والوں کا نثر میں مرثیہ ہے اگر چہ غالب نے باقاعدہ طور پر اس صنف سخن کو نہیں اپنایا۔ لیکن ان کے خطوط کو اگر دیکھا جائے تو شخصی، قومی اور وطنی مرثیے بہت ملیں گے۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو ۱۵؍نومبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ (والدۂ امین الدین احمد خاں) کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں؟ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت، سو بھائی۔ اظہار غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر، بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور (والد مکتوب الیہ) کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی

جائے۔؟ رہی دعائے مغرفت، میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چوں کہ وہ میری مربیہ و محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے:

منشی ہر گوپال تفتہ کو اپنے ایک ہندو دوست کے غم میں شریک کرنے کے لیے، اس طرح لکھتے ہیں:

ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کرلیا ہے، ۱۸-۱۹ برس کی عمر، قوم کھتری، خوب صورت وضعدار نوجوان ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ گیا مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک "تاریخ" اس کے مرنے کی لکھوں، ایسی کہ وہ "تاریخ" نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی، اس مسائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک۔ معہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے۔ جو خونچکاں شعر تم نکالو گے۔ وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بطریق مثنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔ مصرع آخر میں مادۂ تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو "بابو۔ بابو" کہتے تھے۔ چنانچہ بحر ہزج مسدس مجنون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں، چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آئندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ دو۔ چاہو کوئی اور طرح نکالو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو متوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور "بابو برج موہن" سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ میرا شعر یہ ہے

برم چوں نام بابو برج موہن
چکد خونِ دل ریش از لب من

(اپریل ۱۸۵۸ء)

اسی حادثہ جانکاہ کے سلسلہ میں منشی ہر گوپال تفتہ کو ۴ر مئی ۱۸۵۸ء کے خط میں پھر لکھتے ہیں:

"صاحب! وہ جو میں نے بائیس شعر مرثیہ کے لکھ کر تم کو بھیجے اس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ

تمہاری تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ پچھ اوپر اسّی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست وگریبان تھے اور ایک کو ایک سے ربط۔ ایک یا دو شعر اس میں سے کیوں کر لئے جاتے؟ اشعار سب میرے پسند، بے سقم، بے عیب۔ وہ جو تم لکھتے ہو کہ :

حرفِ بابو برج موہن مے زنم

اور اس کا دوسرا مصرع بھول گیا ہوں۔ مگر قافیہ میں ''من'' ہے۔ یہ شعر غالبؔ کو برا معلوم ہوا ہوگا۔ واللہ باللہ جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی:

لیکن اپنے بھتیجے یوسف مرزا کو ان کے ماموں (مظفر الدولہ) اور ان کے باپ (محمد نصیر) اور ان کے بیٹے کی اموات پر جو خطوط لکھے ہیں، وہ نہ صرف المیہ کی ایک بہترین مثال ہیں، بلکہ دل گداختہ کی علامت بھی، جن الفاظ میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے، انکی میں ہم سب قدر مشترک کا احساس کر سکتے ہیں۔ جون ۱۸۵۹ء کے خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

اے میری جاں، اے میری آنکھیں

زہجران طفلے کہ در خاک رفت
چہ نالی؟ کہ پاک آمد وپاک رفت

وہ خالق کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے! اولاد بہت، نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہوں! وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ ہاں مظفر الدولہ کا غم من جملہ واقعات کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔

یہ خط مرزا کی زندگی کا عکاس اور ان کی ادبی صلاحیت، غم دل آرزو کا غماز ہی نہیں۔ اپنے ایک عزیز قریب کی جدائی کا مرثیہ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غمِ عزت......!

غم مرگ: میں قلعہ نامبارک (قلعہ معلیٰ سے مراد ہے) قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ مصطفیٰ خان ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟

غم فراق، حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے! گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا، اس کی بیٹی اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں، اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے؟ یہاں اغنیا اور امراء کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں۔ اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے! (۹ رمئی ۱۸۶۰ء)

اِن ہی یوسف مرزا کو دس دن کے بعد ۱۹ رمئی ۱۸۶۰ء کو کس کرب انگیز انداز میں لکھتے ہیں:

''یوسف مرزا، کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ (محمد نصیر) مر گیا۔ اور اگر

لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو؟ مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ! بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے، تو میں کہوں گا، یوسف مرزا کو۔

تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوان مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ''!

ان طویل اقتباسات سے مرزا غالبؔ کے ''نثری مرثیے'' کی نشان دہی کرنا مقصود تھا، اسی کے ساتھ ذہن کے گوشے سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ غالب نے باقاعدہ طور پر مرثیہ نگاری کیوں نہیں کی؟ وہ اس صنف سخن کی جانب، قصیدہ، غزل اور قطعات کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوئے! اس سوال کا جواب ان کے معاصر تذکرنگاروں سے مل جاتا ہے۔

مرثیہ، اردو ادب کے شروع دور سے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر چہ اس کی شکلیں، مختلف دور میں، مختلف النوع رہیں۔ مگر مرثیہ کا جو تصور ابتدا میں قائم ہوا تھا وہ آخر تک باقی رہا۔ اگر چہ بعد میں شخصی طور پر مرثیے کہے جانے لگے۔ مثلاً چکبست کا مرثیہ گوکھلے اور تلک۔:الطاف حسین حالی کا: مرثیہ غالب: کی وفات پر، اقبالؔ کا مرثیہ: داغؔ: کی موت پر...... لیکن ذہنی اور سماجی طور پر مرثیہ کا اطلاق: واقعۂ کربلا: کے ذکر و بیان سے ہی متعلق سمجھا گیا اور افضیلت اسی تصور کی باقی رہی...... اردو کی اس صنف شاعری کی تاریخ پر اگر طائرانہ نظر بھی ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ دکن سے دلی اور پنجاب سے بنگال تک کے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ اور اپنے خیالات کو عقیدت کے الفاظ میں سمو کر اور جذبۂ خوش عقیدگی کے ہار میں گوندھ کر حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے پر فخر محسوس کیا ہے، غالب نے تو اپنے کو غلام علیؑ اور بوترابی کہنے پر انبساط کیا ہے۔

اہل بیت اطہارؑ سے رغبت و محبت، حب علیؑ اور حب فاطمہؑ اور حب رسولؐ و حب ائمہؑ کے بیان سے، نہ ان کی زبان تھکتی ہے، نہ فکری رجحانات میں کمی آتی ہے۔ وہ نثر ہو یا نظم، موقع

بے موقع، ہر جگہ اپنی عقیدت اور عشق حقیقی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ ''بندۂ علی ابن ابی طالب'' علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں، لکھتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں:

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے، ساقی کوثر کے باب میں

اس ارادت ومحبت کا کیا کہنا......:سوءِ ظن: کی ترکیب استعمال ہی اظہار ووارفتگی کی بیّن دلیل ہے۔ یہی نہیں......:اسد اللہ الغالب میں بھی......وہ، جو کیف پاتے ہیں، اس سے عشق الٰہی اور عشق علیؑ دونوں راز آشکارا ہوتے ہیں۔ یہ جذبۂ محبت وارادت نہ صرف علیؑ تک محدود ہوتا ہے بلکہ آل علیؑ سے بھی وہ اسی الفت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جہاں قصائد ومناقب نظم کئے وہیں سلام اور مرثیہ نظم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی روانگیٔ مدینہ اور ورود کربلا سے متاثر ہو کر جو مرثیہ نظم کیا تھا اس کے متعلق سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کا بیان ملاحظہ ہو:

''ایک دن مرثیے کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے، میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا، تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہو گیا...... پھر فرمایا کہ، واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا''۔

(تذکرہ جلوۂ خضر)

مگر تنقید نگاروں، محققوں اور تبصرہ نگاروں کو صفیر بلگرامی کے بیان سے سخت اختلاف ہے۔ چنانچہ رسالہ اُردو میں قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون میں، ان الفاظ سے صفیر بلگرامی کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ: غالب کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا، تعجب ہے، حالاں کہ اس بیان پر نہ حیرت کی ضرورت ہے، نہ تعجب کی۔ مرزا دبیر اور میر انیس کی شاعری کے فرق اور قدروں کو سمجھنے کے لیے، خود غالب کی شاعری کے حشر کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ غالب کی زندگی میں ان کے اردو کلام کی قدر کس نے کی؟ بعض تو ان کو شاعر بھی شمار کرنے پر رضا مند نہ تھے۔ اسی طرح انیس کے کلام کی روانی، شستگی، شگفتگی، سلاست بیانی اور نازک ادائی کو بعض اصحاب فن ناپسند کرتے تھے، برخلاف اس کے مرزا دبیر کی مشکل پسندی، جدّت طرازی اور دقیع الفاظ کا استعمال، پسند عام کی چیز نہ ہوتے ہوئے بھی، سودا پسند حضرات کو، اسی میں لطف ملتا تھا۔ اگر اس بات کو مدّ نظر رکھا جائے تو غالب کا

شمار اسی گروہ میں ہوگا، اس کے بعد اگر غالبؔ نے مرزا دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کے ذکر پر پسند خاص کا اظہار کیا اور میر انیسؔ کا نام نہیں لیا۔ تو صفیر بلگرامی کے اس بیان پر شک کیوں کیا جائے۔ ویسے صفیرؔ کی اس تحریر کی تصدیق، ایک اور معاصر تذکرہ نویس ریاضؔ الدین امجد کے تذکرے: سیر دہلی: سے بھی ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''مرزا نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سُنائے لوگ روئے پیٹے اور چلائے......'' (سیر دہلی ص ۲۱-۲۷)

سیر دہلی کے علاوہ یادگار غالب میں حالیؔ نے غالب کی مرثیہ نگاری اور عاجزی، دونوں کی تفصیل یوں لکھی ہے۔

''ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ چوں کہ مرزا ان کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ان کے سوال کو روکنا نہیں چاہتے تھے، ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مرثیہ لکھنے بیٹھے چوں کہ اس کوچہ میں کبھی قدم نہ رکھا تھا اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی، جس کو اور لوگ حد کمال تک پہنچا چکے تھے اور قوا میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے، جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے......ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیئے اور صاف لکھ بھیجا کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں''۔ (یادگارِ غالب)

اس اقتباس کے بعد: سیر دہلی: کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو، جس سے اس جعل کے اصل ہونے کا یقین اور شک کے رفع ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

''......میں چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں نواب اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ رہتے تھے۔ گیا۔ مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا...... بعدہ مرزا نے تین بند مرثیے کے اپنی تصنیف کے سنائے،

لوگ روئے، پیٹے، چلّائے۔ وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر دیئے...... فرماتے تھے کہ یہ حصہ دبیر کا ہے، وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا۔ ہم سے آگے نہ چلا۔ ناتمام رہ گیا"۔ (سیرِ دہلی۔ ص ۲۱-۲۷)

دراصل غالب کی طبیعت :مرثیہ نگاری: کی طرف مائل ہی نہیں تھی۔ ان کے خطوط کے جو اقتباسات اس مضمون میں شامل ہیں، ان سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غالب نے عارف کی موت پر جو مرثیہ نظم کیا ہے وہ :غزل نما: کی شکل میں ہے۔ مسدّس یا ابیات کے انداز میں نہیں ہے۔ اس میں بھی دو، تین شعر چھوڑ کر، باقی اشعار میں عام دنیاوی باتیں نظم کی ہیں۔ جس کو ہم نہ غزل کہہ سکتے ہیں، نہ مرثیہ...... قطعہ حزنیہ میں شمار کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہاں غالب کے مرثیہ کے تین بند، ایک سلام اور مرثیہ عارف یک جا صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہی غالب کا کل شعری سرمایہ مرثیہ نگاری ہے۔ اگرچہ فارسی کلیات میں ان کے غم واندوہ کے لافانی شاہکار موجود ہیں۔ مگر اردو میں اس صنف شاعری پر اسی قدر طبع آزمائی کی تھی۔

مرثیہ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر، جوان تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا، گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے، ایسے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال، یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا، جواں مرگ، گزارا کوئی دن اور

نادان ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

مرثیۂ سیّد الشہداء

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلہ خونِ چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن وطاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایہ، جومدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم ہے، دل وچشم وزباں کا
کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے جہاں کا
کیسا فلک؟ اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس روسے کہو، برق نہیں ہے

یہ مرثیہ یادگارِ غالب، سیر دہلی، بیاض علائی اور تذکرہ جلوۂ خضر کے علاوہ قدر بلگرامی کے نام صفیر بلگرامی کے اس مکتوب میں بھی ہے جس کی نقل بدست صفیرؔ بلگرامی راقم کے پاس محفوظ ہے۔ اس میں بھی یہ بند اسی طور سے لکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ میر انیسؔ کے ایک مرثیہ کے پہلے بند کو لکھ کر صفیرؔ نے یہ ثابت کیا ہے کہ میر انیسؔ کا یہ مرثیہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' کے فلاں شعر کی تشریح وتطبیق ہے۔ اور یہ کہ: میر انیس. ایک ہی بات کو: کئی کئی طرح باندھنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔ لیکن ان کا کلام، نہ صرف انہی کے منہ سے سننے میں لطف ومزا دیتا ہے: مگر: دبیر کے یہاں یہ بات نہیں ہے:...... یہ خط بہت طویل اور اس مبحث پر خاصا کچھ لکھا ہے۔ جو کسی اور وقت پیش کروں گا۔

اب آپ غالب کا: سلام: ملاحظہ فرمایئے کس عقیدت اور جذبہ سے نظم کیا ہے:

سلام غالبؔ

سلام اُسے کہ اگر بادشادشہ کہیں اس کو / تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا ستائش ہے / کہو کہ خامسِ آلِ عباؑ کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟ / کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا / اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو
فروغِ جوہرِ ایماں حسینؑ ابنِ علیؑ / کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو
کفیلِ بخششِ اُمت ہے، بن نہیں پڑتی / اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو
مسیحؑ جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی / ستم ہے، کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو
وہ جس کے ماتمیوں پر، سلسبیل، سبیل / شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو
عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات / کہ جن وانس وملک سب بجا کہیں اس کو
بہت، ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ، بلند / بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اس کو
نظارہ سوز ہے یاں تک، ہر ایک ذرّۂ خاک / کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو
ہمارے درد کی یارب، کہیں دوا نہ ملے / اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حُسنِ صبر کی داد؟ / مگر نبیؐ وعلیؑ مرحبا کہیں اس کو
زمامِ ناقہ، کف اس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں / پس از حسینؑ علیؑ، پیشوا کہیں اس کو
وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے / کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد / پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں / علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا، اجتہاد کا پایہ / بُرا نہ مانیئے، گر ہم بُرا کہیں اس کو
علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ / کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے / رکھے امامؑ سے جو بغض، کیا کہیں اس کو

بھرا ہے، غالب دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

غالبؔ دہلوی نے اُلفت آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو نظریہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ لاثانی تھا۔ انہوں نے عشقِ محمد وآلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا ایمان بنا رکھا

تھا۔غزل میں منقبت اور معرفت کے مضامین ان کی صفت خاص کی نشانیاں ہیں مگر واقعہ کربلا چوں کہ حزنیہ اور المیہ داستان کی موجب ہے اس لیے انہوں نے اس راہ میں قدم رکھنا مناسب نہ جانا، پھر بھی جو المیہ جس انداز سے بیان کیا ہے وہ عارفانہ ہے ورنہ یہ شعر زبان قلم پر نہ آتا۔

علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو؟
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
رکھے امامؑ سے جو بغض، کیا کہیں اس کو؟

ان اشعار کو مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں اور غالب کی زبان میں خونین نوا بھی، ان اشعار میں جو سوال غالب نے قائم کیے ہیں ان سے نفی کیوں کر ممکن ہے۔

(ماہنامہ نقوش لاہور)

☆☆☆

نوٹ:- ماہنامہ نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل بن میاں عمر الدین کی ولادت ۱۴/اگست ۱۹۲۳ء کو ہوئی تھی۔ وفات اسلام آباد میں ۴/۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو ہوئی مگر تدفین قبرستان یعنی لاہور میں کی گئی۔ طفیل صاحب سے میری ملاقات دیرینہ تھی۔ بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ اردو ادب کے لیے انہوں نے بہت نادر کام انجام دیے۔

ایک روشن مستقبل: سر سید احمد خان

پروفیسر رشید احمد صدیقی، سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونورسٹی نے ایک مجلس میں یہ بات کہی کہ سر سید کی شخصیت کے لئے برابر تذکرے ہونے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر عبد العلیم، سابق صدر شعبہ عربی اور اسلامیات، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے کہا۔ عنوان کیا ہو؟ مقصد یہ کہ مذاکرے میں سر سید سے متعلق نئی باتیں سامنے آئیں گی۔ پھر بھی ہم اُن کی شخصیت و جامعیت کی حد مقرر نہ کر سکیں گے، اور اس کے شواہد موجود ہیں۔

عہد سر سید کے ایک ممتاز رکن اور استاد میر ولایت حسین صاحب زیدی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے "حیات سر سید" لکھ کر، اُن کو جاودان کرا دیا۔ اسی طرح مختصر ترین حالات ایم. اے. او. کالج لکھ کر اپنے دَور کی ایک تاریخی دستاویز میر صاحب نے رقم کر دی۔ جس سے ہمیں ان کے زمانے کے بہت سے اہم واقعات کی آگاہی ہوتی ہے۔

اتفاق سے میر ولایت حسین زیدی، میرے ایک دادا سید ابن مرتضیٰ بلگرامی کے والد سید محمد مرتضیٰ بلگرامی کے احباب میں شامل تھے۔ اسی لیے ابن مرتضیٰ بلگرامی، میر صاحب کی اتالیقی و سرپرستی میں ظہور وارڈ میں مقیم تھے۔ حصول علم کے بعد آپ صوبہ بہار کے مختلف اضلاع میں سرکاری افسر کے منصب پر فائز رہے۔ ضلع شاہ آباد (بہار) کے قصبہ کواتھ کے نامور زمینداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اپنے علاقہ کے معززین میں سے تھے۔ میر صاحب کی اُتالیقی میں میرے دادا کے بعد میرے والد و عم ذی قدر کو بھی یہ شرف حاصل رہا۔

سر سید ایک طائفہ لے کر آگرہ تین روز کے پروگرام کے خیال سے تشریف لے گئے۔ اول روز کے اجلاس میں بس چند ہی نفوس کے علاوہ اہل آگرہ تشریف نہ لا سکے۔ اس لئے سر سید نے دوسری صبح ایک کارندے کو دلی روانہ کیا۔ کہ وہ مولوی نذیر احمد صاحب سے مل کر اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دے۔ کارندہ جب مولوی صاحب سے دلی میں ملا۔ تو ڈپٹی نذیر احمد نے بَرافروختہ ہو کر کہا۔ میں سر سید کا غلام نہیں ہوں۔ اُن سے کہہ دو میں شرکت نہ

کروں گا (ان دنوں سرسید اور مولوی نذیر احمد سے تعلقات برگشتہ تھے)۔ وہ شخص نامراد واپس آگرہ آگیا) اسٹیشن سے کچھ فاصلہ پر اُس نے اعلانچی کی صدا سنی کہ۔ آج مولوی نذیر احمد صاحب قوم سے خطاب کریں گے۔ یہ اعلان سُن کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ یکہ بان سے تیز رَوی کی بات کہی۔

اور سرسید کے حضور حاضر ہوکر وہ الفاظ دہرائے۔ جو مولوی صاحب نے فرمائے تھے۔ مگر سرسید نے کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ شام آگئی۔ لوگ جُوق دَر جُوق جلسہ گاہ کی سمت رَواں دَواں نظر آئے۔ جلسہ کی ابتداء کا وقت آگیا۔ کاروائی شروع ہوگئی۔ مگر مولوی صاحب دُور دُور تک نظر نہ آئے۔ لیکن واہ رے سرسید کی مَردم شناسی وہ ناامیدی کے شکار نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ لمحہ آگیا۔ جب مولوی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر، ڈائس پر اچانک تشریف لائے اور ایک سمت خاموشی سے بیٹھ گئے۔ سرسید نے اس عظیم شخصیت کو دیکھا اور اس نے بھی کارروائی کو ملاحظہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی سرسید نے اعلان کیا کہ اب مولوی نذیر احمد صاحب قوم سے خطاب کریں گے۔ مولوی صاحب کھڑے ہوئے، مجمع کو ایک نظر دیکھا اور برجستہ یہ شعر پڑھا:

مسلمان کلکٹر ؛ مسلمان جج ہو
تو پھر دُھوم سے چل کے مکہ میں حج ہو

اس شعر نے سوئے ہوئے افراد کو جگا دیا۔ پیغامِ عظیم، حصولِ علم کے واسطے اس سے زیادہ بات کیا کہی جاسکتی تھی، مولوی صاحب کی نبض شناس طبیعت نے ایسے الفاظ کہے، جس سے قوم کے افراد تڑپ گئے۔ اور لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی جیبیں خالی کر کے، اپنے گھروں کو واپس گئے۔ خواتین نے اپنے زیور اور نقدی نچھاور کردی۔ اور تو اور صبح دم ایک شخص نے ایک بڑی سی پوٹلی اور کچھ رقم سرسید کو پیش کی کہ آگرہ کی ''طوائفوں'' کی طرف سے کالج کی نذر ہے۔ جب یہ رقم علی گڑھ پہنچی تو اکابر حضرات نے سخت مخالفت کی اور کہا کہ...... ایسی نجس اور حرام رقم سے ہم اپنے بچوں کی تعلیم کا نظم ہرگز نہ کریں گے۔ سرسید نے کمال ضبط سے کہا...... ہرگز نہیں، اس رقم کا یک حصہ بھی کالج کے طلباء پر صرف نہ ہوگا۔ بلکہ اس رقم سے کالج کے لئے پاخانہ بنوائے جائیں گے۔

میر ولایت حسین زیدی صاحب سے جب اس واقعہ کی تصدیق کی تو لیٹے سے اُٹھ بیٹھے۔ اور فرمایا:...... مرتضٰی صاحب دراصل سرسید کو ہم لوگوں نے پہنچانا، نہ ہی ان کی سیرت

سے ہم نے آشنائی حاصل کی۔ وہ دراصل قوم کے بچوں کو محض علم کے حصول کی خاطر، دَوڑ لگاتے دیکھنے کے قائل تھے۔ یہی سبب ہے تکفیر پر انہوں نے کوئی کلمہ بدمنہ سے نہ نکالا۔ اور بعد میں اُن کے بڑے مخالف اکبرالہ آبادی نے سرسید کی حیات مستعار کے بعد کیسے: المیہ اشعار نظم کیے۔

اور سچ یہ ہے کہ بعض اوقات ہم لوگوں کو بھی سرسید کے بعض احکامات پر اختلاف ہوتا تھا۔ مگر بعد میں ہم سب شرمندہ ہوتے کہ کاش ہم ایسی بات نہ سوچتے۔ مگر سوچتے کیسے نہیں۔ کالج کا مفاد جو وابستہ تھا۔ ایسے ہی واقعات میں، میر صاحب نے کہا کہ...... ہم نے کالج کے جو واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان میں اختلافی امور پر جو روابطہ مذہبی سے ٹکراؤ کا باعث ہوئے، اُن سے پرہیز کیا ہے۔ اس کی اصل کیا ہے۔ فرمایا: کچھ نہیں۔ ایک دن ہم لوگوں نے سنا کہ سربراہ کالج نے اعلان کیا کہ دو مساجد کی تعمیر ہوگی۔ ایک شیعہ مسجد دوسری سنّی مسجد، میں نے اور میر فراز حسین نے باہمی طور پر اس سے اختلاف کیا۔ مگر بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ سرسید سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتا۔ ان کا فیصلہ حرف آخر ہوتا تھا۔ مگر تا بہ کہ، دو چار روز بعد ہمت کر کے خدمت سید میں حاضر ہوئے۔ بنظر آنکھ سے سوال کیا۔ کیا بات ہے؟ عرض گزار ہوئے۔ مسجد اگر ایک ہی ہو تو مناسب ہوگی۔ ایک لمحہ انتظار کئے بغیر فرمایا۔ جب دینیات دو پڑھائی جائیں گی۔ شعبے دو ہوں گے تو مسجد ایک کیسے ہوگی۔ عرض کیا۔ حضور والا، قرآن کے حکم کے مطابق اہل تشیع کے (روزے کا وقت) لیل سے ہوتا ہے۔ بس ان کی نماز تمام ہوگی۔ تو ہم داخل مسجد ہو کر فریضہ خداوندی اَدا کرلیں گے۔ اس بات پر سرسید نے خاموشی اختیار فرمالی اور مسجد کی تعمیر بس ایک ہی ہوئی۔ راقم نے دریافت کیا۔ میر صاحب دوسری یعنی شیعہ مسجد کی تعمیر کہاں ہوتی؟ فرمایا: ظہور وارڈ کے سامنے جو میدان تھا۔ اس مقام کو شیعہ مسجد کے واسطے مخصوص فرمایا تھا۔ اتفاق سے اب اس مقام پر دیگر شعبہ جات کی عمارت تعمیر ہوگئی ہے۔ یعنی سرسید کے خواب مسجد کی تعمیر، اگر مقصد مسجد کا عبادت ہے تو تحصیل علم کے مرکز کو ہم مقام عبادت گاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس تناظر میں اگر حیات سرسید کو دیکھا جائے اور مشاہدہ کیا جائے تو سید احمد کی بصیرت فکری آگہی کے کئی گوشے سامنے آسکتے ہیں۔ دراصل اس دَور اور عہد کے افراد کے لوگوں کا فرض تھا کہ رابطہ رکھ کر اُن واقعات کی معلومات حاصل کرتے یا اُسے قلم بند کراتے تو ایک دستاویز کا کام کرتیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بلکہ محض ان کی تصانیف اور مرکزی امور کی

جانکاری پر ہم نے اکتفا کیا۔ شاخوں سے تعلق کم رکھا۔ بلکہ ان سے صَرف نظر کیا۔ کاش ہم ایسا نہ کرتے، اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری و معتمد جناب محمد اجمل صاحب، جن کے حالات زندگی ان کے اپنے دست و قلم کے، راقم کی تحویل میں ہے۔ ان سے ایک گفتگو میں سوال کیا...... کہ مولانا آزاد کا نظریہ سر سید کے متعلق ذاتی طور پر کیا ہے؟ آپ کا اندازہ کیا ہے؟ بلا جھجک اجمل صاحب نے کہا...... مولانا کا خیال، سر سید کی تہذیبی، علمی اور قومی کے متعلق اظہر من الشمس ہے مگر ان کا خیال ہے کہ سر سید کے جو کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ سچے ہیں، لیکن میری نظر میں ان کی حیات کا کارنامہ، محض مسلمانوں کی تعلیم کی حد تک نہ تھا اور نہ ہی یہ کہ ہندی مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے، اس سے وہ متاثر تھے، وہ تو گویا سامنے کی بات تھی۔ شاہی مسلمانوں کی میراث تھی، اس کے خاتمہ کے لیے، ان کو سزا تک کا مستحق قرار دینا، لازم تھا۔ وہ کیا گیا، پھر بھی میری نظر سے سر سید کا اصل کارنامہ اس انگریزی کی تصنیف کے جواب میں پوشیدہ ہے، جس کی تیاری لندن میں بیٹھ کر اسی ماحول میں رہ کر انہوں نے انجام دیا، اور مدلل جواب تیار کر کے، اسلام پر بلکہ مسلمانوں پر احسان کیا۔ ورنہ کیا یہ حق بات نہیں کہ ہمارے حضورﷺ کی حرمت پر جو حرف آ رہا تھا، ان کی عظمت پر داغ لگا رہا ہوتا، تو کیا ہم مسلمانوں کی حیثیت کچھ وقیع ہو پاتی؟ ایسے حالات میں کیا صرف حصول تعلیم مسلمانان ہند، اس کا مداوا قرار پا سکتا تھا؟ اجمل صاحب نے ذرا ہمت کر کے یہ بات کہی کہ...... خود مولانا نے ایسا کوئی کارنامہ اپنی دانست میں بہ ظاہر انجام نہیں دیا، جو قومی شعور اور مسلکی شعور سے مطابقت رکھتا ہو، مگر وہ سر سید کے عمل خیر سے ہمیشہ متاثر رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری دنیا کی مثل، ہندی مسلمان رسوائی اور ظلم کا شکار بن رہا تھا۔ ملک میں اس کی کوئی شناخت اور حیثیت باقی نہ رہی، سر سید نے ہندی مسلمانوں کو ان کی حیثیت سے اس وقت آگاہ کرنے کی سبیل کی، جب وہ شناوری کے دَور سے گزر رہے تھے، اللہ نے ان کو ماحول کے خلاف کام کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ ہندوستانی ماحول میں انگریزی کے اقتدار نے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے واسطے سید سے جو کچھ بن سکا، کرنے کی سعی کی، ماضی کو فراموش کرنے، حال سے صَرف نظر کرنے اور مستقبل سے رشتہ استوار کرنے کی سمت، انہوں نے عملاً توجہ دلائی، بنارس اور غازی پور سے دلّی اور علی گڑھ تک تعلیم کے حصول کا ایک جال پھیلا دیا۔ اسباب بغاوت ہند لکھ کر، جہاں انگریزوں کو متنبہ کیا، وہیں ایک بہتر سماج، بہتر قوم، بہتر تصورِ حیات، سائنسی اور علمی بات کی تشکیل کا کام بھی سر انجام دینے کی سمت قدم اٹھایا، اور

سر سید نے رندگی کے گزارنے سمت توجہ دلانی چاہتا ہے۔ اس کی راہ کیا ہو؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر سید نے اس رمز کو پالیا تھا کہ خود مسلم معاشرہ قصوروار ہے، اور زمانہ کے ہاتھوں وہ خود کِھلونا بنا ہوا ہے۔ اور بقول علامہ اقبال:

آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

ورنہ حالات اتنے بدتر نہ ہوتے، جو ان کے سامنے تھے، وہ اس سے بھی باخبر تھے، کہ صرف مسلمان کا قصور نہ تھا۔ مگر انہوں نے اسے نفی کے خانے میں رکھا۔ یوں کہ مسلمانوں نے اپنی ہیئت گذائی کے لیے جو راستہ متعین کر رکھا ہے، وہ کم لائق تعزیز نہیں ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات سر سید کے پیش نظر تھے۔ ان کا مداوا انہوں نے ان کے لیے مثبت رویہ اپنانے پر زور دیا۔ اور تعلیم کو ایک نشانہ یا بہانا بنا کر۔ اس راہ سے مسلمان قوم کو نجات دلانے کی سوچ پیدا کرنی چاہی۔ اور تہذیبی، علمی خدمت بلکہ تواریخی طور کو پیش نظر رکھنے کی ہر سبیل پیدا کرنے پر زور دیا۔ ورنہ ڈولی میں بیٹھ کر قطب مینار کے کتبے لکھ کر، ورق سادہ کو عطا نہ کرتے۔ ان کو کیا پڑی تھی جو وہ کہتے، جس کی اصل سے "اس وقت کے مظلوم اور تباہ شدہ مسلمانوں کو کوئی واسطہ نہ تھا، بلکہ بظاہر ان کتبوں کی عبارت سے، آثار الصنادید، سے اس وقت مسلمانوں کی کیا ملتا، مگر سر سید نے اپنے اس عمل سے ایک ایسی تاریخ رقم کی ہے، جس کی دوسری مثال ہمارے معاشرے اور تمدن میں نہیں ملتی۔ کیا یہ حق نہیں ہے کہ سر سید نے فکری اور علمی لحاظ سے مسلمانوں کے اندروں خیر وشر، قضاوقدر، نفع ونقصان کے اسباب پر غور وفکر کی دعوت جس عنوان سے دی اور ہواوہوس سے دُور رہنے کی تلقین کی صلح جوئی، معاملہ فہمی ادراک رسی اور خود سپردگی وحق گوئی کو خاطر میں رکھتے ہوئے، دَرس دیا، صبر وضبط اور غلط رَوی پر بھی استقامت بلکہ ذی ہوش رہنے کی بات کہی اور عملاً اسے پیش کیا، وہ کسی انسان سے ممکن ہو یا نہ ہو، مگر سر سید نے اس کی ایسی مثال قائم کی جو ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ ایک واقعہ سن لیں کہ:

"......مراد آباد کے ایک شخص نے وہاں کے کلکٹر کو رُوزگار کے لئے درخواست دی اور یہ کہ وہ سر سید کا داماد ہے۔ کلکٹر (انگریز) جو سر سید کا شناسا تھا۔ اس نے اسے ملازمت کا پروانہ جاری کر کے، اس کی نقل سر سید کو اطلاعی طور پر روانہ کرادی۔ سر سید نے اس موصولہ خطہ کو رکھ لیا۔ جب چند ماہ بعد ان کا مراد آباد جانا ہوا تو اس خط کو اپنے ہمراہ لیتے گئے۔ متعلقہ دفتر سے معلومات حاصل کی کہ اس کی پوسٹنگ کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ کسی دیہات میں متعین

ہے۔ سر سید نے اسے بلایا اور وقت ملاقات اس سے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ تم میرے داماد ہو، مگر ہاں تمہاری بیوی ضرور میری بیٹی ہوگی، قوم کی بچی، میری بیٹی ہی تو ہے نا؟ لہٰذا تم کوئی ایسا کام نہ کرنا، جس سے میری نگاہ جھکے اور میری شرمندگی کا باعث ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس نے سر سید کے نام پر ان کا داماد بن کر ملازمت حاصل کی تھی، اب بتایئے اگر ان کی جگہ ہم آپ ہوتے تو اس علم پر کیا کرتے؟ اس کو دھوکہ دہی کے جرم میں جیل کی ہوا نہ کھلاتے؟ مگر سر سید نے کمال ضبط و تحمل سے کام لیا۔ اور نسبت کو برقرار رکھا۔ ہم میں سے کوئی ایسا ہے جو ایسے عمل کے بدلے میں، عمل خیر کی سمت قدم اٹھائے؟۔

سر سید کے آفاقی عمل کی داستان طویل ہے۔ جس کا اعتراف ان کے عہد کے سوا، آج بھی ہم اس کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں، مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پیغام سر سید سے سبق لے کر اور ان کے افکار سے اپنے خیالات کو جلا بخشیں، اور قوم میں علم، اتفاق، اتحاد، موانست، کو فروغ دینے پر کاربند ہوں، نیز مسلمانوں کے تمام فرقوں اور مسلک و عقیدوں کے ماننے والوں کو دین حق کے تحفظ کی خاطر، اپنی رنجشوں، بغض، نفرت کو دل سے نکال کر، متحد ہو کر، ایک نہج پر آنے کی دعوت دے کر دشمنان سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کریں اور امن و سلامتی سے زندگی گزارنے کی سمت توجہ پر عمل کریں، یہ پیغام ساری ملت مسلمہ کے لئے دعوتِ فکر کے مرادف ہے۔

☆☆☆

قومی اتحاد کا پہلا علمبردار "سر سید"

سر سید کی تحریک علی گڑھ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے داخلی اور خارجی معاملات کی ایک علمی اور تہذیبی تحریک تھی۔ انہوں نے اس تحریک کا ڈانڈا سیاست سے کبھی نہیں جوڑا۔ نہ اسے ایک فرد اور ایک ذات، ایک قوم یا ایک ملت سے وابستہ کیا۔ سر سید کی بصیرت نے اسے ایک ذات۔ ایک قوم یا ایک ملت سے وابستہ نہ رکھا۔ سر سید کی بصیرتِ ذہنی کا یہ ایک ایسا عملی کارنامہ ہے جس سے صحت مند، تندرست اور توانا مذہبی تعصبات سے دُور صرف تعلیم حاصل کرنے والے گروہ کے لئے کھلے آسمان کے نیچے، ایک ایسا علم خانہ قائم کرنا تھا، جس کے بورڈنگ ہاؤس میں ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آسمان سے بارش امیر و غریب، مُفلس و گدا، چھوٹے بڑے اور ہندو مسلمان سب کے لیے رحمت کا باعث بنتی ہے۔ یا جب چاند طلوع ہوتا ہے تو اس کی نورانی کرنیں اپنی روشنی سے ہر گھر میں اُجالا کر دیتی ہیں، اس عمل میں ہندو مسلمان کا ذرا بھی امتیاز نہیں ہوتا۔ سر سید نے مدرستہ العلوم کو بلا کسی قید و ملت کے، ہر فرقے کے واسطے اس کے حقوق، دوامی کا خیال کرتے ہوئے اِعلان کر دیا تھا، اور یہ بات بھی صاف بلکہ واضح طور پر کہہ دی تھی کہ۔

"صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے (حقوق) اس کو حاصل کرے، اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں۔"

یہی نہیں، سر سید نے آگے چل کر ایسی بے مثال بات بھی کہی جو آج کے محبّ وطن سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ ہم جذبہ قومی کا محض نعرہ لگانا جانتے ہیں، ہندوستانی ہونے کا دعویٰ کرنا جانتے ہیں، مگر ہندوستان ہے کیا؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ قوم اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ قوم سے فائدہ کیا اور ملک کی سالمیت سے نتیجہ کیا اَخذ ہوگا یا ہو سکتا ہے؟ اس سے قطعی طور پر بے بہرہ ہیں۔ ورنہ کوئی مورخ اس کی نشاندہی کرے کہ سر سید نے جنوری ۱۸۸۴ء کی انتہائی تاریخوں میں جو بات کہی تھی، اس کو کسی اور نے اس انداز سے کبھی دُہرایا بھی

ہے؟ دراصل فکری جذبہ ایک ایسا نشاط ثانیہ ہے جس کا اثر صرف اسی ذات پر ہو سکتا ہے جو خود ایک قوم اور قومی بیداری کے جذبے کی حس رکھتا ہو۔ اور جب تک شعور بالغ نہ ہو، فکر بلند نہ ہو، جذبہ اُرفع و اعلیٰ نہ ہو، خیالات میں علمی رچاؤ نہ ہو، حس کا بیدار ہونا ناممکن ہے۔ جب کہ سرسید کے یہاں عملی پختگی، ذہنی ہم آہنگی اور شعوری بالغ نظری کا وافر مادہ موجود تھا۔ یہی سبب تھا کہ سرسید نے ہندوستانی مسلمان اور ہندوؤں کو اپنی دو آنکھیں تصور کرنے کے بجائے یہ کہا کہ...... کاش میرے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا۔ اگر چہ اصطلاح اور رواج عام میں ایک آنکھ کا ہونا داخل عیب ہے۔ مگر سرسید کی اصطلاح اور رِواج عام کا تصور جدا تھا۔ وہ قوم کو ایک ایسی تسبیح میں پرویا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ جسکے سو (۱۰۰) دانے تو ہوں مگر وہ جُدا جُدا نہ کہلائیں، بلکہ ان کی علٰحدگی ایسی سالمیت ہو کہ جب کوئی اسے اٹھانا چاہے تو سب ایک ساتھ اٹھیں جب رکھنا چاہے تو سب ایک ساتھ رکھے جائیں۔ وہ دانے محض دانے نہ ہوں بلکہ ایک طاقت ہوں سرسید نے اس طاقت کا نام قوم اور قوم کا نام ہندو اور مسلمان رکھ چھوڑا تھا اور ذات کا نام ان کی تاریخ میں ہندوستان تھا۔

سرسید اور ان کی تحریک کو ہمارے دانشوروں نے جس نگاہ سے بھی دیکھا ہو۔ اِس کا اُن کی اختیار ہے۔ مگر خود سرسید نے مشترک ہندوستان کے ضلع گورداس پور (پنجاب) میں ایک تقریب کے موقع پر یہ کہا تھا:

> ''میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس میں (مدرسۃ العلوم) مدد کی۔ اِس مدد میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں جتنا ہندوؤں کا ہوں۔ جنہوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیون کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔''

قومی اتحاد ایک ایسا درس ہے جو سرسید کے سامنے ہمیشہ اعلیٰ نصب العین کی طرح رہا۔ اس ضمن میں بڑے سے بڑا مخالف بھی ان پر لاف زنی نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں سرسید نے اپنے جذبہ حریت اور جذبہ حب الوطن کی اساس جس جذبے پر قائم کی تھی اس کی توجیح انہوں نے خود ایک موقع پر اس طرح کی تھی:

''مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمان سے ہی نہیں ہے، بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے ہے'' (۲۶ر جنوری ۱۸۸۴ء، شہر امرتسر)

آج سے تقریباً ۱۲۸ سال قبل سر سید نے جو بات کہی تھی اس کا اطلاق ہنوز لفظ قوم پر اسی طرح صادق آتا ہے۔ تقسیم ملک سے قبل اور تقسیم وطن کے بعد مسلمانوں کے ذہنی، فطری، سماجی، اور تہذیبی شعور کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی نیز موجودہ ہندوستان کا پورا ڈھانچہ سر سید کے اسی جذبہ وخیال کے گرد گردش کرتا نظر آئے گا اور یہ بھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو بات ہمارے ملک کے دانشوروں نے محسوس کی اور جس بات کو زبان پر اب لا رہے ہیں کہ قومی ایکتا کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ سر سید نے اس کا اعلان سو سال قبل کر دیا تھا، انہوں نے نیٹو (Native) کا لفظ غیر ممالک میں تحصیل علم کرنے والے ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ قیام کے موقع پر ہی استعمال کیا تھا۔ اور جب یہ بات کہی تھی کہ:

''غیر ممالک والے خدا بخش اور گنگا رام کو ہندوستانی کہتے ہیں۔'' تو ان کا مافی ضمیر یہی تھا کہ جب غیر ملک میں یہ دونوں قومیں ایک ملک کی قومیت کے خانہ میں پکاری جا سکتی ہیں تو خود اپنے ملک ہندوستان میں ایک قوم کی ذیل میں کیوں شمار نہیں کی جا سکتی؟ چنانچہ تاریخ علی گڑھ ایم۔اے۔او۔ کالج کے اوراق کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سر سید نے ایک موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جا سکتے ہیں۔''

یعنی قوم کا لفظ ملک کے رہنے والوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس میں ذات کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے کہ افراد ہی مل کر جماعت اور قطرے ہی مل کر دریا اور سمندر کہلاتے ہیں۔ آسمان پر اگر صرف ایک ستارہ چمک رہا ہو تو اس سے کوئی شخص اپنی منزل کو نہ تلاش کر سکتا ہے نہ اسے پا سکتا ہے مگر اس سات ستاروں سے مسافر اپنی منزل پانے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں جو بلند وبالا آسمان پر جلوہ گر رہتے ہیں۔ درحقیقت اسی یک جائی اور اتحاد کو سر سید نے اپنا مح نظر بنایا اور اسی روشنی کے سایے میں انہوں نے اپنی منزل حاصل کی۔ چنانچہ عہد سر سید کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ:

۱- جادو چند چکرورتی

۲- رام شنکر مصرا

۳- گوبند پرشاد

صرف علم ریاضی کے اُستاد تھے مگر جادو چند چکرورتی کو اس وقت کے تمام اساتذہ میں سب سے زیادہ تنخواہ چار سو روپیہ ماہوار دی جاتی تھی۔ اسی طرح ۱- برج موہن لال ۲- ہرناتھ سنگھ ۳- موہن لال ۴- بنسی دھر ۵- آشوتوش بھٹا چاریہ ۶- ابناپرشاد اور بختاور لال وغیرہ جیسے بہت سے استاد اس درس گاہ میں معلم کی حیثیت سے جمع تھے۔ جس کو سرسید کی اگر اس ایک بات پر غور کیا جائے تو ہم بخوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے یہاں تعصب اور نسلی منافرت کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ ورنہ وہ مسلمانوں کے مدرسہ میں، مسلمانوں کی تعلیم کے لیے غیر مسلمانوں کی جماعت کو دعوت نہ دیتے۔ ان سے کام نہ لیتے۔ اس کے برخلاف سرسید نے اول دن سے اس کا اہتمام کیا اور برابر اس تحریک کو عام کیا کہ قومی یک جہتی، قومی اتحاد اور قومی ہم آہنگی کی اہمیت کا احساس ہر ہندوستانی کو رہنا چاہئے۔ انہوں نے اس طرز خاص سے مذہبی عقیدت کی نفی بھی کی اور اس کو سراہا بھی۔ اختلاف رائے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے مگر اس اختلاف سے ایسے رنج کا قایم ہونا جس سے پورا معاشرہ اور پوری قوم متاثر ہو۔ اسے بد بختی سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا آج ہم کو مل کر یہ طے کرنا ہے کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کا اصل ماخذ کیا تھا۔ سرسید کے جذبہ ملی اور ہمارے جذبہ قومی میں کیا تضاد ہے؟ محبت اور نفرت کا کون سا عمل قوم کے لیے تباہی کا باعث ہوسکتا ہے؟ اس سے کس عنوان سے بچا جا سکتا ہے؟ موجودہ ہندوستان کو کس عنوان سے سرسید کے تصور قومی اور تصور نیشن سے ہم کنار کیا جا سکتا ہے؟ ان سوالات کے جوابات میں ملک کی فلاح مضمر ہے،، جس دن اس سوال کا حل تلاش کر لیا اسی دن ہندوستانی قوم ہمالیہ سے بلند اور گنگا جمنا کے پانی سے زیادہ پوتر ہو جائے گی۔ مگر اس مسئلہ کا حل سیاسی بازی گری میں نہیں ملے گا۔ اس کو ہمیشہ حافظے میں رکھنا ہوگا کہ قوم ملک سے الگ اور ملک قوم سے جدا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سرسید کا یہی فیصلہ تھا اور مسلمانانِ ہند کو پیغام آخر۔

۱- ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء اس دَور میں سرسید کی علمی خدمات مثلاً آثار الصنادید۔ آئینہ اکبری، تاریخِ فیروز شاہی کا ترجمہ وغیرہ۔

۲- دوسرا دور ۱۸۵۷ء تا ۱۸۷۷ء اصلاحی جدو جہد اور اسباب بغاوتِ ہند، سائنٹفک سوسائٹی۔ سفر لندن۔ جہاں لائف آف محمڈن پر محاکمہ کر کے 'خطباتِ احمدیہ' تصنیف کی۔ اُردو

انگریزی میں اور پھر لندن سے واپسی پر تہذیب الاخلاق نکالا جسے ہم اردو ادب کا سنگِ میل کہہ سکتے ہیں۔اس کے سوا M.A.O. کالج ۱۸۷۵ء میں قائم کیا۔

۳- تیسرا دور ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۸ء تک۔سر سید کا بیشتر وقت کالج کو مستحکم کرنے اور قومی بنیاد کو نئی جہت دینے کی طرف گزرا۔ پھر سر سید نے پوری قوم کے ذہن کو نیا چراغ جلانے اور اس کی لَو سے متاثر ہونے پر متوجہ کرنا لازمی جانا۔ان کے پیغام میں زندگی بن کر گونجنے اور خواب غفلت سے چونکانے۔ذہن کو نئی قوت، دلوں کو نیا حوصلہ اور کام کرنے کی صلاحیت اس شان سے عطا کرنے کی، دیکھنے اور سنورنے کی جاذبیت و کشش بخشنے کی سمت آمادہ کرنے پر متوجہ کیا۔جس نے ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر اقوام کو بھی حوصلہ مند بننے پر مجبور کر دیا۔علی گڑھ تحریک دراصل سر سید کے جذبہ ملّی کا دوسرا نام ہے۔محبت اور اُلفت کی زندگی قوم کی میراث ہو سر سید کا اصل پیغام اور اصل مقصد یہی تھا۔ اس لئے آج کے ہندوستان کو سر سید کے اس پیغام کو جان کر، دل و جان سے تسلیم کر لینے میں ہی فلاح کی کنجی ہے۔اس خاکے سے سر سید کی پوری زندگی کا تجزیہ کر کے ہم ان کو قومی اتحاد کا پہلا علمبردار تسلیم کرنے پر مجبور ہی نہیں، آمادہ ہو سکتے ہیں۔ورنہ سر سید کا نظریہ حیات یہ نہیں تھا:

اُداس اُداس ہے چہرا مزاج برہم ہے
یہ سُن لیا ہے کہ پھولوں کی زندگی کم ہے

علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا قطعہ مرگ جو سر سید کے اتحاد سے متاثر ہو کر کہا تھا۔اس نظم سے بھی سر سید کا اتحاد مترشح ہوتا ہے۔

☆☆☆

سید احمد خاں شدن

پہلی روایت:

میرے جد سید ابن مرتضی بلگرامی مرحوم (متوفی ۱۹۳۲ء) کا بیان تھا کہ سرسید بھاری بھرکم بزرگ تھے، ان کی شخصیت بہت جامع اور رفتار گفتار متوازن تھی۔ میر سرفراز حسین اور مجھ سے ایک نسبت خاص رکھتے تھے۔ غالباً نومبر ۱۸۷۵ء کی کوئی تاریخ تھی، اتنا یاد ہے کہ آگرے سے کوئی بڑا عہدے دار انگریز آیا تھا، بہت انصرام داہتمام اور انگریزی پولس کی بہتات اپنے مدرسے میں دیکھی۔ مدرسے کی ابتدا چند یوم کی ہی ہوئی تھی۔ اس لیے زرق برق لوگوں کو دیکھ کر، ہم جیسے کم عمر بچے بھی خوش ہونے کے بجائے، کچھ خوف زدہ سے رہتے، مگر اتنی بات معلوم تھی کہ مدرسے کی عمارت کے سلسلے میں کچھ ہونا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ ولیم مور گورنر اُودھ کو اپنے کالج کی عمارت کا نقشہ دکھایا گیا۔ مقامات دکھائے گئے اور سرسید نے منظوری بھی حاصل کر لی اور کچھ رقم بھی اس سلسلے میں دوست احباب سے پائی۔ لیکن ہمارے حصے کی بات صرف اس قدر تھی کہ اپنے مدرسے اور کالج کی نئی عمارت لال لال اینٹ کی بنے گی اور پھونس کے چھپر ہٹ جائیں گے اور یک بار پھر مٹھائی کھانے کو مل سکے گی۔ دل خوش کن خبر یہی تھی۔

دوسری روایت:

۱۸۹۴ء کی ۶ر فروری کو علی گڑھ کی مشہور زمانہ نمائش میں ہمارے مرشد اعلیٰ سرسید نے ایک ڈرامہ پیش کیا تھا۔ جس میں مزاح کم، طنز کے عنصر زیادہ تھے۔ مگر سب باتیں .... تعلیم سے متعلق تھیں۔ فلاح و بہبود کی باتوں پر زور تھا۔ اس ڈرامہ کا ایک رکن میں بھی (ابن مرتضی بلگرامی) تھا۔ پہلے تو چندہ جمع کیا، پھر ایک رول دیا گیا۔ جس کی ادائیگی پر سرسید نے مجمع عام میں اپنے سینے سے لگا لیا۔

تیسری روایت:

سچ یہ ہے کہ سرسید نے پوری مسلمان قوم کو بالخصوص اور ہندوستان کی دوسری اقوام و

ملل کو جس انداز سے گلے لگایا وہ تاریخ ساز بات ہے۔ دراصل سر سید کا فکر و عمل یکساں تھا۔ فرقہ پرستی کی سر دلہر ان سے کوسوں دور تھی۔ یہی سبب ہے کہ کارکنوں میں جادو چندر چکرورتی جیسے ماہرِ ریاضی شریک تھے اور شبلی نعمانی بھی۔ اس ضمن میں لوکس فائزر کی بات کتنی سچی لگتی ہے۔

۱- ایک آدمی جو اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے، مزدور کہلاتا ہے۔

۲- ایک آدمی جو اپنے ہاتھ اور دماغ سے کام کرتا ہے، کرافٹس مین کہلاتا ہے۔

۳- ایک آدمی جو ہاتھ، دماغ اور دل سے کام کرتا ہے۔ فن کار کہلاتا ہے۔

سر سید کا شمار ان میں کے ہر شخص میں بخوبی کیا جا سکتا ہے وہ مزدور بھی تھے، کرافٹس مین بھی اور فن کار بھی۔ ان کی شخصیت جامع صفات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی جیسے باشعور نقاد کو یہ کہنا پڑا:

سید کے کارنامے کو حالی سے پوچھیے

دراصل نئی تہذیب نے، نئے سانچے کی جو راہ نکالی تھی۔ وہ بتدریج جوان سے جوان تر ہو رہی تھی۔ مغربی علوم کے مطالعہ سے ایک نئی بصیرت اور نیا شعور جنم لے رہا تھا۔ اس شعور کی روشنی میں ماضی نئے روش سے ابھر رہا تھا۔ حال کی اہمیت اپنا چہرہ دکھا رہی تھی اور مستقبل کے خاکے کچھ سے کچھ آگاہی دے رہے تھے۔ ہندو مسلمان دونوں کی نگاہیں اپنے شان دار ماضی کی طرف نگراں تھیں اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ برقی مخزن ایک نئے حوصلے کو بیدار کرنے کا خواہاں ہے۔ یہ سنجیدہ، فلسفیانہ اور تاثر انگیز نقطہ نظر تھا۔ اس نظریے کو سر سید نے اپنی تحریکات کے ذریعہ عام کرنا چاہا۔ جس نے نئی پود کو عمیق مطالعہ کی طرف راغب کیا اور پرانی نسل کو یہ سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے جدی کارناموں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھے رہیں۔ بلکہ اپنی قوم اور ملک کو پستی اور ذلت سے نکلنے اور بام عروج پر پہنچنے کا راستہ دکھائیں۔

چوتھی روایت:

سر سید اس رمز سے بھی آگاہ تھے کہ ترقی کی راہ مختلف لوگوں کے ذہن میں مختلف ہوتی ہے مگر اس اختلاف میں وہ امید اور حوصلہ کو، اپنی عقابی نگاہ سے دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ہمارے ناقدوں کو ان کے اس جذبہ خیر نے Father of Modern Thinker کا خطاب دینے پر مجبور کر دیا۔ جس کی وجہ میری دانست میں یہی ہو سکتی ہے کہ سر سید کی تحریروں

میں وسعت خیال اور سادہ نگاری پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ جن کا مقصد دماغوں کو بھٹکانا نہیں بلکہ ان کو نئی روشنی عطا کرنا تھا۔ یاس، رنج، ملال، افسوس، حرمان اور افسردگی کے بجائے ایمان واعتقاد کی منزل بخشتا تھا۔ چنانچہ ان کے ادبی سرمایہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جدید تاریخ، جدید تنقید، جدید مقالہ نگاری اور جدید طرزِ نظم ونثر کی اصلاح کا خزانہ و پیغام ایک طویل سلسلہ تھا، جس کا رشتہ سرسید سے ہی جا کر ملتا ہے۔ ان کی آواز ایسی خوش الحان اور ان کا ذہن ایسا بلیغ اور ان کی فکر ایسی اعلیٰ تھی جو عام انسانوں کے لیے پیغام زندگی بن کر سامنے آئی۔ ان کے رفتار گفتار سے ذہن کو قوت، دلوں کو حوصلہ اور کام کرنے کی صلاحیت کے نقش ونگار ہی نہیں ملے، بلکہ چراغ سے چراغ جلنے اور جُوت سے جُوت پیدا ہونے کی مثال سامنے آئی۔ یہی وہ قوت تھی جس نے فکر وعمل کی تجلیاں پورے قوم کے جذبۂ حِس میں دوڑا دی اور قوم کو سوچنا پڑا:

زیستن در فکر قوم دمردن اندر بند قوم

گرتوانی می تواند ''سید احمد خاں شدن''

سرسید نے زندگی اور خدمت کو اپنے سامنے رکھا۔ اس لیے کہ انسانی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے یا کہتا ہے، اس میں جذبہ کی شدت کا اثر اپنا فن دکھانے کا حوصلہ اور شہرت ووجاہت حاصل کرنے کی تمنا موجود رہتی ہے۔ مگر ان تحریکات سے جو بات نمایاں ہو کر سامنے آئی، اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ زمانہ کے مزاج آشنا اور اس کے رخ کو پھیر دینے بلکہ موڑ دینے کا توانا اور قوی تصور اور جذبہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو قوم وملک کے لیے بروئے کار لانے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے ترقی اور کامرانی کے لیے، جن اشیا کی ضرورت خیال کی، اسے فراہم کرنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا بلکہ پختہ یقین کہ وہ قوم کی ضرورت کو سمجھ کر تبلیغ کریں گے اور قوم ضرورتوں کو سمجھ کر آگے بڑھے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ہر حال میں عوامی مقبولیت اور اثر پزیری کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے وہ ملک کے واسطے مفید ہوں گے اور قوم کے لیے بھی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اپنے خیالات کو متعین انداز میں پیش کیا جائے اور زندگی کو منظم طور سے پیش کرنے کی بات سوچی جائے یعنی مستقبل کے تصور اور امکانات کو خاص طور پر نظر رکھا جائے۔

آخر کلام:

سرسید کے نظریۂ حیات میں قومِ مسلم اور اس کی زبان کی بقا کا تصور ہر لحہ پیش نظر رہا۔ یہی سبب تھا کہ ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء کو غازی پور جیسے کورِ دہ مقام پر بھی اپنے قیام ملازمت کے دَوران سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ جس کا تصور محض یہ تھا کہ انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کے تکنیکی لٹریچر کو اپنی زبان میں منتقل کر کے، سائنسی علوم کی اشاعت کی جائے۔ اس ذیل میں تقریباً ۲۷ یا ۲۸ کتب کے ترجمے کیے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۵ء کے لگ بھگ یعنی ۱۱ سال بعد تقریباً ۲۸ کتب کے ترجمے منظرِ عام پر آ گئے۔ یہی نہیں سرسید نے دیگر امور علمی پر بھی نظر رکھی اور منشی ذکاء اللہ کی بیش تر کتب کو سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ منظر عام پر لا کر ایک مثال قائم کر دی اور جب سرسید علی گڑھ تشریف لے آئے تو سوسائٹی ان کے ساتھ آ گئی، مگر یہ بھی سچ ہے کہ سرسید کو بھی اس امر کا احساس ستا رہا تھا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کے حصول کے واسطے صرف ترجمہ کی ہوئی کتب کافی نہ ہوں گی۔ لہٰذا وضاحتی، لیباریٹری اور میوزیم وغیرہ کے طرز پر بھی غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی زبان اُردو کی ترقی، تعلیم اور اس کی بہبود کے پیش نظر سرسید کی تعلیمی کانفرنس نے ہی ''انجمن ترقی اردو'' کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس کی بنیاد جنوری ۱۹۰۳ء کو رکھی گئی تھی۔ پھر تو کارواں آگے بڑھتا گیا اور فروغ اردو کے لیے کتابوں کی اشاعت ہوتی رہی۔ قواعد، لغت، اصطلاحات، کلاسیکی ادب، سائنسی اصطلاحات کو انگریزی، اردو فرہنگ کے روپ میں پیش کر کے زبان اردو کی ترویج و ترقی کا سامان کیا گیا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ سرسید کے ذہن نے ہی یہ کام انجام کو پہنچائے۔

اب غور طلب امر ہے کہ سرسید کا فلسفیانہ نظریہ تھا یا حقیقت آبی؟ مگر حق یہ کہ ماضی، حال اور مستقبل کے زندہ احساس اور قدیم اور جدید نظریات کو سمجھنے کے جو اعلیٰ معیار سرسید نے قائم کیے ان کی تکذیب ممکن نہیں ہے اور اب بھی ان کی اس علمی بستی میں جب کسی نے اس اصول سے انحراف کرنا چاہا، وہیں ہیجان اور پیچیدگی نے اپنا سر اٹھایا اس کا سبب شاید یہ تھا کہ ان کا ایمان کامل تھا کہ قومی ترقی اور اسلامی فلاح، میں ہی ملک کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ زبان اصل ہے۔ ان کی مجتہدانہ شان نے جو درس دیئے ان سے ہم کو سبق لینا چاہیے اور اس کی اہمیت کا اقبال واقرار دل سے کرنا واجب ہے۔ چنانچہ بانئ درس گاہ سرسید نے ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو جو بات فرمائی تھی وہ حق تھی اور بالکل درست:

”......یہ کالج ایک یونیورسٹی کی شکل میں پروان چڑھے گا۔ جس کے طالب علم ملک کے طول و عرض میں پھیل جائیں گے اور آزادانہ تحقیق، وسیع القلبی، رواداری اور سچے اخلاق کی تعلیمات پھیلائیں گے“۔

اب اگر ہم ان کے سچے جانشین اور وارث ہیں تو ہمارا فرض پکار رہا ہے کہ اپنے مورث کے کہنے کی لاج رکھیں اور اس تعلیمی نگری کو مثالی بستی بنائیں اور اپنے مورث کی وفات کی ہر برسی پر (بلکہ ہر روز) نہ صرف نذرانہ عقیدت پیش کریں، بلکہ یہ اعلان حق بھی کریں کہ ہم نے آپ کی وراثت کو حرزِ جان بنایا اور محض یونیورسٹی کا چارٹر حاصل نہیں کیا بلکہ ایشیا اور یورپ کی درس گاہوں میں بھی اسے امتیازی شان بھی عطا کرنے کی سبیل پیدا کی ہے۔ اور آپ نے جو شمع مشترکہ زندگی گزارنے کی روشن کی تھی، ہم نے اسے صرف جلائے نہیں رکھا، بلکہ اسے تابانی بھی دی ہے اور اس کی روشنی کو تیز تر کر دیا ہے، یہاں تک کہ سرسید کی روح درد دہلوی کی آواز میں بہ شوق یہ صدا لگائے کہ تم سب سید احمد خاں ہو گئے۔

دیکھے جس کو یاں، اُسے اور ہی کچھ دماغ ہے
کرمک شب بھی گوہرِ شب چراغ ہے

☆☆☆

عکسی زیارت

حکیم سید بندہ رضا بلگرامی رضوی ساکن محلّہ ملکنٹھ اپنی تحریر میں لکھتے ہیں۔ سید کمال الدین سادات رضوی بلگرامی کے مورث اعلیٰ نے امیر ناصر الدین سبکتگین کی خدمت میں تقرب پایا تھا اور اعلیٰ عہدے پر سرفراز تھے، جب محمود غزنوی بادشاہ ہوا تو سید کمال الدین اس کے عہد میں بھی عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور تھے، اور انہیں کی تحریک سے محمود نے ''عزم الہند'' کیا۔ جب نوین حملے میں قنوج فتح ہوا تو کمال الدین ہمراہ تھے، باجازت بادشاہ ہندوستان کی بود و باش اختیار کر کے قنوج میں رہے، آخر اپنے قبائل کو بھی بلوالیا۔ اور کچھ فوج لے کر ''سری نگر'' کو فتح کیا، اس وقت سے رضویوں کی بود و باش ''بلگرام'' میں ہے۔ اور اسی وقت قاضی شیخ محمدؒ یوسف عثمانی بھی بلگرام آ کر رہے، رعایائے شہر نے شکایت کی کہ یہاں قریب تر جنگل کلک اور نرکل کا ہے۔ وہاں ''دیو'' رہتا ہے جو عام لوگوں کو ستاتا ہے۔ یہ سن کر دونوں بزرگواروں نے یعنی سید کمال الدین اور قاضی یوسف نے جا کر اس ''دیو'' کو قتل کیا اور یہ معرکہ چار دن تک رہا۔ آخر فتح ہوئی۔ اسی وقت سید صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ اس قصبہ کا نام بجائے ''سری نگر'' ''بیل گرام یعنی بیل کا مقام ہوتا تو کیسا خوب تھا۔ اور یہ تاریخ موزوں فرمائی۔''

نہہَ و چار صد سال ہجرت تمام
سری نگر را نام شد ''بیلگرام''

اسی طرح شیخ الہ یار عثمانی بلگرامی اپنی کتاب ''حدیقۃ الاقالیم'' میں لکھتے ہیں کہ بلگرام کا نام زمانۂ پیشین میں ''سری نگر'' تھا اور علاّمہ آزاد بلگرامی بھی اپنے رسالوں میں یہی لکھتے ہیں کہ ''یہاں کے راجہ کا نام سری تھا'' اسی سبب سے یہ مقام اس کے نام سے منسوب تھا...... '' چنانچہ گرد و نواح میں اب تک لوگ بلگرام کو نگر پکارتے ہیں:

رسالہ عمادیہ میں جو حال خواجہ عماد الدین صاحب ولایت بلگرامی کا ہے اور اہل بلگرام مخصوص اہل سنت و الجماعت میں مستند و مشہور ہے۔ یوں لکھا ہے کہ ''جب خُواجہ عماد الدین اپنے وطن سے ''کوفہ'' پہنچے وہاں چند روز انہیں نے درس دیا۔ ایک دن اپنے حُجرہ

میں مشغول عبادت الٰہی تھے کہ ''غیبی آواز'' سنی۔
''اے عماد الدین متصل قنوج کے ایک قصبہ 'نگر نام' ہے وہاں ایک دیو رہتا ہے اور لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے۔ تم وہاں جاؤ کہ وہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے گا۔''
یہی آواز تین بار آئی اور شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بشارت دی کہ ''جا کر دیو کو ہلاک کرو وہ ولایت تم کو مرحمت ہوئی۔''
غرض اس تفصیل سے یہ ہے کہ سرِّی نگر یا بیل گرام عرصہ قدیم سے مرجع خلایق رہا ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کے خطوط بھی بلگرام کی عظمت کے قائل ہیں۔ اسی سرزمین سے علامہ عبدالجلیل بلگرامی اور غلام علی آزاد بلگرامی جیسی پاک ہستیاں ظہور میں آئیں۔ پھر اسی خِطہ سے ٹھیک ۸۰۰ سال بعد ایک اور ہستی عالم وگل، سے پیدا ہوئی جس کا اسم گرامی و نام نامی غالب جیسا رند مشرب بھی عزت واحترام سے لیتا تھا۔ اور زمانہ اب تک ''حضرت صاحب'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ عجب اتفاق کہ نانا اور نواسے کا غالب سے ایک سا رشتہ رہا۔ جو زندگی کے آخری حدوں تک باقی رہا۔ خود غالب اپنے دور کے ماہر فن تھے اور اس ''فن'' نے کمال کو پہنچنے میں جس صلاحیتوں کو دخل دیا اس کے متعلق اتنا اور کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے اس فنِ کمال نے انہیں ''یکتا'' بنا دیا۔ یکتائی کوئی جاگیر نہیں، لیکن قدرت جسے نوازے، چنانچہ یہی یکتائے زمانہ غالب اپنے ایک خط میں چودھری عبدالغفور مارہروی کو حضرت سید صاحب عالمؒ سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔
''تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نساب، جامع مدارج جمع الجمع بزم وحدت کی فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدۂ ذات، حضرت صاحب عالم، صاحب قدسی صفات کی طرف ہے.....''
ایک اور خط میں رقم طراز ہیں:
''.....چودھری صاحب آؤ! ہم تم حضرت صاحب کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کفِ پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا تم معروف ہونا کہ غالب یہی ہے۔ اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔.....''
ایک بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت صاحب اور غالب کی عمر میں محض ایک سال کا فرق تھا (لفظ تاریخ میں حضرت صاحب اور تاریخا میں غالب کی سنہ ولادت مضمر ہے) اور ایک سال کا فرق مراتب کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کم از کم غالب کی زندگی میں

ایک سال کے فرق کو کوئی امتیازی درجہ نہ ملنا چاہئے تھا، جب کہ وہ اپنے بڑوں اور اچھی صلاحیت والوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے .... لیکن غالب نے پوری زندگی حضرت صاحب عالم صاحب کو پیرومرشد اور حضرت صاحب کے لقب سے خطاب کیا۔ غالب کے اس کردار کا اگر یہ تجزیہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کو حضرت صاحب سے ایک عقیدت مند کی طرح عقیدت تھی، ایک ساتھی اور ہم عمر کی حیثیت سے انہوں نے کبھی بھی نہ جانا .... جب ہم اس کردار کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو اور بھی نیا پن سا محسوس ہوتا ہے، کہ کہاں ایک خراباتی اور کہاں ایک صوفی عز وشاں، کہاں مے کدے کا نگہباں اور کہاں ایک درکعبہ کا مجاور .... لیکن انقلاب غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ مواصلت اور موافقت شاید اس طرح بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح حضرت صاحبؒ کے نواسے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی سے بھی حضرت غالب کو ایک خاص طرح کی عقیدت تھی، چنانچہ غالب ایک عنایت نامے میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

۱۲/ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ

نورنظر، لخت جگر، زندۂ اولاد پیغمبر مولوی سید فرزند احمد مجدہ' اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستان خیال کے ترجمہ کا عزم اور دو جلدوں کا مطبع روانہ ہو جانا مبارک، حضرت، یہ آپ کا احسان عظیم ہے، مجھ پر خصوصاً اور بالغ نظران ہند پر عموماً''۔

صفیر بلگرامی کے متعلق ایک غیر ملکی مستشرق ڈاکٹر بیلی پروفیسر لندن یونیوٹی اپنی تصنیف ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' مطبوعہ میں لکھتے ہیں:

''......... زندگی کا زیادہ حصہ آرہ میں گذرا، نظم میں ان کا کلام بہت کچھ ہے۔ بالخصوص غزلیات۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں ...... ایک اہم ترین تالیف ''جلوۂ خضر'' ہے یہ ادب اردو کی تاریخ ہے ....''

خواجہ عشرت لکھنوی ''تذکرۂ آبِ بقا'' میں لکھتے ہیں:

''......... سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے، میر صاحب نے ابتدائی سن سے اردو زبان کی خدمت کی اور بہت سی کتابیں تصنیف کر کے خود چھپوائیں، اور پورب میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا

کیا...... صفیر بہت پُر گو تھے پیام یار میں ان کی غزلیں برابر چھپتی رہیں...... اب کوئی صفیر جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جس کے دم سے شاعری کا چرچا رہے......"

ان حالات کے بعد خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"ایسا شخص جس کی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی۔ اس کا اکثر کلام غیر مطبوع پڑا رہے، نہایت افسوس کی بات ہے......"۔

صفیر بلگرامی کی خدمت اُدب وزبان کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی عظمت کا قائل اور ان کی محنت کا ممنون ہونا پڑے گا۔ پھر بھی نہ تو موصوف کے حالاتِ زندگی پر سیر حاصل معلومات فراہم کی گئی اور نہ ہی اس کی کاوش کی گئی کہ جلوہ خضر کے مصنف کی دیگر تصانیف و کارناموں کی تلاش کی جائے اور ان کو منظر عام پر لایا جائے۔ بہر حال میں ایک طویل فہرست تصنیفاتِ صفیر بلگرامی، جو شیخ محمد اسمٰعیل مہر آروی کے "فسانۂ غمناک" ملقب بہ فریادِ مہر دراحوال صفیر بلگرامی سے حاصل کی گئی ہے (صفیر بلگرامی نے ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ کو ۱۲ بجے دن میں ۵۷ سال ۹ ماہ اور ۲۰ روز حیات رہ کر قضا کیا۔)

تصنیفات صفیر:

صفیر بلبل، مطبوعہ ۱۲۸۰ھ ۲۔ خمخانہ، مطبوعہ ۱۲۹۶ھ ۳- دیوان صفیر، ۴ جلد (بعد طبع صفیر بلبل وخمخانہ ترتیب دادہ شد) ۴- دیوانِ صفیر (در بحر مثمن سالم) ۵- دیوانِ صفیر، ۳ جلد (فارسی) ۶- تذکرۂ جلوۂ خضر، جلد اول (شعراء دہلی) ۷- تذکرۂ جلوۂ خضر، جلد دوم (شعراء لکھنؤ) ۸- چشمۂ کوثر، تذکرۂ مرثیہ گویان ۹- مثنوی در جواب گلزار نسیم ۱۰- مثنوی در معرفت ۱۱- مثنوی خوان لغیما (فارسی) ۱۲- مثنوی دعوتِ احباب ۱۳- دیگر مثنویات (اردو) ۱۴- دیگر مثنویات (فارسی) ۱۵- رشحات صفیر ۱۶- جغرافیہ بلگرام ۱۷- تاریخ بلگرام ۴ جلد ۱۸- رسالہ عروض ۱۹- رسالہ فن طبابت ۲۰- رسالہ محاورات ۲۱- مجموعہ رباعیات ۲۲- خمسہ جات ۲۳- مراثی، سلام، قطعات ۲۴- قصائد (فارسی) ۲۵- قصیدہ زمزمہ (جو بلی قیصر ہند) ۲۶- واسوخت ۲۷- ترجمہ بوستانِ خیال ۱۸ جلد ۲۸- محشرستانِ خیال ۳ جلد ۲۹- قصہ ہائے دیگر ۳۰- جوہر مقالات (ناول بطرز مراۃ العروس) ۳۱- جواب نصاریٰ ۳۲- ابعاد ثلاثہ ۳۳- آئینہ فیصل ۳۴- بیاض اشعار ۳۵- گلستانِ مسرت ۳۶- گلدستۂ اولین ۳۷- ناظرۂ

زلف ورخ ۳۸- تحقیق اللسان در تحقیق زبان اردو ۳۹- خاتم ۴۰- حمایل ۴۱- نادعلی ۴۲- حسین بند ۴۳- ہیکل ۴۴- تجربات ۴۵- مطلع الانوار در میلاد ۴۶- مرغوب القلوب (در حال انبیاء وائمہ) ۴۷- صراط المستقیم ۴۸- قیامت نامہ ۴۹- شبستانِ معراج ۵۰- معراج العقول در عظمت آلِ رسول ۵۱- ترجمہ تفسیر در منہج الصدقین ۵۲- جوجرش وحشت ۵۳- شور محشر ۵۴- وغدغہ موت ۵۵- بحرِ ذخّار ۵۶- راحت طفلی ۵۷- فالنامہ موسوم بہ سرّ غیب ۵۸- جام کوثر ۵۹- پہیلی ۶۰- چیستاں ۶۱- متفرقات۔

ان ساٹھ تصنیفات وتالیفات کے علاوہ اور کیا ہے؟ اس کی تلاش ہونی چاہئے۔ وہ خطوط جو صفیر بلگرامی نے لوگوں کو لکھے ہوں گے ان کی تلاش کو بھی مدّ نظر رکھنا ضروری ہے، کیوں کہ صفیر بلگرامی کے وہ خطوط اپنی جگہ ایک تصنیف وتالیف ہی ہیں۔ میرے پاس ''بیاض صفیر'' میں صفیر بلگرامی کے دست قلم کے کئی خطوط کی نقلیں موجود ہیں جن میں داغ دہلوی اور سر سید احمد خاں بالقابہ کے نام بھی خطوط ہیں،......... تعداد تصنیفات صفیر بلگرامی کے ملاحظہ کے بعد تعداد شاگردان صفیر بلگرامی اگر معلوم کرنی ہو تو مرزا غلام حیدر مجروح عظیم آبادی کے قطعہ کے چند بند ملاحظہ ہوں:

میر فرزند احمد آنکہ صفیر	ہست مشہور عالم ایجاد
نامور در جہاں تلامذہ اش	بہرہ دَر صاحبان اِستعداد
فیضیاب اَز صفیر با تمکین	سخن، احمد، امیر، سلطان، شاد
صاف و عنقا، ہما، امیر، اخلاص	ہم شمیم وکلیم طور ارشاد
سخن، اِکرام قیصر و جاوید	ہم سلیم و وزیر، صاحب داد
آن صفیر و مطیر تمکین، شور	آں عنایت، کبیر، ہم فریاد
قاصر و باقر و ثریا، مہر	دانش و ہم ذکی، عالی زاد
مخلص و شورش، اکبر و اصغر	ہاشم و محسن خجستہ نہاد
حسن، اکھڑ، حقیر، درد، ظہیر	ہم گرامی، ضیائے، مہر شداد
احسن و جوش حیرت و فیاض	ہم طبیب و متین، نیک نہاد
جاہ، یحییٰ، غلام، لائق نیز	اَصدی و حکیم و ہم ایجاد
آن نہال و جمیل و محزوں نیز	باز، مداح، لائق ارشاد

ان تصنیفات اور تلامذہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ صفیر بلگرامی کے متعلق سخن

شناس ایسا رجحان کیوں رکھتے تھے۔

اس کے بعد میں ایک نہایت اہم نفسِ مضمون پر آتا ہوں، وہ یہ کہ صفیر بلگرامی کی اب تک دو تصویریں ملتی ہیں۔ ایک وہ جسے سید وصی احمد صاحب فانی بلگرامی نے ''س ش ص'' والے بسیط مضمون کے ساتھ ۱۹۳۵ھ میں شائع کی تھی۔ دوسری تصویر وہ ہے جو ''یادگار ضیغم'' سے آرزو صاحب نے حاصل کی اور اب ''احوال غالب'' کی زینت ہے، لیکن آج کواتھ ضلع آرہ میں صفیر بلگرامی کی دو تصویریں اور بھی ہیں جن میں سے ایک تصویر جو دراصل گروپ ہے نہایت اہم ہے۔ اس گروپ تصویر کی شان یہ ہے کہ ایک جانب صفیر بلگرامی، دوسری جانب ان کے پسر اولین (آپ ہی کی ولادت کے موقع پر چودھری عبدالغفور سرور مارہروی نے رباعی وقطعات نظم کر کے حضرت غالب کو بغرض اصلاح روانہ کی تھیں اور غالب نے اپنے جیب خاص سے سرور کو ایک اردو قطعہ عطا فرمایا تھا۔ اور اس سلسلے میں صفیر بلگرامی کا پتہ دریافت کیا تھا، تاکہ تہنیت میں خط لکھ سکیں، لیکن اس زمانے کی خط و کتابت کو قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر جیسا محقق غالب ''جعلی'' گردانتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ خدا بہتر جانتا ہے، لیکن امید کہ ماہ فروری ۱۹۵۵ء کا آج کل قاضی صاحب کے مطالعہ سے گزرا ہوگا اور ان ''جعلی'' خطوط کی تصدیق ہوگئی ہوگی) دوسری تصویر میں سید نور احمد گرامی بلگرامی ہیں اور صفیر وگرامی کے درمیان ''محمد غنی حیدر'' کی تصویر ہے (افسوس کہ تصویر صاف نہیں اس لئے شائع نہیں کی گئی (ادارہ، آج کل دلّی)۔ اس تصویر کے سامنے آتے ہی صفیر بلگرامی کا یہ قطعہ تصوّر کے پردے میں آجاتا ہے جس کا مطلع ہے۔

فرمائیے کس شخص کی قسمت ہوئی بیدار

جاگے ہوئے کس جا سے حضور آئے ہوئے ہیں

یہ قطعہ یا یہ تصویر محض تصویر نہیں۔ ایک واقعہ ایک طویل کہانی، افسانہ اور ناول ہے۔ فی الوقت بات اس حد تک کافی ہے کہ جو لوگ ''ستارۂ ہند پریس کلکتہ'' سے واقف ہیں وہ ''محمد غنی'' کی شخصیت سے بھی کسی حد تک واقف ہوں گے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا یہ واقعہ ہے اور افسانہ، لیکن اس قصہ خوانی کا یہ موقع نہیں! (وقت اور فرصت درکار ہے) اس تصویر کے علاوہ ایک اور تصویر ہے، جس میں صفیر بلگرامی سر پر عمامہ لپیٹے بَر میں کرتہ واچکن ڈالے، گلے میں پر پیچ پڑا ہوا ہاتھ میں چھڑی لئے ایک کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔ لیکن اس تصویر کے علاوہ ایک شبیہہ ان کی ہے جن کی زیارت کے لئے حضرت غالب تمام عمر بے چین و مضطرب رہے۔

جن کی تحریر کو اپنی آنکھوں سے لگانا اور سر پر جگہ دینا غالب جیسی ہستی کے لئے فخر و مباہات کا کام تھا۔ بہر حال میرے علم میں اب تک حضرت صاحب کی کوئی تصویر منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ میرے لئے یہ امر کچھ کم باعث فخر نہیں کہ حضرت صاحب ہمارے نانا صفیر بلگرامی کے نانا تھے اور حضرت صاحب کو ہمارے نانا دل و جان سے عزیز تھے (ملاحظہ ہو خطوط غالب و صاحب عالم صاحب) یہ شبیہہ مبارک بھی اب تک میرے ''نگار خانہ'' میں محفوظ تھی، لیکن اب میں شائقین آج کل کو آج کل کے ذریعے سے اس ہستی کی ''عکسی زیارت'' کراتا ہوں جو صوفی باصفا اور ایک مردِ مومن ذات تھی، جس کی شان ہے سر پر شملہ باندھے، عبا زیب تن کئے، ہزارا تسبیح ہاتھ میں لئے ایک صوفیانہ شان سے نورِ مجسم کی طرح متمکن ہیں۔ آپ ہی کو لوگ صاحب عالم متخلص بہ صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کہتے ہیں۔

ہمارے پاس ایک تصویر سید برکات حسن صاحب مارہروی کی بھی ہے۔ آپ کا ذکر بھی غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ بہر حال اب محوی کے اس شعر پر رخصت چاہتا ہوں۔

جو وہ اُٹھ گئے اُٹھ گئی ان کے ساتھ
بہارِ زبان عزّ و شانِ سخن

ان تصاویر سے حضرت صاحب عالم مارہروی اور صفیر بلگرامی کی جامع شخصیات سے جہاں آگاہی ہوتی ہے۔ وہیں اس دور کے لوازم اور لباس شناسی کا علم بھی ہوتا ہے۔ صفیر بلگرامی کی تصویر مدارج جاذب نظر اور مہذب ہے، اور بقول مالک رام و پروفیسر مختار الدین آرزو۔ غالب دہلوی کا ٹھسہ ان کی تصویر میں نمایاں ہے۔ اس بات پر میں نے عرض کیا تھا۔ دراصل خاندان بلگرام کے زعماء کا یہی لباس تھا۔ علامہ عبدالجلیل بلگرامی، علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی، حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب ''پیمی و عشقی بلگرامی ثم مارہروی ہوں یا حضرت سید صاحب عالم، صاحب تخلص۔ سب کے لباس کی وضع ایسی ہی ہے۔ ظاہر ہے اس دور میں ایسا ہی لباس باعث فخر خیال جاتا تھا۔ جس سے کسی فرد کی شخصیت اور جاہ و جلال نمایاں ہوتا تھا۔ افسوس کہ سید برکات حسن صاحب کی تصویر دھندلی ہونے کے سبب منظر عام کے قابل نہیں۔ بہر حال ان تصاویر سے ان بزرگوں کی شخصیت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

رشحات صفیر کے نسخے

(۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۴ء)

۱۲۷۰ ہجری

(۱)

تاریخ از صفیر بلگرامی درسنہ فصلی

این نسخہ کہ کامل العیار است
صد گونہ درین چمن بہار است
گفتیم صفیر سال آغاز
''نقشے بزمانہ یادگار است''

تاریخ از سید اولاد علی مخلص بلگرامی در ہجری

مخلص ایں نسخہ بے عدیل است و نظیر
راہ تحقیق ہر صغیر است و کبیر
اوستاد من چو یافت توفیق زحق
نام تاریخی اش بشد ''فیض صفیر''
''نقشے بزمانہ یادگار است'' ۱۲۷۰ھ

رسالہ تانیث وتذکیر کا نام سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے :سید الاسناد: رکھا تھا۔ (ص ۵ مطبوعہ ۱۳۰۱ھ رشحات صفیر) لیکن ان کے شاگرد سید اولاد علی بلگرامی مخلص نے جب: فیض صفیر: تاریخی نام نکالا تو فیض ہی مقبول ومشہور ہوا۔ جس کا ۱۲۷۰ھ سال آغاز ہے۔ اس وقت صفیر بلگرامی کی عمر بائیس سال کے قریب تھی۔ صفیر بلگرامی کی تاریخ پیدائش: شمس الضحیٰ: اورتاریخ وفات: شہر رمضان المبارک: کے اعداد جمع کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے۔

رسالہ کی تالیف کا کام جاری تھا کہ صفیر بلگرامی نے الفاظ جمع کر کے بغیر اسناد ایک رسالہ مرتب کیا اور ''خلاصہ فیض صفیر'' نام سے مطبع چشمہ علم، پٹنہ میں چھپوایا۔

محنت ہوئی مجھ کو مدتوں تک کیا کیا
دیکھے دیوان اساتذہ کے صدہا
کس کس مشکل سے کی یہ تالیف صفیر
''نقشے بزمانہ یادگار است ازما'' ۱۸۶۱ء

نقشے بزمانہ یادگار است (تاریخ آغاز) ۱۲۵۲

ازما ۴۹

کس کس مشکل +۵۵۰ ۱۸۶۱ء

سنہ فصلی ۱۲۶۲ تاریخ آغاز میں ازما (۴۸) جوڑ کر (۱۳۱۱) حاصل ہوا۔ لیکن ۱۳۱۱ تاریخ فصلی کے لیے ناکارہ ثابت ہوا۔ صرف تاریخ عیسوی ہاتھ آسکی۔ وہ بھی کس کس مشکل سے! یعنی (۵۵۰) جوڑنے سے ۱۸۶۱ء تاریخ ہوئی۔

واضح ہو کہ ۱۸۶۱ء مطابق جمادی الآخر ۱۱۷۷ھ تاریخ الاول ۱۲۷۸ھ ہوا۔ اس لیے خلاصہ فیض صفیر کا سال طبع ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء ہے۔

۱۲۸۰-۱۲۸۳ ہجری

اصل رسالہ فیض صفیر کا مسودہ صفیر بلگرامی کے ساتھ تھا اور جب حضرت غالب کی ملازمت کے لیے ۱۲۸۰ھ میں وہ دہلی گئے تو وہاں یہ رسالہ اہل علم اور قدر دانان فن کی نگاہوں سے گذرا، اور بعد ملاحظہ حضرت غالب نے اس پر تقریظ لکھی۔ یہ تقریظ: عود ہندی: میں موجود ہے۔

آغاز تقریظ: سید سندی نور بصر لخت جگر قرۃ العین اسد مولوی سید فرزند احمد خاتمہ تقریظ: مادح خورشید مداح خود است:

کہ مراد و چشم سرنا مرمداحت (نا مرمد = غیر رمد: رمد = آشوب چشم)

داد کا مطلب

غالب

دہلی سے واپسی میں صفیر بلگرامی کانپور سے گذرے اور وہاں عبدالرحمن خاں مالک مطبع نظامی کی نظر اس رسالہ پر پڑی تو ان کا اصرار ہوا کہ رسالہ اس مطبع کو دیا جائے۔ صفیر بلگرامی نے بعد ترتیب و نظر ثانی بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اس وعدہ کی تفصیل ملاحظہ ہو:

''پورب میں تانیث و تذکیر الفاظ کا جھگڑا ہمیشہ ہوا کرتا تھا، جی میں آیا کہ ایک رسالہ ترتیب دیا جائے کہ لوگوں کے کام آئے۔ پندرہ برس کے زمانے میں اساتذہ کے

دیوان کی لفظاً لفظاً سیر کی گئی اور اس کا مادہ جمع کیا گیا، ہر چند اہتمام ہوا کہ شعرائے دہلی وفصحائے لکھنؤ کے کلام مطبوعہ اور مشہور کے سوا اور کسی مقام کے شاعر کا ایک مصرع بھی مثال میں نہ دیا جائے مگر پھر بھی ترتیب کے پہلے اوستادنا حضرت غالب علیہ رحمہ کے ملاحظہ کو دہلی لے گیا، حضرت نے بچشم عنایت دیکھ کر کچھ بنایا اور بہت کچھ زبانی فرمایا، جو ترتیب کے وقت داخل کتاب ہوا، اور اب تک محفوظ حافظہ ہے۔ پھر دہلی سے کانپور آیا۔ عبدالرحمٰن خان صاحب کی نظر اس رسالے پر پڑی، لوٹ ہو گئے، اور چھاپنے پر مستعد ہوئے۔ میں نے بعد ترتیب بھیجنے کا وعدہ کیا اور آرہ آ کر سال بھر میں مرتب کیا، اتنے زمانے میں خان صاحب موصوف کے سوقطعہ خطوط سے کم نہ آئے ہوں گے۔ مگر تقدیر کو ایسی مفید انام کو جھلے میں ڈالنا تھا۔ منشی سنت پرشاد صاحب کا مطبع آرہ میں قائم ہوا۔ ہر چند انہوں نے پہلے مجھ سے اس کتاب کو طلب کیا تھا مگر میں نے خان صاحب کے خیال سے انکار کیا۔ آخر بعض بزرگ اور اعزہ کی استبداد سے ناچار ہوا۔ اگرچہ خان صاحب کا تقاضہ کمال اور دو جلدیں حق تالیف کی، دینے کا وعدہ مستزاد ہوا۔ لیکن اس متاعِ گران بہا کی کچھ دنوں کساد بازاری لکھی ہوئی تھی:

تقدیر سر پھراتی ہے گردش نصیب کا

ہمارے لوگوں نے نہ مانا اور وہ کتاب نایاب مطبع میں داخل کر دی۔ وہی اصل، وہی نقل، وہی نمونہ، وہی پونجی تھی۔ میں بھی آرہ مقیم تھا۔ کچھ اس کا خیال نہ ہوا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ غرض وہ کتاب چھپنی شروع ہوئی سترہ سو جلدیں بار اول لگائی گئیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی پانچ برس میں پانچ جزو چھپے۔ اون میں بھی بعض فرمان (فرمے) کی پشت غایب اور بعض کا رُو۔

واقعہ یہ ہے کہ آرہ پہنچ کر یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ اور چاند گہن میں آ گیا، لوگوں نے صفیر بلگرامی کو مجبور کیا کہ کتاب مطبع منشی سنت پرشاد آرہ کو دی جائے۔ چنانچہ کتاب دے دی گئی۔

مطبع سنت پرشاد آرہ نے پانچ برس میں پانچ جزو چھاپے اور وہ بھی ابتر یعنی کسی ورق کا پشت چھپا ہے تو رو غائب، اور رو چھپا ہے تو پشت غائب۔ یہ کتاب اسی مصیبت میں تھی کہ صفیر بلگرامی مظفر پور گئے اور دو تین سال کے بعد آرہ واپس آئے تو مطبع ٹوٹ چکا اور کتاب ناپید ہو چکی تھی۔

رسالہ تانیث وتذکیر مطبع سنت پرشاد آرہ میں جب دیا گیا تھا، اس زمانہ کی یادگار یہ تاریخیں اور تقریظیں ملاحظہ ہوں:

(۱)

چو آلِ محمد شدہ نکتہ سنج
بتاریخ ایں نسخہ دل پذیر
بریدہ سر کلک کردہ رقم
"ز تالیف فرزند احمد صفیر" ۱۳۰۲

سر کلک ۲۰ ۱۲۸۲ھ

(۲) تاریخ از سید محمد سبحان حیدر نذیر عظیم آبادی:

دریں نسخہ باشد سندہا، زاسناد
چہ غالب چہ مومن چہ ناسخ چہ آتش
نذیر ایں زماں بہر تاریخ طبعش
بگو سال "بہ نسخہ عقل و دانش" ۱۲۸۳ھ

یہ تاریخ طبع ہے۔ مصرع اول میں سند ہازِ اسناد خود صفیر بلگرامی کا رکھا ہوا نام سند الاسناد ہے۔

(۳) تقریظ از حضرت غالب دہلوی مطبوعہ عود ہندی

(۴) تقریظ از حضرت سید صاحب عالم صاحب مارہروی

یہ رسالہ شیریں مقالہ موسومہ فیض صفیر مبین وموضع فرق تانیث وتذکیر زبان اردوئی پذیر دل ہر صغیر وکبیر کا بسعی وافر وکوشش متکاثر برخوردار، قرۃ العیون والابصار، بشعر وسخن مستند، سید فرزند احمد متخلص بصفیر، ابقاء اللہ القوی القدیر، کی ترتیب وتالیف پایا اور انظار ارباب فن و قدر شناسان سخن میں پسندیدہ دکھلایا، مبتدی و منتھی سب مایل و طالب، اور واسطے طبع اس رسالہ مطبوع کے شایق وراغب ہوئے۔ ملک الشعرائی ہندوستانی، استاد ہمہ دان دقایق فارسی و ہندی زبان، نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب، غالب تخلص نے تقریظ اوس پر قلمی فرمائی، قدر ومنزلت مولف وتالیف بڑھائی، بعد تحریر خدمت موصوف کے حاجت وضرورت دوسری تحریر کی، کب ہے کہ خوبی وحسن تقریظ جو کچھ چاہیے اس میں سب ہے۔

مگر بحسب خواہش وبر طبق فرمایش برخوردار، مقبول زمن برکات حسن کہ ہم سن وہم سال برخوردار صفیر وسخن فہم ونکتہ شناس، بے نظیر ہیں، راقم الحروف بندہ صاحب عالم حسینی واسطی بلگرامی ثم مؤلف نور بصر لخت جگہ میرا ہے توصیف مؤلف وتالیف میں تطویل واطناب سے قطع

نظر کر کے بطریق ایجاز دو شعر فارسی ارشاد اساتذہ، اور ایک تاریخ طبع زاد اپنی پر اکتفا کی جاتی ہے اور سلسلہ سخن کو انتہا دی جاتی ہے، شعر اول ثنائیہ ہے، نظر بر فصاحت الفاظ و بلاغت معنی رسالہ رنگین تر از برگ لالہ:

لفظ خوش و معنی طاہر درو
آب زلال است و جواہر درو

شعر ثانی دعائیہ ہے۔ بامید قبول نامہ عنبریں شمار:

ایں نامہ سزائی آفریں باد
انشاء اللہ ایں چنیں باد

اور تاریخ یہ ہے:

کرد تحریر چہ خوش نامہ صفیر
قابل مدح و ثنا حرف بحرف
زد رقم خامہ صاحب تاریخ
نامہ بس تحفہ و زیبا و شگرف ۱۲۸۳ھ

شاگرداں صفیر بلگرامی اور حضرت صاحب عالم، صاحب مارہروی کی تاریخ اور تحریر سے ''فیض صفیر'' یا ''سند الاسناد'' کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ خود صفیر نے جس قدر محنت، دقت اور وقت صرف کر کے اس کام کی تکمیل کی تھی، اس کا علم بھی ہو جاتا ہے، لیکن افسوس کہ نسخہ اول جو حضرت غالب کے صلاح و مشورہ کے بعد تالیف ہوا تھا، زمانہ کی بد احتیاطی کی نذر ہو گیا، یا مالک مطبع نے جان بوجھ کر اسے تلف کر دیا، بہر حال یہ ایک قومی اور ادبی نقصان تھا۔ جس پر ملال ہی ملال کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۸۵ ہجری:

مطبع سنت پرشاد آرہ نے رسالہ فیض صفیر کا قلمی نسخہ غائب کر دیا تو صفیر بلگرامی نے از سرِ نو اس کی تالیف و ترتیب شروع کی، یہ ترتیب تو جاری تھی کہ ڈاکٹر فلین اور ڈپٹی سورج مل کی فرمائش سے صفیر بلگرامی نے اسکولوں کے لیے ایک انتخاب مرتب کیا جس کو ''تسہیل تانیث و تذکیر'' کے نام سے مطبع چشمہ علم نارمل اسکول میں چھپوایا۔ اس طرح مطبع چشمہ علم پٹنہ سے صفیر بلگرامی کی دو تصانیف شائع ہوئیں۔

اول : خلاصہ صفیر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء

دوم : تسہیل تانیث وتذکیر ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء

ان دونوں رسالوں کے مطالعہ سے اس بات کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ غیر مستشرقین بھی اردو زبان وادب کے مروجہ ڈھانچے کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں ممد ومعاون تھے اور اس اہمیت سے واقف تھے کہ اگر اسکولوں اور کالجوں کے نصابوں میں قواعد وعروض اور مسائل زبان و بیان کی اہمیت کو داخل نہ کیا گیا تو ہر عالم مبتدی رہے گا اور ہر کامل، ناقص رہے گا، چنانچہ ڈاکٹر فیلن جیسے بابصیرت کی نظر، اس اہم موضوع کے لیے حضرت صفیر بلگرامی کی طرف اٹھی، جسے صفیر بلگرامی نے بڑی محنت شاقہ کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

۱۲۹۳ ہجری:

رسالہ فیض صفیر کے گم ہوجانے کے بعد جو نیا رسالہ ترتیب دیا گیا اس کا نام "رشحات صفیر" رکھا گیا، جو ساتواں حصہ قرار دیا گیا، مجموعہ فیض صفیر کا وہ مجموعہ دراصل مجموعہ فن شعر تھا جو بہت سے حصوں پر منقسم تھا، مثلاً ارمغان صفیر کتاب محاورات اردو حصہ ششم اور رشحات صفیر در بیان تانیث وتذکیر حصہ ہفتم۔

یہ ایک تاریخی حقیقت اور صفیر بلگرامی کی سیر چشمی ہے کہ رشحات صفیر کو انھوں نے اپنے منجھلے بھائی سید اولاد احمد صاحب حقیر بلگرامی کو ہبہ کر دیا تھا۔ اور انھوں نے ہی یہ کتاب مطبع نور الانوار آرہ مالک مطبع سید محمد ہاشم بلگرامی [۳] کے زیر اہتمام شائع کرائی، جس کا ایک نظری خاکہ یہ ہے:

صفحات : ۱-۴ دفع شبہات درباب تقلید، صفحات ۴-۱۷ تاریخ وتقریظ وغیرہ، صفحات ۱۸-۱۹۲ دیباچہ ورشحات صفیر۔

سرورق: حصہ ہفتم از مجموعہ فیض صفیر دربار تحقیق تانیث وتذکیر الفاظ مستعملہ زبان اردو مع مثال شعرا مسمی بہ رسالہ رشحات صفیر جس کو جناب بھائی وقبلہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے جناب مرزا نوشہ حضرت غالب دہلوی وغیرہ کی نظر سے گزران کر بکمال محنت وعرق ریزی پندرہ بیس برس میں مرتب اور درست دوبارہ کیا، اور بندہ سید اولاد احمد حقیر کو بکمال شفقت وعنایت ہبہ فرمایا اور عاصی نے بار اول ۱۲۹۳ ہجری میں بنظر فرایدنام بمقام آرہ مطبع الانوار سید محمد ہاشم میں چھپوایا۔

قیمت پختہ فی جلد ۲ روپیہ ۴ آنہ

آخرورق معذرت مولف:

صورت ترتیب یافت حصهٔ فیض صفیر
سجدہ زمن دمبدم خالق علام را
گرچہ ز خدشات طبع نہ شد کا مجو
لیک ہمی بنگرم صورت انجام را
خوبی تحقیق بین، صحت کامل نگر
داد مشقت بدہ، تلخ مکن کام را
رغبت صورت گذار، لذت معنی بچش
یاد بکن از دعا، بندہ نا کام را
از پئی رفع ملال مصرع سعدی شنو
حاجت مشاطہ نیست روئی دلآرام را

۱۳۰۲ ہجری:

رشحات صفیر کا یہ نسخہ اس قدر جلد فروخت ہوگیا کہ نایاب ہوگیا، اور جہاں کہیں اس کا سراغ ملتا شایقین پانچ پانچ روپیہ فی جلد قیمت دے کر منگوا لیتے۔ یہاں تک کہ ۱۳۰۲ ہجری میں یہ رسالہ کلکتہ کورس میں داخل نصاب ہوگیا۔ تب طالب عملوں اور کتب فروشتوں کے خط آنے لگے۔ اس لیے صفیر بلگرامی نے پھر دیکھ بھال شروع کی اور بعد نظر ثانی واضافہ رشحات صفیر مطبع احمدی، پٹنہ سے دوبارہ شائع کیا، اس کے سرورق اور آخرورق کی عبارت ملاحظہ ہو:

سرورق:

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ

الحمد للہ والمنۃ کہ رسالہ تانیث وتذکیر الفاظ مصنفہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مسمی بہ رشحات صفیر حسب فرمایش حاجی سید جان صاحب وعبدالغفور صاحب تاجران کتب پٹنہ محلّہ گورہٹہ در مطبع احمدی واقع شہر پٹنہ مطبوع شد- آخرورق، ص ۳۴۸۔۴

الحمد للہ کہ بالفعل یہ رسالہ عجالۃً تمام ہوگیا، مگر حوصلہ ناتمام رہا۔ یعنی الفاظ جو خلاصہ فیض صفیر سے چن کر لکھ دینے کا وعدہ کیا کہ اگرچہ اون کی مثال رسالہ مرتبہ سابق میں تھی اب بغیر مثال کے خاتمہ میں لکھ دوں گا۔ مگر تقاضائے شایقین اور بخیالِ کم التفاتئ ناظرین ایسے الفاظ کا بالفعل لکھنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ جب کہ بعض لوگ بحر اور رند کی سند کو نہیں مانتے۔

بغیر سند کے کب قبول کریں گے۔ اور بسبب توقف طبع اور معذوری کاتب کے دیر بھی اس قدر ہوئی کہ جی گھبرا گیا۔ یہاں شائقین کے تقاضے نے صحت اور نظر ثانی کرنے کی مہلت بھی نہ دی۔ اس لیے بدون غلط نامہ یہ رسالہ مشتہر کیا جا رہا ہے۔

۱۳۰۲ھ کا نسخہ وفاتِ قدر بلگرامی [۵]۔ کے ایک سال بعد اور وفات صفیر بلگرامی کے پانچ سال قبل شائع ہوا تھا، چنانچہ اس سلسلے میں دونوں کے مابین خط و کتابت بھی ہوئی ہے، جس کے مختصر اقتباسات: جلوۂ خضر: میں موجود ہیں۔ [اصل خط راقم کے پاس موجود ہیں] اس نسخہ یعنی ۱۲۹۳ھ سرورق کی عبارت میں جو لکھا ہے کہ: مرتب اور درست دوبارہ کیا: وہاں دوبارہ کا مطلب یہ ہے کہ جو نسخہ مطبع سنت پرشاد، آرہ کو دیا گیا تھا وہ پہلا نسخہ تھا۔ اور اس کے ضائع ہونے کے بعد ترتیب و تحریر ہوئی۔ اسی طرح حاجی سید جان و عبدالغفور تاجران کتب محلّہ گورہٹہ نے رشحات ۱۳۰۲ھ میں مطبع احمدی سے جو نسخہ شائع کیا، اغلب ہے کہ صفیر بلگرامی کی وفات کے بعد ایک دوسری چادر اوڑھا کر بازار میں پیش کر دیا۔ یعنی صرف سرورق بدل دیا۔

اس سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو:

مجموعہ فیض صفیر بہ تحقیق و تسہیل قواعد و امثال تانیث و تذکیر اُردو بعد نظر ثانی و افزائش و قواعد و الفاظ و مثال کلام اوستادان مستند المسمی ، بہ رسالہ رشحات صفیر جو کہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں چھپا تھا اب بار دوم بصرف زر کثیر و بعد حصول حق تصنیف حاجی سید جان و عبدالغفور صاحب تاجران کتب نے صرف ٹائٹل پیج اسٹار آف انڈیا پریس آرہ میں چھپوایا، قیمت فی جلد تین روپے:

اس نسخہ کے ٹائٹل پیج پر سال طبع درج نہیں ہے۔ اور بار دوم یعنی ۱۳۰۲ھ کے بعد رشحات کے چھپنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ میرے زیر مطالعہ جو نسخہ ہے وہ ۱۳۰۲ھ کا مطبوعہ احمدی ہے۔ اس پر ٹائٹل پیج مطبوعہ ''اسٹار آف انڈیا پریس آرہ'' چھپا ہوا لگا ہے۔ اور ٹائٹل پیج پر اول عبارت مذکورہ الصدر ہے۔ پھر تاجران کتب کے دوکان کی فہرست ہے۔ اس لیے بار دوم: مشتبہ اور تاجرانہ مغالطہ ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسٹار آف انڈیا پریس، آرہ کا مالک ظہور الحق تھا۔ یہ شخص نور الانوار پریس میں بحیثیت کاتب ملازم تھا۔ اور مالک مطبع یعنی صفیر بلگرامی نے چھاپے خانے کا کل انتظام اسی پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دغا کی اور اسٹار آف انڈیا پریس، آرہ میں کھول کر مطبع نور الانوار کو نقصان پہنچانے کی سبیلیں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ اور اس طرح صفیر بلگرامی کے

مطبع نورالانوار کو ختم کرادیا۔ ورنہ سماعت ہے کہ مطبع نورالانوار کی آمدنی ہفتہ چھ سات سو روپے تھی۔ چنانچہ صفیر بلگرامی کی بیشتر مطبوعات اسی پریس سے شائع ہوکر منظر عام پر آئیں۔ اس کے علاوہ دوسرے اہل علم بھی اس پریس سے مستفید ہوئے اور اس کی ترقی میں ممدو معاون رہتے تھے۔

۱۳۳۲ہجری:

خلاصہ فیض صفیر کا آخری اور حالیہ نسخہ ۱۹۱۴ء میں سید عنایت احمد[۶] صاحب بلگرامی نے ترتیب وتحشیہ کے بعد لاہور سے شائع کیا۔

سرورق:

رباعی

محنت ہوئی مجھ کو مدتوں تک کیا کیا
دیکھے دیوان اساتذہ کے صدہا
کس کس مشکل سے کی تالیف صفیر
"نقشے بزمانہ یادگار است ازما" ۱۸۶۹ء

"خلاصہ فیض صفیر یا رسالہ تذکیر و تانیث جس کو...... حضرت سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرحوم...... نے ...... بڑی محنت و سعی سے انتخاب کیا...... مرتبہ سید عنایت احمد بلگرامی ...... جولائی ۱۹۱۴ء رمضان ۱۳۳۲ھ رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں...... چھپا"۔

اس عبارت میں رباعی کے آخری مصرع کی تاریخ ۱۸۶۹ء قطعی غلط ہے۔ صحیح عدد ۱۸۶۱ء ہے، کاتب نے ایک کو نو کردیا، اس کی تشریح ۱۲۷۸ھ کے تحت بھی کی جاچکی ہے۔ اس رباعی سے یہ ثابت ہوا کہ:

(۱) خلاصہ فیض صفیر اول اول مطبع چشمہ علم پٹنہ میں طبع ہوا۔ جس کا سال طبع ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ھ ہے۔

(۲) وہی خلاصہ فیض صفیر دوبارہ رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور سے طبع ہوا۔ سال طبع ۱۹۱۴ء مطابق ۱۲۷۸ھ ہے۔

رسالہ خلاصہ فیض صفیر کے صفحہ ۴ پر الفاظ غلط العوام کا نقشہ دیا ہوا ہے۔ یہ نقشہ خود صفیر بلگرامی کا بنایا ہوا ہے۔ مرتب سید عنایت احمد صاحب دلگیر بلگرامی کا بیان ہے کہ ایک مطبوعہ نسخہ خلاصہ فیض صفیر کا، جد مرحوم کی کتابوں میں موجود تھا، اسی کو انہوں نے بنیاد قرار دے کر

۱۹۱۴ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس طرح خلاصہ فیض صفیر مطبوعہ ۱۸۶۱ء کی ہو بہو نقل خلاصہ فیض مطبوعہ ۱۹۱۴ء ہے، یہ رسالہ آج بھی تذکیر و تانیث کے مسئلہ کی دقتوں کو حل کرنے کے لیے اسی طرح مفید ہے۔ جس طرح ۱۸۶۱ء اور ۱۹۱۴ء میں تھا۔ بلکہ اس دور میں جب کہ ارباب فن علم عروض و علم اللسان و بیان سے ناواقف ہوتے جارہے ہیں اور پرانی و عظیم قدریں ہمارے درمیان سے ختم ہوتی جارہی ہیں، سخت ضرورت ہے کہ اردو کی بقا کے لیے اس کے زندہ کارنامے اور پائندہ حقیقتیں باقی رہیں۔ زبان کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ مگر اس کی علامتیں باقی رہنی چاہئیں۔ ان ہی علامتوں سے نشان منزل کا علم ہوسکتا ہے کہ منزل ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کی نشانیاں ہزاروں اور لاکھوں مگر اُردو میں تو علامتی اور ظاہری نشان کی ویسے ہی کمی ہے۔ کیا یہ حقیقتیں بھی گم کردی جائیں گی؟

حاشیہ

۱- صفیر بلگرامی کی پیدائش ۹/اپریل ۱۸۳۴ء اور وفات ۱۱/مئی ۱۸۹۰ء کو ہوئی۔ مولد: مارہرہ ضلع ایٹہ اور مدفن: آرہ بہار ہے۔ (تلامذۂ غالب)"۔

۲- رسالہ رشحات صفیر مطبوعہ باراول ۱۲۹۳ مطبع انوار الانوار سید محمد ہاشم، آرہ، بہار۔

۳- سید ہاشم بلگرامی، حضرت صفیر بلگرامی کے عزیز اور شاگرد خاص تھے، مطبع کا انتظام و انصرام انہی کے سپرد تھا مگر یہ اکثر و بیشتر لکھنؤ، بلگرام اور عظیم آباد کی دوڑ میں رہا کرتے تھے اس لیے مطبع کارکنوں کے ہی ایما و منشا سے چلتا تھا، کاغذی خانہ پری کے لیے ہاشم صاحب کا نام درج کردیا جاتا تھا۔

۴- رشحات صفیر ''مطبوعہ ۱۲۹۳ھ'' میں ۲۹۲ صفحات تھے۔ اس اشاعت میں ۵۶ صفحات کا اضافہ ہوگیا۔

۵- سید غلام حسنین قدر بلگرامی ہم سن اور ہم عصر سید فرزند صفیر بلگرامی کے تھے، اتفاق سے دونوں کو حضرت غالب سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ آپ کو بھی اُردو عروض پر عبور حاصل تھا۔

۶- حاجی سید عنایت احمد صاحب بلگرامی، دلگیر تخلص، ڈپٹی کلکٹر و کمشنر صوبہ بہار، حضرت صفیر بلگرامی کے پوتے تھے۔ ملیرسٹی، کراچی (پاکستان) کے باشی تھے۔

☆☆☆

ذکر صفیر بلبل (کلام ۱۲۷۳ھ)

یہ سال ہندوستانی سیاست میں: سالِ غدر: یا: جنگ آزادی: کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور تاریخی اعتبار سے مغلوں کی غفلت، ناعاقبت اندیشی، خود فراموشی نے ملک کی توانائی کو محکومی اور غلامی کی زنجیروں سے آشنا کرادیا تھا، پھر بھی ان ہی اکابر اور اسی قوم کے افراد میں کچھ مقابلہ ومجادلہ کرنے والے بھی پیدا ہوئے، حالانکہ معاشرہ ابتر تھا اور زمانہ کی زبوں حالی نے اشراف کو ذلیل ورسوا کر رکھا تھا، جس کی جھلک صفیر بلگرامی کے کلام میں ملتی ہے۔ یہ شعر: صفیر بلبل: دیوان حضرت سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے صفحہ ۹۹ پر درج ہے۔

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اُٹھانے کے لیے

اس شعر سے اس عہد کی تاریخ، تہذیب، تمدن اور انقلاب اقدار کی جس عنوان سے نشان دہی ہوتی ہے، اس کی تفصیل عبث ہے۔ سچ یہ ہے کہ غدر نے ہندوستانی معیشت اور عام زندگی کو جس طرح متاثر کیا تھا، اس سے ہندوستان کا کوئی قریہ، دیہات، شہر اور نگر محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ اور اس عظیم تبدیلی کی تشریح اس عہد کی تاریخوں اور ادب پاروں میں جا بہ جا ملتی ہے۔ صفیرؔ کی زبان سے اپنے استاد سحر لکھنوی کے سلسلے کی یہ تحریر بھی اسی عنوان کی ایک کڑی ہے۔

"غدر میں ان پر (سحر) بڑی مصیبت پڑی، بھاگڑ میں پیدل چلنا پڑا۔ کچھ دنوں کاکوری میں رہے۔ کچھ دنوں بلگرام میں۔ کچھ دن فرخ آباد میں، یہاں تک کہ غدر تمام ہوا اور ملکہ معظمہ کی طرف سے اُمن کا اشتہار عام ہوا۔

"اُن کو بے لکھنؤ کے کل کہاں؟ چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں کسی گاؤں میں ہیضہ کر کے انتقال کیا۔ نہ اس گاؤں کا حال معلوم ہے اور نہ ہی اُن کے مزار کا پتا۔ سچ ہے شاعر کی زبان فال ہوتی ہے۔ خود کہہ گئے تھے۔

دنیا میں نام مردہ بہ از مردے سحر
یوں میٹے گور کا بھی نہ باقی نشاں رہے (جلوۂ خضر دوم۔ صفحہ ۱۸۲)

مئی ۱۸۵۷ء سے اکتوبر ۱۸۵۸ء تک ہر ہندوستانی مصائب و آلام کا شکار رہا۔ زندگی اس کی زندیقی، حالت اس کی نا گفتہ بہہ، موت بن مانگی مراد، ذلت و خواری اس کے گلے کا ہار۔ غرض بدحالی کا دوسرا نام ''ہندوستانی'' اور ہندوستانی کا اصل نام ''مسلمان'' تھا اور مسلمان ہونا جُرم اول تھا۔ یہاں تک کہ آخر یکم نومبر ۱۸۵۸ء مطابق ۲۳ ربیع الاول ۱۲۷۵ ہجری کو لارڈ کیننگ نے الہ آباد کے دربار میں اعلان کیا۔ جس پر خون کا مقدمہ نہ ہو، وہ آج سے آزاد ہے۔ کیسا حادثہ ہے مظلوم ظالم قرار پائے اور ظالم حاکم بن بیٹھے۔ جس کے ہاتھ میں تلوار خون آشام ہو، وہ بے خطا کہلائے اور جو بے قصور ہو وہ خطا کار مشہور کیا جائے؟ دراصل استبداد نے ہندوستانیوں کی آزادی کے امکانات کو مبہم بنا دیکھا تو ان پر شکست خوردگی سُرعت سے اثر انداز ہوگئی۔ کوئی سہارا نہ دیکھا تو تقلید ذہنی پر آمادہ ہوگئے اور اس غیر یقینی حالات سے نبرد آزمائی کا جذبہ یاس، نا اُمیدی، نا کامیابی میں بدل گیا۔ یہاں تک کہ اقدار حیات کا احساس تک ختم ہوگیا۔ پراگندگی، افسردگی اور انتشار نے ان کو ایک بڑی اُلجھن میں گرفتار کر دیا تھا اور یہ فیصلہ کرنا دشوار تر ہوگیا تھا کہ اپنے لیے کون سا لائحہ عمل تیار کریں؟ اس انتشار کا سد باب کیسے ہو؟ قلعہ معلیٰ کا نام عام زندگی میں کتنا ہی دل آویز رہا ہو مگر اسباب و علل کی بساط پر نوحہ خوانی کے سوا اور تخیل آرائی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ دل کی آرزوں اور کم ہمتی کو محض تسکین دینا، کشتوں کو زندگی سے ہم کنار کرنا تو نہ تھا؟ احساس حقیقت بلکہ اظہار حقیقت تو باطن کی نذر تھا ہی۔ زندگی کی افتاد سے گریز اور اجتماعی زندگی کے درد و کرب کا ایک حصہ اجتماعی سب ہی بن کر رہ گئے تھے اور مادّی زندگی کا حصول بھی جب مفقود نظر آنے لگا تو ذوق قلعہ معلیٰ کے در و دیوار میں پناہ گزین ہونے کے باوجود، چیخ پڑے۔

ہائے صیاد تو آیا میرے پر کاٹنے کو
میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو

اس اظہار حقیقت بلکہ احساس کرب کے بعد بھی ہم میں جرأت اقدام کی کمی نظر آئے گی۔ اس جہت اغیار کا محض غلط طریقہ استبداد ہی نہ تھا بلکہ اپنوں کی خالص بے عملی اور بے وفائی نے جوش۔ ولولہ۔ مستقبل کی آگہی کا خاتمہ کر رکھا تھا۔ یہ ارتدادی دور بڑا صبر آزما تھا۔ مگر ادیب اور شاعر جو زمانہ کا نباض ہوتا ہے۔ ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر باوجود مسندِ شاہی پر متمکن ہونے

کے آنے والے الم بلکہ گزر جانے والے ہولناک مصائب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور زندان وزنجیر۔ قید وبند کی صعوبات سہنے کے لیے تو آمادہ ہوئے مگر ان زنجیروں سے نجات حاصل کرنے کی کوئی سبیل ان کو نظر نہ آسکی۔ اگر چہ یہ بات حق ہے کہ عوام کی بے حسی۔ بلکہ غداری۔ افتادطبع اور دلی اضطراب نے ان کو "شہر آشوب" بنادیا تھا، چنانچہ ان کی شاعری پر براہ راست غدر اور اس کے عوامل نیز غیر ملکی استبداد وجبر کا اثر پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری، شاعری کم، آپ بیتی زیادہ نظر آتی ہے، چنانچہ عہد ظفر کی کراہ ان اشعار میں نمایاں ہیں۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے
بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزش غم سے
مگر منھ سے نہ اُف ہم غم گساروں میں نکالیں گے
اے جنوں توڑ کے زنجیر درِ زندان کو
جی میں ہے کھایئے اب چل کے بیابان کی ہوا

دراصل ظفر کی حکمران نظروں میں حکومت وقت سے مصالحت کرنے کا جذبۂ بیدار کبھی پیدا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر حق بات یہ ہے کہ ان کی اندرونی کیفیت کبھی مطمئن نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں، جن میں غیر اطمینانی کیفیت بہ درجہ اتم ہے۔

سوتے تھے چین سے ہم خواب عدم میں لیکن
شور ہستی نے ہمیں آہ جگا کر مارا

شاہ ظفر دہلوی اگر چہ ذوق دہلوی کے شاگرد تھے مگر غالب سے بھی استفادہ حاصل کرتے تھے۔ بلکہ اگر یہ بات کہی جائے کہ ان کے یہاں جو آہنگ، سوز اور تلخیٔ کلام ہے وہ غالب کی دین ہے، تو مبالغہ نہ خیال کرنا چاہئے۔ اس لیے کہ غالب نے محض قنوطی شاعری نہیں کی بلکہ متوازن ظرافت کے انداز میں انہوں نے اس دور کی عکاسی کو ادا کرنا روا خیال کیا۔ شاہ ظفر نے پیہم صدمات سے دوچار ہونے کے بعد غزل کو جو رنگ دیا وہ المیہ روزگار کی داستان بن گیا۔ مسکراہٹ کے برخلاف واقعات اور ظرافت کے امتزاج اور یاس آمیز شاعری کا رنگ نکھر کر سامنے آیا۔ اور ہندوستان کی تاریخ بن گیا۔ ان ہی تاریخی عوامل میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کی شاعری پروان چڑھی، صفیر بلگرامی بھی غالب دہلوی کے شاگرد تھے،

ان کے نانا حضرت شاہ صاحب عالم صاحب بلگرامی مارہروی سے غالبؔ کے خصوصی مراسم بھی تھے اور غالبؔ دہلوی شاہ صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے، چنانچہ غالبؔ نے ایک بار حضرت صاحب عالم صاحب کو خط لکھ کر ان کی تاریخ پیدائش دریافت کی، تو شاہ صاحب نے لکھا کہ میری تاریخ پیدائش فقط: تاریخ: میں مضمر ہے، اس کا جواب غالبؔ نے اس شعر میں دیا:

ہاتف غیب شب کو یوں چیخا
ان کی تاریخ میرا تاریخا
۱۲۱۱ ۱۲۱۲

غالبؔ کے اس شعر میں ظرافت موجود ہے اور واقعہ نگاری بھی، ان کے شاگرد صفیر کے یہاں بھی واقعہ نگاری کے مضمرات زیادہ ملتے ہیں، یہ اشعار ان کی مثال ہیں۔

منھ زرد ہے، خون روتے ہیں آنکھوں سے ہمیشہ
کچھ پوچھو نہ اے ماہ لقا ، رنگ ہمارا
سفاک نے پہنائیں جو زخموں کی بدھیاں
گردن میں ہاتھ ، میں نے بھی بس ہار کر دیا
غبار آلودہ ہوتے ہو، چلو اب گھر کو، گلشن سے
نہیں ہے بوئے گل۔ یہ خاک ہے، کوئی رگِ گل کی
شہیدان وفا کی قدر دانی ہوتی ہے کیا کیا
لپیٹا اس نے اپنے کشتوں کو پھولوں کی چادر سے
آیا کف گل چیں ستمگر میں گلستان
بلبل نہیں اب تیرے مقدر میں گلستان
بلبل ہے کہیں ، گل ہے کہیں ، سبزہ کہیں ہے
اس چشم کی گردش سے ہے چکر میں گلستان

ان اشعار میں سیاسی شعور اور قومی کرب کے عنصر کے سوا واقعاتی رنگ آمیزی زیادہ ہے۔ سیاسی ابلاغ کے رجحان اور دار و رسن، گل و نسترن کے تصور بھی خود کلامی کے طور پر موجود ہیں۔ یہ شعر اس کی واضح مثال ہے۔

ملتی لذت مجھے کچھ اور بھی ہر زخم کے ساتھ
حیف ہے ہاتھ میں قاتل کے نمکدان نہ ہوا

یہ اشعار ۱۲۸۰ ہجری سے قبل (یعنی ٹھیک ڈیڑھ سو سال قبل) کے ہیں مگر یہ شعر:

کل جو اٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں، اٹھانے کے لیے

تحریر صفیر بلگرامی کے مطابق یہ شعر ۱۲۶۹ ہجری کا ہے، غدر یا تباہی ہند کا سلسلہ اس کے پانچ سال بعد ۱۲۷۴ ہجری میں شروع ہوا، جس نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہی نہیں کیا، مغلوں کی مکمل تباہی، مسلمانوں کی معاشی بدحالی، اقتدار کی شکستگی، ملکی وقار کی پراگندگی۔ قومی بلند آہنگی کی نفی کا موجب بھی ہوا۔ یہ اشعار ان علامتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

دل ہے کہیں، حواس کہیں ہے، نظر کہیں
ہم سے تو انتظام بھی گھر کا نہ ہوسکا
شہیدان وفا کی قدردانی ہوتی ہے کیا کیا
لپیٹا اس نے اپنے کشتوں کو پھولوں کی چادر سے

پریشان خاطری کے اس دور کی عکاسی ان اشعار میں بھی ملاحظہ ہو:

بل کھائیں گے کھل جائیں گے الجھے گے بڑھیں گے
کیا کیا نہ ابھی پیچ دکھائیں گے وہ گیسو
رنگ تازہ لائی پھر باد بہاری ان دنوں
پھر قبا پارینہ پھولوں نے اتاری ان دنون

عہد صفیر بلگرامی میں سماجی کارکردگی اور انسانی مجبوری و بے چارگی کا عالم یہ تھا:

ان کو غیر آراستہ کرتے ہیں، میں حیران ہوں
مجھ کو دی ہے، خدمت آئینہ داری ان دنوں

سچ ہے کہ شاعر وقت، سماج اور عہد کی زبان ہوتا ہے، ورنہ یہ احساس کون کرسکتا تھا کہ:

حال پر اپنے نہ رویا کوئی
روئے ہم سارے زمانے کے لیے
وصل حاصل ہوا، یا حوصلہ دل کا نکلا
کون ارمان مرا، اے گل رعنا نکلا

اس شعر پر بہادر شاہ ظفر کا خیال آتا ہے، جنہوں نے ان کیفیات کی غمازی یوں کی تھی:

سوتے تھے چین سے ہم خوابِ عدم میں لیکن
شورِ ہستی نے ہمیں آہ جگا کر مارا
کبھی لب پر جو ہنسی اپنے ذری آتی ہے
ساتھ ہی آنکھوں میں گریہ سے تری آتی ہے

لیکن یہ شعر تاریخی ہے اور زندگی کا ترجمان۔ ملت کی تباہی پر گریہ کنان:

یہ رعایائے ہند تہہ ہوئی، کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

مظلومی ہند کی داستان اور جاری قومی مفلوک الحال پر صفیر بلگرامی کے تاثرات بھی یکساں تھے۔

خندۂ چاک گریباں نے رلایا مجھکو
ایسا یاد آیا ترا ہنسنا کہ بس کیا کہئے

جناب مرزا دبیر لکھنوی کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد آخر آخر دم تک صفیر بلگرامی نے مرزا غالب دہلوی سے تعلق رکھا۔ اس سلسلے میں صفیر بلگرامی نے دہلی کا سفر ۱۲۸۳ھ میں کیا اور۔ غالب سے ملاقاتیں بھی کیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ یہاں تک کہ ۲۱/رمضان المبارک ۱۳۰۷ ہجری کو اس دارفانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی۔

اس داستان کی رحیل صفیر بلگرامی کے یہاں بھی سنئے:

آیا کفِ گلچیں ستم گر میں گلستاں
بلبل نہیں اب تیرے مقدر میں گلستاں
بلبل ہے کہیں گل ہے کہیں، سبزہ کہیں ہے
اس چشم کی گردش سے ہے چکر میں گلستاں

یا یہ شعر:

اب بادۂ شبانہ کی وہ سرمستیاں کہاں
وہ دور دور گردشِ ایام لے گیا

یہ اشعار غزل کے ہیں مگر ان کا کرب نمایاں ہے، جسے ہم آشوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ شعر اس کی واحد مثال ہے:

کن لوگوں کے بے رحم نے تعذیر نئی کی
پامال سرِ گور یہ لاشے ہوئے کس کے؟

اس اجمال کے بعد: صفیر بلبل: دیوان صفیر بلگرامی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تفصیلات پیش خدمت ہیں۔

یہ مجموعہ کلام اب کم یاب نہیں، نایاب ہے، اس کے نسخے خال خال ہی دستیاب ہوں گے اس لیے ضروری ہے کہ اردو ادب کے نئے طالب علم اس عظیم سرمایۂ ادب سے متعارف ہوں۔ صفیر کے تذکرۂ جلوۂ خضر اور دیگر تصنیفات کے سوا اس کی حیثیت اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ مجموعہ کلام ان کا اولین شعری سرمایہ ہے، مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

۱- صفیر بلبل کے صفحۂ اول کی عبارت یہ ہے:

وهو العلی العظیم

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے

صفیر بلبل

کہ رہے چشم خریدار پر احسان میرا

در مطبع حیدری طبع شد

۲- دوسرے صفحہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ دیباچہ وحالات صفیر بلگرامی درج ہیں، جو صفحہ پانچ پر ختم ہوتے ہیں، آخری سطر میں ایک قصہ: روح افزا: نامی کی تکمیل وطباعت کی اطلاع پر (حصہ نثر) تمام ہے، گو اس عبارت سے قبل: صفیر بلبل: کے متعلق یہ اطلاع مندرج ہے:

> اپنا دیوان جو موسوم بہ صفیر بلبل ہے اور وہ ہمراہ ہے۔ اپنی دانست میں عیوب ظاہری سے مبرا آگے سخندان آگاہ ہیں، انتخاب کر کے چھپوانا شروع کیا ہے، خدا انجام کو پہونچادے اور احباب کو پسند آئے، ۱۲۷۳ ہجری میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے تاریخ کا قطعہ لکھا۔

از غزلیات و قطعہ وافراد
پُر جو گردید کلیات صفیر

ہاتف غیب از فلک فرمود
جمع شُد مایۂ حیات صفیر

(دیباچہ صفیر بلبل صفحہ ۵ حاشیہ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کا کام ۱۲۷۳ ہجری تک انجام

پا چکا تھا۔ یعنی ۲۴ سال کی عمر اور شاعری کی دسویں سال: دیوان اول: کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی اگر چہ طباعت کا کام سات سال میں تمام ہوا۔

صفیؔر بلگرامی کی زندگی میں: صفیر بلبل: اور: خم خانہ: کی تدوین وطباعت ہو چکی تھی۔ اس کے سوا قلمی دیوان اور بیاض کے مندرج اشعار علیحدہ کلام تھے۔ جو اگر چہ محفوظ ہیں مگر اب کس میں ہمت ہے کہ ان کی ترتیب نو کے بعد منظر عام پر کلام لا سکے۔ پھر غدر ثانی ہند (تقسیم ملک) سے رہی سہی ہمت وجرأت نے ان اَدب پاردن کی اشاعت کو نسبتاً ختم سا کرا دیا ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ زندہ رہنے والا کلام کسی صورت میں بھی موت سے ہم کنار نہیں ہوتا۔ آج میر۔ غالب۔ مصحفی۔ مومن خان اور انشاء کے کلام کی تازگی ویسی ہی ہے۔ جیسی ان کی زندگی میں تھی، صفیؔر کے یہاں بھی شعری زندگی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ اور ان کی غزلیات میں وہ کیف ہے جو اساتذہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے اُن کے یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں۔

تم کو آنے میں خود کراہت ہے
ورنہ سو شکل - لاکھ صورت ہے
ہم ہیں مجبور اور تم مختار
اے بتو یہ خدا کی قدرت ہے
کن لوگوں کے بے رحم نے تعذیرنئی کی؟
پامال سر گور یہ لاشے ہوئے کس کے؟
کوچۂ یار سے محروم پھری ہے شاید
ٹھوکریں کھاتی ہوئی باد صبا آتی ہے
اس قدر یار نے نظروں سے گرایا کہ صفیر
اپنے ہم چشموں سے اب مجھ کو حیا آتی ہے

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ صفیر بلبل کا مجموعہ ان کی زندگی کے ۲۴ ویں سال میں منظر پر آ گیا تھا۔ یعنی ان کی شعری صلاحیت مسلّم ہو چکی تھی، مگر وہ دور کی بدحالی سے متاثر تھے اور یہ کہنے پر مجبور:

فکر تازہ کو صفیؔر آہ سنائیں کس کو
شہر میں اپنے ہمیں کوئی سخن گو نہ ملا

غالبؔ ایک خط میں عزیز الدین کو اسی مضمون کو یوں لکھتے ہیں:

"کیسی صاحب زادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ کیا قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خان کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خان کی حویلی اسپتال ہے اور ضیاء الدین خان کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں۔ اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں ....لال کوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں..."[۳۱]

اس اقتباس اور صفیرؔ کے شعر میں نظم و نثر کے فرق کے سوا اور کوئی بات نہیں ملتی ہے ۔غالبؔ دہلوی نے جو بات پھیلاؤ میں کہی ہے۔ اُن کے شاگرد نے اختصار بیانی میں کہی ہے۔ صفیرؔ کی ایک مرصع غزل جو قطع نما بھی ہے۔ وہ ملاحظہ ہو:

احباب ملانے کے لیے آئے ہوئے ہیں
کچھ سوچ انہیں ایسا ہے کہ گھبرائے ہوئے ہیں
ناصح جو نصیحت کے لیے آئے ہوئے ہیں
ہم لوگ بھی سمجھے ہوئے سمجھائے ہوئے ہیں
کیوں میں نے کہا۔ آپ کو قتال دُوعالم
اللہ اِسی بات پہ اِترائے ہوئے ہیں
وہ بُولین تو بُولین گے، ملیں گے تو ملیں گے
ہم آپ سے ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں
افسانے جوانی کے عجب ہوش رُبا ہیں
گویا کہ طلسمات میں ہم آئے ہوئے ہیں
دیکھو تو ذرا شام کے وعدہ کی تلافی
پچھلے کو مرے خواب میں وہ آئے ہوئے ہیں
بُلبل ترے وعدے پہ تعجب ہے تعجب!
یہ نغمے تو ظالم مرے سکھلائے ہوئے ہیں

تنہا نہیں اُستاد ہوں میں شآد وسخن کا
ایسے تو ہزاروں مرے سکھلائے ہوئے ہیں
سمجھا نہ صفیرؔ ایک اشارہ بھی برہمن
جو دِل میں بتوں کے ہے وہ ہم پائے ہوئے ہیں

دراصل جناب شآد عظیم آبادی نے ایک مقطع میں کہا تھا:

اے شآد تھا خموش ، زمانے سے ہم صفیر
نالہ مرا سنا جو یکایک چہک پڑا

اس تعلّیٰ کا جواب حضرت صفیرؔ نے یہ دیا تھا:

چمن میں ہم جو نالاں ہوں، نہ بلبل کی فغاں نکلے
خدا کی شان ہے ، طوطی ہمارا، ہم زباں نکلے

مندرجہ بالا غزل کے آخری دو اشعار بھی اس ذیل کے ہیں مگران اشعار سے ہمارا ہرگز یہ مدعا نہیں کہ جناب شآد کی شاگردی اور استادی حضرت صفیرؔ بلگرامی کی بحث کا آغاز ہو۔ بلکہ صفیرؔ کی قادرالکلامی۔ ایجاد، ایجاز اور معنویت واظہار کمال وفنی درجات کی نشان دہی مقصود ہے، اسی مذکورہ زمین کی غزل میں صفیرؔ کا ایک اور قطعہ بند ملاحظہ ہو، جو میری علم واطلاع کے مطابق غیر مطبوعہ ہے۔

مرقد میں جو رکھ کر ہوئی یاروں کو فراغت
معمول سے پُرسش کو ملک آئے ہوئے ہیں
وہ پوچھتے ہیں کون خدا ہے ترا بندے
ہم کہتے ہیں جو دید کو ترسائے ہوئے ہیں
وہ پوچھتے ہیں کون پیمبر ہے تمہارا
ہم کہتے ہیں وہ جو انہیں دیکھ آئے ہوئے ہیں
وہ پوچھتے ہیں کون امامِ ازلی ہے؟
کس دین کے انداز تمہیں بھائے ہوئے ہیں
ہم کہتے ہیں خضر رہِ اُلفت کے ہیں پیرو
وہ عشق کے رستے ہمیں بتلائے ہوئے ہیں
ملّت میں وفا کے ہیں تو مشرب میں جنوں کے

ہجراں کے ستائے ہوئے۔ دُکھ پائے ہوئے ہیں
ارمان میں دیدار کے ہے جان جو نکلی
حسرت زدہ دیدے جو ہیں پتھرائے ہوئے ہیں
بھولے ہیں سوال اور جواب اپنا فرشتے
سرزانوئے تشویش پہ نہوڑائے ہوئے ہیں
تلقین سرِقبر پڑھے جاتے ہیں احباب
مرقد میں یہاں ابرالم چھائے ہوئے ہیں
کس درد سے کرتے ہیں بیان اپنی مصیبت
پہروں سے نکیرین کو رُلوائے ہوئے ہیں

آخر میں صفیؔر بلبل کے کچھ اشعار منتخب شدہ ہدیہ قارئین ہیں۔

خط نمایاں ہوگیا رُخ پر حضور
دیکھیے آئینہ اندھا ہوگیا!
بارہا کی بھلائی ان سے صفیر
جو ہمیں اب بُرا سمجھتے ہیں
منہ دیکھ کر میں قتل کے ارمان میں رہ گیا
خنجر الجھ الجھ کے گریباں میں رہ گیا
وہ نہ آتے ہوں کہیں، دوڑ کے کہدے اے ضعف
تم ٹھہر کر ابھی آنا، ذرا بے ہوش ہوں میں
آنے والے ہیں وہ میّت پر مری ہنگام دفن
عمر رفتہ نے کیا ہے قصد استقبال کا
اپنی محفل سے نکالا تو نہ اس نے لیکن
چند باتیں مجھے ہُو ہُو کے خفا اور کہیں
تم ہی انصاف سے کہو صاحب
دل ہمارا یہیں گرا کہ نہیں؟

آخری یہ دو شعر حرف آخر کہے جاسکتے ہیں:

ثابت ذرا بھی دل کو نہ چھوڑا یہ کیا کیا
آئینہ میرا آپ نے توڑا یہ کیا کیا
اک درد کا مزا تھا سو وہ بھی چلا گیا
دل کا ہمارے آبلہ پھوڑا یہ کیا کیا

حاشیہ:

(۱) سید محمد مہدی خبرؔ بلگرامی کے متعلق ان کے شاگرد سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کا بیان ہے کہ:

آخر جناب ممدوح (خبر بلگرامی) بذریعہ منصب سرکاری بھاگل پور تشریف لے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ پھر مجھ کو ملازمت کی نوبت نہیں آئی...... مگر بعد تشریف بری حضرت خبر بلگرامی کے میں نے لکھنؤ کا قصد کیا اور اپنے کو حضرت سحرؔ شاگرد ناسخؔ علیہ الرحمتہ تک پہونچایا۔ اُن کی شفقتوں اور عنایتوں کا ذکر بہت طول طویل ہے۔ پہلی غزل جو میری پیش ہوئی وہ یہ تھی:

کل جو اٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اُٹھانے کے لیے

جناب خبرؔ بلگرامی کا کلام نایاب ہے مگر اُن کی غزل کے چند اشعار نمونہ کلام کے طور پر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

تمام عمر جو وہ شوخ ہم کنار رہا
وہی خیال لحد میں دمِ فشار رہا
مری لحد پہ وہ کب فاتحہ کو آئے گا
ہمیشہ خاک سے میری جسے غبار رہا
وہ ہاتھ آج اُٹھا ہے بلائیں لینے پر
تمام عمر جو تیرے گلے کا ہار رہا
خبرؔ اگرچہ ہوا سوکھ کر کانٹا
پہ تیرے دل میں بھی اس کی طرف سے خار رہا

☆☆☆

مثنوی گوہر عشق

سادات صغری الواسطی کے خاندان کی جو شاخ بلگرام (اودھ) میں بس گئی تھی، اسی کی ایک شاخ سید نور الحسن بلگرامی [1] کے واسطہ سے کواتھ [2] ضلع آرہ، شاہ آباد (صوبہ بہار) جا کر آباد ہوئی۔ دوسری شاخ (ہم جدی) مارہرہ ضلع ایٹہ (اتر پردیش) آئی۔ اس طرح بلگرام سے دو پھول بیرون چمن ہو گئے اور چار دانگ عالم میں مشہور ہوئے نیز کمال کے

---

[1] سید نور الحسن بلگرامی کی املاک ضلع آرہ (بہار) میں مالکانہ تھی یعنی خرید کردہ اور اس کی سند باضابطہ ان کے پاس تھی۔ مگر "جاگیر" کا شعبدہ مخالفین کا کارنامہ ہے۔ خواجہ سید فخر الدین حسین، سخن نے، صفیر بلگرامی سے جب بغاوت کی تو مشہور کیا کہ "جنگ بکسر" میں نور الحسن خاں بلگرامی نے نواب شجاع الدولہ کو دھوکا دیا اور انگریزوں سے سازش کی۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے اور سخن کی سخن طرازی کا پردہ صفیر بلگرامی کی طبقات کرام (حصہ دوم) در احوال خاص سید نور الحسن خاں بلگرامی سے فاش ہوتا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

"خلعت و خطاب پانا سید نور الحسن خاں بہادر بلگرامی کا شاہ عالم کے دربار سے...... سید نور الحسن خاں بہادر کو شاہ عالم بادشاہ نے بلوایا اور فرمایا کہ تم لوگ سب ملازم بادشاہی ہو۔ جس کے ماتحت کئے جاؤ گے اس کے تحکم تم پر اسی وقت تک پہنچتا ہے، جب تک بادشاہ کا تعلق اس کے ساتھ ہو...... تم کو بھی لازم ہے کہ ہمارے حکم کی تعمیل کرو...... (نور الحسن خاں نے کہا) مجھے عذر کیا ہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر نو (۹) پارچہ کا خلعت گراں بہار، معہ ڈنکہ اور نشان اور نوبت اور فیل داسپ وغیرہ عنایت کیا اور مبارز الملک، احتشام الدولہ نواب سید نور الحسن خاں بہادر ضرغام جنگ کا خطاب دیا......" (طبقات کرام مولفہ صفیر بلگرامی نسخہ قلمی در کراچی)

[2] شیر شاہ سوری کے وطن سہسرام کے (اردگرد پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ بوڑھن شاہ کے پہاڑ سے گزر کر تقریباً دو (۲) میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیتا کنڈ کا سلسلہ کوہ ملتا ہے۔ مشہور ہے کہ سیتا جی نے رام جی کے بن باس کے موقع پر یہاں قیام کیا تھا اور غسل کیا تھا۔ اسی لیے یہ جگہ بہت متبرک اور قابل پرستش مشہور ہوگئی۔ اس پہاڑ کے کنڈ کا پانی موتی کنڈ وغیرہ سے گزر کر مادر کنڈ میں گرتا ہے اور اس سے ملحق پہاڑیوں کا پانی مشترک ہو کر جب سیل رواں کی صورت میں بہتا ہے تو ۲۵ یا ۲۸ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جس قصبہ کے نزدیک سے گزرتا ہے وہ کواتھ ہے۔ دراصل یہ وہی ندی ہے جو کاؤ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی ندی کے نام کی مناسبت سے قصبہ کا نام کواتھ ہو گیا، جہاں محکمہ نہر کا بڑا دفتر، ہائر سکنڈری اسکول، تار گھر، سرکاری شفاخانہ اور تجارتی منڈی ہے۔ سادات بلگرام کا خاندان اب بھی سب سے زیادہ لائق تعظیم سمجھا جاتا ہے۔ ہندو مسلمان سب ایک خاندان کے فرد کی طرح رہتے، ایک دوسرے کا احترام کرتے اور دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں۔

موجب قرار پائے، جن میں علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی، حافظ سید عبدالجلیل بلگرامی، علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی، شاہ سید برکت اللہ، پیمی بلگرامی، حضرت شاہ سید عالم صاحب بلگرامی، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، مولانا شاہ سید علی احسن، احسن بلگرامی ثم مارہروی اور بہت سے اکابر ادیب شاعر و اہل حرفہ ان دیار و امصار سے ظہور میں آئے۔ حضرت صاحب عالم مارہروی اور صفیر بلگرامی جو نانا اور نواسے کے رشتے کے سوا، غالب دہلوی کے دوست اور تعلق خاص رکھنے والوں میں تھے (اور اسی اعتبار سے غالب حضرت صاحب عالم کو پیر و مرشد اور صفیر بلگرامی کو ''لختِ جگر'' سے خطاب کرتے تھے) اسی خاندان کے فرد تھے۔

صفیر بلگرامی اردو ادب میں ناقد، شاعر، نثر نگار، صحافی، داستان گو، غزل گو، مرثیہ نگار، واقف رموزِ فنِ عروض ولغت کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی فکری صلاحیت بے پناہ اور شعوری بالغ نظری بے مثال تھی۔ وہ ہمہ رنگ و ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف میں تذکرہ جلوۂ خضر، تاریخ بلگرام [1]، مجموعہ کلام صفیر بلبل، رسالۂ تذکیر و تانیث نہایت درجہ اہم ہیں۔ عہد صفیر کے تاریخی ارتقا و کیفیات کا اندازہ ان کی تحریروں سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ خبر بلگرامی، مرزا دبیر لکھنوی، سحر لکھنوی اور غالب دہلوی کے شاگردوں میں تھے۔

مثنوی کے عہد درعہد کی تاریخ کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو اس کا شمار شاعری کی اس قسم میں کیا جائے گا جس سے ''لوک کہانیاں'' اور ''داستانیں'' جنم لیتی ہیں۔ غنائی محرکات اور شعری نغمگی اس کی زندگی ہے۔ چنانچہ عہد میر سے لے کر عہد شوق تک بلکہ آج بھی اس ''صنف سخن'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مثنوی دراصل جذبات و کیفیات کا دوسرا نام ہے۔ مثنوی لطف و انبساط اور ذکر گل و نسترن کے ذکر کا نام ہے۔ مثنوی سدا بہار پھول اور ہمیشگی، وارفتگی مضامین کے ایسے مربوط تذکرے کا نام ہے، جس سے ہمیں آسودگی بھی ملتی ہے اور زبان و بیان اور ادب کی چاشنی کا کیف بھی میسر آتا ہے۔ مثنوی گوھر عشق مؤلفہ صفیر بلگرامی شاگرد غالب و سحر کا ذکر و مطالعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

---

[1] تاریخ بلگرام کے مطبوعہ صرف ۳ نسخے ملتے ہیں۔ ایک راقم کے پاس، دوسرا حاجی وصی احمد صاحب بلگرامی مقیم کراچی اور تیسرا حاجی سید سعید احسن مارہروی مقیم دادو سندھ کے پاس لیکن تینوں نسخے مختلف اوراق کے غائب ہونے کی وجہ سے ناقص ہیں۔ مگر شکر ہے کہ اس تصنیف کا اصل نسخہ (قلمی) الحاج سید وصی احمد صاحب بلگرامی کے پاس غالباً محفوظ ہے۔ راقم کی نظر سے یہ نسخہ ابھی تک نہیں گزرا ہے۔

مثنوی گوہر عشق کا (زیر تذکرہ نسخہ کے سوا) کہیں اور وجود نہیں ملتا مگر یہ بات بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی ہے اور یہ کہ یہ نسخہ "خاندانی ملک" کے سبب ہی سہی، دست بردزمانہ سے کس طرح محفوظ رہ گیا؟ پھر بھی اس نسخہ کی کتابت صفیر بلگرامی کی زندگی میں ہوگئی تھی، ممکن ہے خود مصنف کے نسخہ سے کتابت ہوئی ہو۔ کتابت سید محمد رضی صاحب بلگرامی نے کی تھی جو صفیر بلگرامی کے ہم جدی اور قرابتدار تھے تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔ شجرۂ نسب ملاحظہ ہو۔ [1]

---

[1] طبقات کرام (قلمی) میں افتخار علی بلگرامی کا وصیت نامہ بنام فرزند خود محمد خورشید امامی بلگرامی درج ہے۔ "برخوردار امامی را وصیت است...... دیگر باید کہ برادر عزیز انم یعنی سید محمد عسکری وسید بہادر علی وسید...... را بجائے من دانند۔ ودقیقہ از فرمان برداری فرگذاشت نکنند......" ص ۳۶۱، میر امامی فارسی کے شاعر تھے اور بہت ہی قابل بزرگ تھے۔ (۲) بہادر علی کی نسل سے محمد مرتضیٰ اور محمد رضی (۳) بندہ علی کی نسل سے فرزند احمد صغیر بلگرامی پیدا ہوئے۔ (۴) محمد رضی کے بیٹے سید رضی صبر تخلص شہیر مچھلی شہری کے شاگرد تھے۔ کم گو مگر عمدہ شعر کہتے تھے۔ بیشتر کلام ناپید ہو چکا ہے۔ کچھ غزلیات میرے پاس محفوظ ہیں۔ بنارس کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم لکھی تھی جو نیا دور لکھنؤ میں شائع ہو چکی ہے۔ لاولد فوت ہوئے۔ (۵) ابن مرتضیٰ بلگرامی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ آرہ کواتھ اور مارہرہ کے سادات لگرام کے پہلے شخص تھے جنہوں نے اس عہد میں باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد مختلف مقامات پر سب رجسٹرار اور رجسٹرار کے عہدے پر مقرر رہے۔ بہت ہی پر مذاق شخصیت کے مالک تھے۔ لاولد فوت ہوئے۔ (۶) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے فرزند سید نور احمد گرامی اچھے شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ اپنے والد ہی کو اپنا کلام دکھاتے اور اصلاح لیتے تھے، چنانچہ وفات والد ماجد پر جو مرثیہ کہا تھا وہ اول بار ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اسے محمد اسمٰعیل مہر آروی شاگرد خاص صفیر بلگرامی نے اپنے استاد کی وفات کے بعد فسانۂ غمناک کے نام سے جو رسالہ ترتیب دیا اس میں درج کیا تھا۔ یہ رسالہ بھی غیر مطبوعہ ہے راقم کے پاس اس کی ایک نقل محفوظ ہے۔ جس میں ۱۳۰۷ھ میں مختصر حالات صفیر اور قطعات وفات حسرت آیات درج ہیں۔

(قطعۂ تاریخ وفات از نتیجہ فکر عالی جناب سید نور احمد صاحب گرامی بلگرامی خلف شاگرد صفیر بلگرامی)

ہم جائیں کس کے آگے کہنے کو اپنی حالت — آپ اٹھ گئے جہاں سے یہ غم بڑا ہوا ہے
سمجھائیں کس کو جا کر غم گین خود ہی ہم ہیں — محشر بس آج گھر میں رونے سے ہو رہا ہے
رو رو کے بس گرامی یہ حسب حال اپنے — کہتا ہے سال رحلت "داغ پدر ملا ہے"

حضرت گرامی راقم الحروف کے حقیقی نانا تھے۔ ان کے دونوں صاحبزادگان عنایت احمد اور وصی احمد علم وجاہ میں ہم مرتبہ وبلند پایہ ہیں۔ دونوں حضرات کراچی میں مقیم تھے اب فوت ہوگئے ہیں۔

سید خورشید علی بلگرامی تخلص خورشید

- افتخار علی (۱)
- محمد عسکری
- بہادر علی (۲)
  - حسن عسکری
  - مصطفےٰ علی
    - ارتضا علی
    - رضا علی
    - محمد رضی
      - احمد رضی
      - سید رضی صبر (۴)
    - محمد مرتضیٰ
      - آل حسین
      - ابن مرتضیٰ (۵)
  - ابو علی
  - محمد یحییٰ
- بندہ علی (۳) بندہ
  - غلام یحییٰ
    - سید احمد تخلص احمد
      - فرزند احمد صفیر
        - نور احمد گرامی (۶)
          - عنایت احمد دلگیر
          - وصی احمد فانی
      - اولاد احمد
  - ابن علی

ذریات سید آل حسین بلگرامی بن سید محمد مرتضیٰ بلگرامی

- ابو محمد
  - مصطفیٰ حسین، مرتضیٰ حسین، وصی الحسین، محمد یحییٰ، ناصر حسین، ابن مرتضیٰ، عون محمد
- جان محمد
  - محمد مرتضیٰ
  - علی مرتضیٰ

صفیرؔ بلگرامی کی تاریخ وفات ۱۳۰۷ھ (شہر رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ) ہے۔
گوہر عشق کی کتابت کا سال ۱۲۷۵ھ (اگر تسلیم کرلیا جائے)، اگر ہے تو گویا مصنف کی وفات سے ۳۲ سال قبل اس نسخہ کی کتابت ہوئی۔ اس وقت صفیرؔ بلگرامی کی عمر ۲۵ سال کی تھی [1] اگر ۱۵ سال کی عمر سے شاعری کی ابتدا مان لی جائے تو ۱۲۶۴ھ سے ۱۲۷۵ھ تک گیارہ سال کی مدت میں

---

[1] حضرت استاد بڑے عالی خاندان من جانب الاب والام حسینی الحسنی نسلاً، دواسطی اصلاً بلگرامی وطن، قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد مسکن تھے، بتاریخ بست و ہفتم ذی قعدہ سنہ یک ہزار وصد و چہل دعدالت محلّہ بستی درگاہ حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب الملقب بہ صاحب البرکات قدس سرہٗ، سرکار خورد میں خلعت میلاد پہنا، اور نام تاریخ آپ کا شمس الضحیٰ رکھا گیا ۱۲۴۹ھ۔ شعر و سخن سے جناب صفیرؔ مرحوم کو نہایت نفرت تھی۔ یہاں تک کہ گلستاں کو بوستاں پر بہ سبب کمی کے ترجیح دیتے تھے بلکہ جب کوئی ہم مکتب آپ کا شعر و سخن کا نام لیتا تھا تو آپ رنجیدہ ہوتے تھے۔ مگر چودھویں برس بلا کسی کی تحریک کے طبیعت میں موزونی آئی۔ اور موزونیت کا سبب یہ ہوا کہ ایک بھائی کی شادی میں ناچ ہو رہا تھا کہ یکایک بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرائی، ولولہ پیدا ہوا محفل سے اٹھ کر گھر میں تشریف لے گئے اور دو زمینیں نکالیں اور دو زمینوں پر بارہ بارہ شعر تحریر فرمائے، جس میں موزونیت اور مطلع و مقطع یا معنی موجود ہیں مگر مضمون بہ سبب کم توجہی اور نہ ہونے مزاولت اشعار اساتذہ کے جو اس وقت کے مطابق تھے موزوں کئے۔
منتخب شعر از غزل اول بے اصلاحی: (مطلع)

ہم آج سے گھربار کے جایا نہ کریں گے — الفت سے اسے پاس بٹھایا نہ کریں گے

منتخب شعر از غزل اول بے اصلاحی: (مقطع)

مرجائیں گے بوسہ کے لیے لیک ہم اے قطب — سوگند قسم ہے کبھی کھایا نہ کریں گے

منتخب شعر از غزل دوم بے اصلاحی: (مطلع)

دُر گوش اپنا دکھلایا تو ہوتا — ذرا بجلی کو تڑپایا تو ہوتا

منتخب شعر از غزل دوم بے اصلاحی: (حسن مطلع)

دُر وند ان کو دکھلایا تو ہوتا — ذرا گوہر کو شرمایا تو ہوتا

چونکہ یہ ولولہ بغیر کسی کی تحریک کے پیدا ہوا تھا اس لیے پوشیدہ رکھا اور ۵، ۶ برس تک کسی کو اپنی غزل گوئی سے آگاہ نہ کیا...... ابتدائے ۱۲۶۴ھ لغایتہ ۱۲۷۰ھ یعنی سات برس کے عرصے میں آپ نے کئی تخلص بدلے۔ قطب، آثم، اثیم، صبا، نالاں، احقر، صفیر...... ساتویں تخلص کے بعد لوگوں کو آپ کا شعر کہنا معلوم ہوا، اور جب صفیرؔ مرحوم کے پھوپھا جناب سید محمد مہدی صاحب خبر بلگرامی مرحوم کو یہ خبر پہنچی تو کلام باغت نظام جناب صفیرؔ مرحوم کا منگا کر دیکھا اور اصلاح فرمائی......" (اقتباس از فسانۂ غمناک مولفہ شیخ محمد اسمٰعیل مہر آوری نسخۂ قلمی)

ایک طویل مثنوی کی تصنیف کا ہونا باعث تعجب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفیر بلبل پہلا دیوان ۱۹۸۰ء[۱] میں اور خم خانہ ۱۲۹۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئے۔ ان دواوین میں نہایت درجہ عمدہ اور پختہ کلام موجود ہے۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ گوہر عشق کا سال تصنیف ۱۲۷۵ھ سے بہت قبل کا زمانہ ہے۔ ممکن ہے ۱۲۶۴ھ سے ۱۲۷۰ کے درمیان جب صفیر ابتدائی مدارج کے دور سے گزر رہے تھے اور اپنا کلام کسی کو دکھانا عار جانتے تھے، اسی زمانے میں اس کی تکمیل کی ہو، کیوں کہ زبان و انداز بیان میں خاصی کمزوریاں موجود ہیں۔ واقعات کی ترتیب میں بھی الجھاؤ نظر آتا ہے۔ بعض مقامات پر تذکیر و تانیث کا فرق بھی مدنظر نہیں رکھا۔ مثلاً ع - اور گھبراتا وہ خود آراتھا : لڑکی کے لیے خود آرا اور گھبراتا تھا...... کی ترکیب محل نظر ہے۔ کہیں کہیں بازاری جملے اور الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً: ہیں یہ بھاری مال: اس سے قیاس یقین میں بدل جاتا ہے کہ صفیر بلگرامی کی یہ مثنوی قطعی ابتدائی مشق کی داستان ہے، یہاں تک کہ محمد اسمٰعیل مہر آروی نے فسانۂ غمناک میں تصانیف کی جو تفصیل پیش کی ہے، اس میں اس مثنوی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صفیر بلگرامی نے اس مثنوی کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس لائق نہیں سمجھا کہ اس کا شمار ان کی تخلیقات میں ہو۔ غالباً اسی لیے اپنی خودنوشت سوانح [۲] میں بھی اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی دوست احباب سے اس پر اظہار کیا۔ اگرچہ انہوں نے اردو اور فارسی میں کئی مثنویاں نظم کی ہیں [۳] جن کی تفصیلات کے علم کے بعد ان کی قادرالکلامی اور طبع موزوں و فکری بلندی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

مثنوی گوہر عشق میں تقریباً دو سو پچاس (۲۵۰) اشعار ہیں۔ پہلا شعر حمد باری تعالیٰ کے سلسلے کا ہے۔

---

۱ مطبوعہ در مطبع حیدری کشمیری کوٹھی پٹنہ سال ۱۲۸۰ھ دیوان کے آخر میں قطعات تواریخ طبع دیوان کے تحت حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کے ۲ قطعے فارسی بھی درج ہیں۔ کل ۱۳۶ صفحات کا دیوان ہے، جس میں تقریظ سے لے کر قطعہ تاریخ اور اشتہار وغیرہ بھی شامل ہیں۔

۲ خودنوشت سوانح عمری صفیر بلگرامی - مطبوعہ سہ ماہی اردو کراچی - جنوری ۱۹۶۶ء

۳ ''(۱) مثنوی در جواب گلزار نسیم (۲) مثنوی در معرفت (۳) مثنوی خوان یغما فارسی (۴) مثنوی دعوت احباب (۵) مثنویات اردو دیگر (۶) مثنویات فارسی دیگر۔'' (از فسانۂ غمناک مولفہ محمد اسمٰعیل مہر آوری)۔ ان کے سوا عبرت الناظرین اور سیر غازی پور و قند مکرر کے عنوان سے مثنویاں اور بھی ہیں، جن کا ذکر جناب مہر نے ان کے تصانیف کے ذیل میں نہیں کیا ہے۔ پھر بھی ۶۳ تصانیف صفیر بلگرامی کا ذکر فسانۂ غمناک میں موجود ہے۔

کیا کھلے حمد میں زبانِ قلم نہیں کافی یہاں بیانِ قلم

حمد کے ۵ شعروں کے بعد ختمی مرتبت احمد مرسل کی شان میں جو نعت ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:

نعت احمد بیاں میں کیا آئے جس کو حق اپنا دوست فرمائے

نعت کے سات شعروں کے بعد منقبت مولائے علی علیہ السلام ہے۔ منقبت کے ۶ شعروں کے بعد حسن و عشق کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے برتری اور بہتری پر ۱۴ اشعار میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کے بعد ''بیان حالِ خود'' کے تحت پہلا شعر یہ نظم کیا ہے۔

میں نے بھی جھیلی اک مصیبت ہے طبع کے واسطے ضیافت ہے

دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو:

دل جلوں کو میں خوب تڑپاؤں اس کہانی کا رنگ دکھلاؤں

۲۷ رشعروں کے بعد آخری ۲ شعروں میں حال دل اس طرح بیان کرتے ہیں:

گو بہت دیکھے ماجرے دل کے عمر بھر لاکھوں دکھ بھی ہیں جھیلے
تازہ احوال پر سناتا ہوں دل جلا ہوں تو دل جلاتا ہوں

تمہید کے ۵۹ شعروں کے بعد ''آغاز قصہ'' اس طرح کرتے ہیں:

ایک دن شاد شاد وقت سحر بیٹھا تھا ایک دوست کے گھر پر
چہلیں ہوتی تھیں غم گساروں میں قہقہے اڑ رہے تھے یاروں میں
حقہ پیتے تھے، پان چکھتے تھے غم نہ دونوں جہاں کا رکھتے تھے
سر رہ پر جو دوست کا تھا گھر سیر بازار بھی تھی پیش نظر
اتنے میں اک فنسِ نظر آئی آتے آتے وہ بس ادھر آئی
سامنے لائے اس کو جب کہ کہار فنسِ دیکھی تو تھی مرصع کار
کار چوبی تمام تھا پردا حسن والوں کا تھا سرا پردہ
ایک مہر و سوار تھی اس پر پائینچا نکلا پردے کے باہر
اک طرف گوشہ اک دو پٹہ کا رنگ وہ جس سے صاف دل میلا
سرخ اطلس کا پائینچا تھا تمام جس پہ سلمہ ستارے کا تھا کام
تھا دو پٹہ کا گوشہ زنگاری اور سنہری ٹکی بنت ساری
ظاہری دیکھا، اس طرح جو جمال دل میں سمجھا میں، ہیں یہ بھاری مال

ظاہراحسن کاری اور مہرو کی اداو چھب نے شاعر کو اس ''گل رخ'' کے حالات معلوم کرنے پر مجبور کیا، چنانچہ اپنے دوست کے نوکر کے واسطے سے ''سواری'' کا حال اس کی ''کہاری'' کے ذریعہ ''شتاب'' دریافت کر لینے کے بعد ''شاعر'' کی کیفیات سنئے:

مدتوں سے تھا گوش زد یہ حال — چھوٹے گو ہر بڑا ہیں رکھتے...... (مال؟)
مہ جبینوں میں ایک ہیں وہ بھی — سب حسینوں میں ایک ہیں وہ بھی
بڑی طرار، وضعدار ہیں وہ — سو ۱۰۰ میں اک، لاکھ میں ہزار ہیں وہ
بہت اچھا مزاج ہے ان کا — کوئی ثانی نہ آج ہے ان کا

ان تعریفی کلمات کے بعد یہ شعر ملاحظہ ہوں:

نکل آیا میں دیکھ کر باہر — پاس پہنچا تو بولا چلا کر
اِک نظر دیکھ لوں اگر تم کو — کام میرا ہو نام آپ کا ہو

اس التجا کے بعد:

سن کے پردا اٹھا دیا اس نے — حسن اپنا دکھا دیا اس نے
سارے خوبوں سے بڑھ کے پایا انہیں — کہیں سننے سے بڑھ کر پایا انہیں
قفس میں اک گلاب کو دیکھا — برج میں ماہتاب کو دیکھا
حسن ایسا کہ دل تمام کرے — صبح کو عاشقوں کی شام کرے

آخرش عاشقِ باصفا نے ''کہاری'' سے معاملہ طے کیا اور ''وصل یار'' کی خاطر ''اپنے باغ'' میں محبوب دل پسند کو دھوکا دے کر بلایا۔ اس تفصیل کی روداد بڑی دل چسپ ہے، اگرچہ طویل، پھر بھی کچھ اشعار دل پسند کے بعد معشوقہ کی داد فریاد اور روداد گریہ یوں بیان کی گئی ہے:

بولی ہیں! میں یہاں کہاں آئی؟ — مجکو اس جا 'کہاری' کیوں لائی؟
ڈال کر مجکو 'یاں' گئی وہ کہاں؟ — کیا کروں ہائے اے خدا اس آن؟
میرا بجلی سے جی دہلتا ہے — دل تڑپتا ہیں دم نکلتا ہے
ارے تو کون مردوا ہے بتا؟ — یہ مکاں اور یہ باغ ہے کس کا؟
کون لایا مجھے 'یہاں' بے جوڑ — گئی کیسی، کہاری مجکو چھوڑ
سب تو چل دیں، مجھی کو چھوڑ دیا — خوب مجھ سے کہاری نے یہ کہا
دیکھو، اس کو مزا چکھاتی ہوں — کیسے کیسے کنوئیں جھکاتی ہوں

ایک مردار ہے وہ شہکارا   نوج لاتی میں ایسی آوارہ

''معشوقہ'' کی اس گھبراہٹ، حیرانی اور پریشانی سے ''عاشق'' کا دل مضطرب ہو جاتا ہے اور وہ صدق دل سے جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے صفیر بلگرامی کی زبان سے سنیے:

مسکرا کر یہ میں نے، ان سے کہا   آپ گھبرا گئی ہیں، کیوں اتنا؟
اتنا گھبرانا محض بے جا ہے   یاں جو آئیں، مضائقہ کیا ہے؟
ہم تمہارے ہیں، گھر بھی آپ کا ہے   باغ کیا؟ دل، جگر بھی آپ کا ہے
شب اندھیری ہے اور دور مکان   گھر پہ اب آپ، جایئے گا کہاں!
لطف فرمایئے، تو بہتر ہے!   یہیں رہ جائیں تو بہتر ہے

دورانِ گفتگو میں بارش نے آ گھیرا اور محبّ و محبوب دونوں بھیگتے بھاگتے کمرے میں جا پہنچے۔ اس کیفیت کی منظر کشی قابل داد ہے:

خوف گھر کا لگا جو دل سے تھا   سب عیاں شکل مضمحل سے تھا
پانی جس جس طرح برستا تھا   اور گھبراتا، وہ خود آرا تھا
کبھی کہنا کہ کیوں میں آئی تھی؟   کبھی کہنا ''کہاری' لائی تھی
کر کے دل میں خیال گھر کا کبھی   تھر تھرا، جانا ان کا ڈر کے کبھی
کبھی کہنا یہ کیسی آفت ہے   گھر گئی کیسی، میں، قیامت ہے
ہائے کیا چھاجوں، مینھ برستا ہے   کیسے گھر جاؤں؟ بند رستا ہے

کوئی شریف زادی اور پاک باطن لڑکی جب کسی آفت کا شکار ہو جاتی ہے تو اس کے جذبات کی عکاسی آسان بات نہیں ہوتی صفیر بلگرامی کا کمال یہ ہے کہ وہ لڑکی کے جذبات سے اسی طرح داخلی وخارجی طور پر متاثر ہو کر زبانِ حال سے اس کی داستان بیان کر رہے ہیں، جس کی وہ مستحق ہے۔ چنانچہ جزئیات و کیفیات تک کا بیان کرنا، انہوں نے ضروری سمجھا ہے۔ اس بے بسی میں ''خود آرا'' کی زبان سے کہاری کے لیے جو گالیاں اور فحش کلمات ادا کروائے ہیں وہ بھی داستان گو کا کمال ہے۔ اور جب ''خود آرا'' نے خود ''عاشق'' سے کلام کرنا منظور کر لیا ہے تو اس کا طرز خاص ہی اور ہو جاتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہہ کے یہ مجھ سے اس طرح بولی   آپ سے عرض کرتی ہے بندی
اپنے گھر میں مجھے مقام دیا   بڑا احسان تم نے مجھ پہ کیا

مینھ ہے اس وقت تھم گیا، کچھ کچھ آسماں صاف ہے ہوا، کچھ کچھ

یہاں رہنے سے حول کھاتی ہوں میں بس اب اپنے گھر کو جاتی ہوں

مشرقی لڑکی، نا کتخدا، موسم برشگال میں گھر گئی ہے، گھر سے جدائی اور بھری برسات کی رات، تنہائی، غیر مرد کا ساتھ، خوف اسے کھائے جارہا ہے۔ بُرے وقت سے اسے لرزہ آرہا ہے، اپنی آبرو کا ہر لحہ اسے دھیان ہے، ڈر اور رسوائی کا خوف اس کے جذبات فاسد پر غالب ہے۔ اسی عالم میں اس کی زبان پر یہ کلمات آتے ہیں:

اتنی تکلیف اور ہوگی مگر روشنی ساتھ ہو تو بہتر ہے

کہا میں نے کہ یہ تو ہے کیا چیز جان تک بھی نہیں ہے تم سے عزیز

''غیر مرد'' کے منہ سے ایسی باتیں سن کر ''مہرو'' ناراض ہو جاتی ہے اور صاف گوئی و بے خوفی سے کام لے کر اپنا مدعا بیان کر دیتی ہے جسے صفیر بلگرامی نے اپنے شاعرانہ تخاطب وکمال سے اس لڑکی کے منہ میں جو زبان دے دی ہے، وہ اگر چہ خالص تہذیبی اور مشرقی ہے، لہجہ بھی ذرا تیز محسوس ہوتا ہے مگر رکھ رکھاؤ اور بھرم باقی رکھنا انہوں نے فراموش نہیں کیا ہے۔ حالانکہ مثنوی گوہر عشق کی ترتیب یقیناً ۱۵ سے ۲۰ سال کی عمر میں انجام پائی ہے اور ان کے استاد اولین حضرت خبر بلگرامی کی نظر سے یہ کلام نہیں گزرا ہے۔ مرزا دبیر لکھنوی، حضرت سحر لکھنوی اور حضرت غالب سے تلمذ تو بہت ہی بعد کی بات ہے۔ ابتدائی مشق کلام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مثنوی کی زیادہ شہرت نہیں ہوئی اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ مثنوی گلزار نسیم اور سحر بیان کے مطالعہ نے اس کی طرح ڈالی ہوگی مگر بعد میں ان کی بالغ نظری نے کم قیمت اور نقص سے پر قرار دیا، اس لیے انہوں نے اپنی مثنوی کو اپنے کلام سے خارج قرار دے دیا۔ بہر حال، مہرو کی زبان سے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

میرا صاحب سوال اور ہی ہے آپ کو کچھ خیال اور ہی ہے

مجھ سے باتیں نہ ایسی رکھئے آپ بس زیادہ نہ اب بہکیے آپ

گفتگو کچھ اور رُخ اختیار کرتی ہے۔ آخر وہ صاف صاف کہہ گزرتی ہے اور اعلانِ عام سے کام لیتی ہے:

اچھا احساں نہ آپ کا لوں گی خیر اندھیارے میں ہی جاؤں گی

مہرو کی خفگی اور غصہ کی حالت، مہر و وفا، لاگ لگاؤ، الفت، انسیت، اور محبت کی باتوں کا ذکر وہ مقامات ہیں، جن سے مثنوی میں جان نظر آتی ہے۔ مگر زمانہ کب ''محبت''

کرنے والوں کا ساتھی ہوتا ہے۔ آخر بات ہجر و فراق کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور شاعر کو یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ زمانے کے ستم اور دوستوں کی بے وفائی نے یہ ستم ڈھایا:

وائے کج خلقی اور نادانی ہو گئے میرے دشمنِ جانی
دل کو اندوہ میں اسیر نہ کر رنج اس بات کا صفیرؔ نہ کر

مثنوی گوہر عشق کے کل ۱۲۵۰ اشعار ہیں اختتامیہ صفحہ پر یہ عبارت درج ہے:

''تمت بالخیر گوہر عشق مصنفہ میر فرزند احمد صفیرؔ بتاریخ ۱۸؍ ذی قعدہ از دست و قلم بندہ سید محمد رضی بپاس خاطر برادر عزیز از حیان سید محمد مرتضیٰ سلمہ اللہ تعالیٰ صورت انجام پذیر رفت۔ امید از ناظرین ایں کہ ہر جا کہ غلطی یابند...... عفو بو سند......''

مثنوی کے ابتدائی صفحہ سے قبل یہ عبارت بھی موجود ہے:

''نسخہ گوہر عشق بتاریخ ۱۵ شہر ذی قعدہ مصنفہ میر فرزند احمد صفیرؔ شروع کردم۔ اللہ تعالیٰ نے بانجام خیر تمام گردانذ۔''

اس امر کی شہادت تو نہیں ملتی کہ سید محمد رضی صاحب بلگرامی نے کس سال میں اس نسخہ کی کتابت کی تھی؟ (اگرچہ مہینہ اور تاریخ کا اندراج موجود ہے) جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ نسخہ کی کتابت مصنف کی زندگی میں ہوئی یا بعد میں لیکن مثنوی گوہر عشق کے بعد حکیم تصدق حسین خاں شوق لکھنوی کی مثنوی فریب عشق کی نقل بھی سید محمد رضی صاحب بلگرامی نے جدی سید محمد مرتضیٰ صاحب بلگرامی کی ''خاطر'' کی تھی۔ اختتامیہ صفحہ پر تاریخ ۲۰؍ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ مرقوم ہے۔ یعنی ۱۹؍ ذی قعدہ کو اگر مثنوی گوہر عشق کی کتابت کا انجام پانا تسلیم کر لیا جائے، تو ۲۰؍ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ سے مثنوی فریب عشق کی کتابت شروع کی گئی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ دونوں مثنویوں کا اندازِ خط، روشنائی، کاغذ، مسطر بھی ایک ہے۔ اس لیے یہ بات درجہ یقین کو پہنچ جاتی ہے کہ گوہر عشق کی کتابت کا سال بھی ۱۲۷۵ھ ہے۔ اس طرح یہ نادر و نایاب نسخہ جس کا ذکر خود مصنف نے نہیں کیا ہے، اس کی اپنی زندگی کا کتابت شدہ ثابت ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کی کتابت و نقل کے ٹھیک ۵ سال بعد ۱۲۸۰ھ میں کشمیری کوٹھی پٹنہ مطبع حیدری سے جس کا نام (صفیر بلبل) کے صفحہ ۱۳۳ پر مطبع عظیم الطابع عظیم آباد واقع کشمیری کوٹھی بھی درج ہے، یہ مجموعہ حضرت شاہ حفاظت حسین مطیر عظیم آبادی شاگرد صفیرؔ بلگرامی کی سفارش پر (ابتدائی مجموعۂ کلام) صفیر بلبل کے نام سے طبع ہوتا ہے اور اہل زبان و شاعران بے بدل سے داد کا مستحق قرار پاتا ہے۔ چند اشعار صفیرؔ

بلبل سے یہاں نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

منہ دیکھ کر میں قتل کے ارماں میں رہ گیا — خنجر اُلجھ اُلجھ کر، گریباں میں رہ گیا
محفل میں اس کی آئے بھی لوگ اور چلے گئے — میں نامراد منت درباں میں رہ گیا
مجنوں غریب چل نہ سکا راہ عشق میں — نکلا جو شہر سے تو بیاباں میں رہ گیا

....

ملتی لذت مجھے کچھ اور بھی ہر زخم کے ساتھ — حیف ہے ہاتھ میں قاتل کے نمکداں نہ ہوا

....

جاتا ہوں صفیرؔ ان کی گلی میں تو وہ ہنس کر — فرماتے ہیں وہ آتا ہے مجذوب ہمارا

....

سفاک نے پہنائیں جو زخموں کی بدھیاں — گردن میں ہاتھ میں نے بھی بس ہار کر دیا

....

چہرے پر اُن کے گیسوئے پرخم بکھر چکا — لو دود شمع، کو، بے نور کر چکا

....

ہم وہ ہیں جس کے واسطے پھرتے ہیں روز و شب — افلاک، ابر، ماہ، ہوا، اختر، آفتاب

....

ہونٹ ان کے یاد آ گئے دیکھا جو ماہ عید — پڑھنے لگا میں محو دُعائے ہلال لب
تقریر شستہ ہو، یہ ہے لطفِ زباں صفیرؔ — لفظیں صحیح نکلیں، یہی ہے کمال لب

....

میں وہ مجنوں ہوں زمانے میں پریشاں خاطر — دوش پر رہتا ہوں معشوقوں کے گیسو ہو کر

....

آرسی دیکھ کر یہ وصل میں کہنا اُن کا — دیکھو تو ہو گئے نیلے مرے سارے عارض

....

مجھ کو بھی یاد آ گئیں وحشت کی گردشیں — اک وجد آیا گردش گردوں کو دیکھ کر

....

خدا کا قہر ہو ساقی تری رکاوٹ پر — ہزاروں خون ہوئے آج ایک تلچھٹ پر

....

تو بھی جل جائے گی بعد ان کے، رہے یاد اے شمع　　گرم بازاریاں سب تیری ہیں پروانوں تک

....

تو نے تو بڑھ کے خاک میں مجکو ملا دیا　　اے آرزوئے دل تو ہی مل جائے خاک میں
رنگ تازہ لائی، پھر باد بہاری ان دنوں　　پھر قبا پارینہ پھولوں نے اتاری ان دنوں
ان کو غیر آراستہ کرتے ہیں، میں حیراں ہوں　　مجکو دی ہے خدمت آئینہ داری ان دنوں

....

وہ محبت، وہ مروت، نہیں پاتے ہیں صفؔیر　　دل احباب میں اب ہم جو گزر کرتے ہیں

....

بار ہا کی بھلائی ان سے صفؔیر　　جو ہمیں اب برا سمجھتے ہیں

....

کل جو اٹھتے تھے بٹھانے کے لیے　　آج بیٹھے ہیں، اٹھانے کے لیے

....

حال پر اپنے نہ رویا کوئی　　روئے ہم سارے زمانے کے لیے

....

صفؔیر بلگرامی کے ان اشعار میں جو تازگی، شعریت، معنویت، اختصار جذبات نگاری، احساس، اور شعوری پختگی ملتی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مثنوی گوہر عشق میں زبان و بیان اور ادائے مطلب میں جو خامیاں ہیں، وہ ابتدائے کلام کی بات ہی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اصل نسخہ گوہر عشق کا اگر حاصل ہو جائے، تو بڑی بات ہو، یا خدا کرے کسی علمی ذخیرے میں اس کا کوئی اور نسخہ بھی موجود ہو، جس سے سال تصنیف کا درجہ متعین کرنے میں مدد مل سکے۔ بہر حال، یہ دریافت نو صفؔیر بلگرامی ہی کے کلام کے ساتھ اردو دنیا کی خدمت میں پیش ہے۔

ہاتھ میں سلسلۂ زلفِ چلیپا لے لو
اے صفؔیر آئے ہو بازار میں سودا لے لو

☆☆☆

گاؤتکیہ

غالب دہلوی کے شاگردوں میں خاندان بلگرام کے دو شاعروں کا نام ملتا ہے۔ ایک سید غلام حسنین قدر بلگرامی دوسرے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ اتفاق سے دونوں کے سال پیدائش (صفیر بلگرامی کی پیدائش کا مادۂ تاریخ شمس الضحیٰ کے اعداد میں پوشیدہ ہے اور تاریخ وفات ''شہر رمضان المبارک سے نکلتی ہے) کی تاریخ بھی غلام حسنین کے اعداد میں مضمر ہے۔ صفیر بلگرامی کا یہ تاریخی نام صاحب عالم صاحب مارہروی نے رکھا تھا، جو صفیر کے نانا اور غالب کے مرشد خاص اور محبّ خاص تھے۔ صفیر بلگرامی ۹ر اپریل ۱۸۳۴ء کو مارہرہ ضلع ایٹہ (یوپی) میں اپنے نانا صاحب عالم صاحب کی آغوش میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۱ر مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ) کو عظیم آباد (بہار) میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ نعش آرہ ضلع شاہ آباد لا کر آغوش لحد کے سپرد کر دی گئی۔ بہت سے شاگردوں اور اُردو دوستوں نے قطعات نظم کیے۔ شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے استاد کی وفات پر یہ شعر کہا:

اے شاد تم تو روتے تھے نکہت کے واسطے
اے لو، عدم کو آج سدھارے صفیر بھی

شاد کو سید حامد حسین نکہت عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ استاد کی وفات پر شاد کا رونا جائز تھا۔ اس زُمرے میں شاد کے دوسرے استاد صفیر بلگرامی تھے جس کی جدائی پر بھی شاد کا ملال کرنا جائز تھا۔ گویا دو اساتذہ کا فراق شاد کو شاق گزر رہا تھا۔ یعنی اگر صفیر بلگرامی استاد شاد نہ ہوتے تو نکہت کا مقابلہ شاد نہ کرتے۔ ٹھیک ہے نا؟

لیکن شاد نے افضل الدین خاقانی، شریف، بساط، مومن دہلوی، سکندر شاہ جہانپوری اور فخر الدین سخن کی طرح بغاوت کی اور شاگردی سے انحراف کیا۔ اگر چہ شاد نے یہ جسارت تو نہیں کی کہ ''صفیر بلگرامی کو اپنا شاگرد بتایا ہو'' مگر سخن نے روایت پرستی کو ذرا اور آگے بڑھایا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مرقع فیض تذکرہ شاگردان صفیر بلگرامی مطبوعہ ۱۲۹۵ھ مطبع نور الانوار آرہ، مولفہ

نواب سید تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا، تخلص سلطان (مرقع فیض مؤلفہ سلطان عظیم آبادی مطبوعہ ۱۲۹۵ھ ص ۳۵۔۳۶) میں درج ہے۔

سخن، خواجہ فخر الدین لکھنؤ نسل، دہلوی اصل، خلف حضرت فقیر صاحب سجادہ نشین، مقام لکھنؤی، یہ آرہ میں مرزا محمد صدیق صاحب کے بڑے بیٹے مرزا ابراہیم، صاحب کی دختر سے منسوب ہوئے تھے۔ اس سبب سے بعد غدر، ۱۲۷۵ھ میں ان کا (آرہ) آنا ہوا۔

عید کے دن (یکم شوال ۱۲۷۵ھ مطابق ۴ مئی ۱۸۵۹ء حضرت صفیر مرزا ابراہیم صاحب کی ملاقات کو گئے، مرزا صاحب نے خواجہ صاحب (سخن) سے کہا کہ آپ سے ملیں۔ بعد بغل گیر ہونے کے فرمایا کہ یہ خواجہ فخر الدین صاحب لکھنؤ سے میرے یہاں منسوب ہوئے ہیں۔ پھر خواجہ صاحب سے مخاطب ہو کر بولے یہ میر صفیر صاحب رئیس بلگرام اور بڑے شاعر ہیں۔ خواجہ صاحب نے مخاطب ہو کر اساتذہ کے شعر پڑھے اور حضرت استاد سے پڑھوائے۔

اسی طرح دو چار ملاقاتوں کے بعد ایک دن خواجہ صاحب نے کہا کہ میں ایک قصہ لکھنا چاہتا ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ مجھے شاگرد بنایئے اور اس میں مدد کیجیے۔ حضرت استاد (صفیر بلگرامی) نے کہا کہ بسم اللہ غرض قصہ سروش سخن کی بنا پڑی......" مرقع فیض کی اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) صفیر بلگرامی اور سخن میں اول ملاقات عید کے دن (۱۲۷۵ھ) بر مکان مرزا محمد صدیق و مرزا ابراہیم آرہ میں ہوئی۔ (۲) سروش سخن کا آغاز اس پہلی ملاقات کے بعد ہوا۔ اس لیے سروش سخن کے آغاز کی تاریخ ۱۲۷۶ھ ہے نہ کہ تاریخ طبع۔

دراصل ۱۲۸۸ھ میں جب شاد عظیم آبادی نے صفیر بلگرامی کی شاگردی سے انحراف کیا تو سخن نے شاد کا اس طرح ساتھ دیا کہ صفیر کی شاگردی سے خود بھی انحراف کر بیٹھے اور ۱۲۹۵ھ میں جب اس انحراف کی زد میں مرقع فیض شائع ہوا تو خواجہ فخر الدین سخن نے دعویٰ کیا کہ خود صفیر بلگرامی ہمارا شاگرد ہے، اور قابل تنبیہ ہے۔ چنانچہ ۱۲۹۶ھ میں ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے تنبیہ صفیر بلگرامی وجود میں آئی، شیخ محمد علی شمشاد نے تاریخ کہی:

سر دفتر شاعراں نامی ہے سخن   محسود ظہیر و رشک جامی ہے سخن
شمشاد سر دل سے لکھ یہ تاریخ   استاد صفیر بلگرامی ہے سخن

۱۸۷۴

سر دل: ۴

۱۸۷۸ عیسوی

تنبیہ ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوئی تھی۔ جس کا نظری خاکہ یہ ہے:

''تنبیہ'' صفیر بلگرامی مطبوعہ ۱۲۹۶ھ مطبع محمدی پٹنہ صفحات ۱۲۸

سرورق: ماشاءاللہ

بعون خالق ارض وسماء فضل خلاق زمین وزماں کے چشم بد دور

ایں نثر مرات نام نامی تنبیہ صفیر بلگرامی

باریاب سخن مطبوع باد

مطبع محمدی پٹنہ میں بہ اہتمام سید محمد فضل کریم لکھنوی کے چھپی۔ سخن نے مرقع فیض کی مندرجہ بالا عبارت کے ضمن میں جو جواب دیا ہے (ا-تنبیہ صفیر بلگرامی، ص۔ ۷۷/۷۹ مطبوعہ ۱۲۹۶ھ مطبع محمدی پٹنہ) وہ ملاحظہ ہو۔ سلطان عظیم آبادی نے شائستگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے مگر سردار مرزا یا سخن نے جو لہجہ اختیار کیا وہ اخلاقی اعتبار سے بھی قابل گرفت ہے:

یہ واقعہ ملاقات محض غلط۔ بلکہ پہلی ملاقات کی حقیقت یہ ہے کہ .... ''خواجہ صاحب (سخن) جناب تقدس مآب مولوی سید امداد علی خاں صاحب بہادر کی ملاقات کو بہ محلّہ مہادیوا ایک روز تشریف لے گئے تھے۔ وہاں آپ (صفیر بلگرامی) بھی تشریف لائے۔

جب خواجہ صاحب اٹھے تو آپ (صفیر بلگرامی) بھی ہمراہ ہوئے۔ میں بھی (فرضی شخص سردار مرزا) ہم رکاب جناب خواجہ صاحب کے تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنے خلق عمیم سے آپ کا اسم مبارک پوچھا آپ نے جواب دیا کہ میرا نام نہ پوچھئے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کیوں؟ آپ نے کہا عرض کرتا ہوں۔

پھر آپ نے اپنا نام مبارک شروع کیا۔ فہ فہ چند بار کہہ کر چپ ہو گئے۔ خواجہ صاحب کو ہنسی آئی۔ مگر ہنسی کو ضبط کیا اور خاموش رہے اور آپ کی جانب دیکھنے لگے۔ آپ (صفیر) نے بھی نام اپنا شروع کیا۔ پھر چپ ہو گئے۔ اور غصہ سے منہ آپ کا لال ہو گیا۔

پھر کچھ دیر کے بعد جھلا کے آپ نام اپنا رے تک نکال لائے۔ مگر پھر بھی نہ ادا ہوا۔ یہاں تک کہ دم آپ کا چڑھ گیا۔ اور پورا نام نہ نکل سکا۔

جب تو خواجہ صاحب دل میں مارے ہنسی کے لوٹ گئے مگر بہ ظاہر مسکرا کر انہوں

نے آپ سے فرمایا کہ یہ آپ کو کیا ہو گیا۔ تامل فرمائیے۔ جلدی نہ کیجئے۔ ٹھہر جائیے۔ آخر آپ نے بات بھی نہ کی اور پھر غصہ میں آ کر نام کو شروع کیا اور بہت مشکل سے فرزند احمد کہہ کر خاموش ہو گئے۔

غرض یہ نام مہادیوا سے شروع ہوا اور مہاجن ٹولی کے پاس آ کر تمام ہوا۔ وہ بھی اس طرح پر کہ خواجہ صاحب نے اچھی طرح سنا بھی نہیں۔ آخر آپ (صفیر بلگرامی) رخصت ہو کر کان دبائے گھر تشریف لے گئے۔

یہ قصہ ہے آپ کی اور خواجہ صاحب کی پہلی ملاقات کا۔ اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

۱- صفیر بلگرامی کان دبائے اپنے گھر گئے۔ اس انداز سخن کو یقیناً پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔

۲- مہادیوا سے مہاجن ٹولی تک صفیر بلگرامی کی زبان سے صرف فرزند احمد ادا ہو سکا۔ حالانکہ ان دونوں محلوں میں تقریباً چوتھائی میل کا فاصلہ ہوگا۔ آرہ ریلوے اسٹیشن سے جو سڑک شہر کو آتی ہے۔ وہ محلّہ مہادیوا ہوتی ہوئی مہاجن ٹولی نمبر ا اور پھر مہاجن ٹولی نمبر ۲ کو جا کر اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ مہاجن ٹولی نمبر ۲ میں صفیر بلگرامی کا گھر اور چھاپہ خانہ نورالانوار واقع تھا۔ اسی گھر کا کچھ حصہ بعد میں بلگرام منزل کے نام سے مشہور ہوا اور آج تک مشہور ہے۔

۳- صفیر بلگرامی نے جن مقتدر حضرات سے ملاقات کی، ان میں مرزا دبیر لکھنوی، بحر لکھنوی، غالب دہلوی کے نام سر فہرست رکھے جا سکتے ہیں۔ ان سب سے صفیر کو شرف تلمذ حاصل تھا۔ اور خود صفیر کے جتنے شاگرد ہوئے ان میں شاد، سلطان اور اسمٰعیل مہر آروی وغیرہ مشہور ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے یہاں یہ انداز تخاطب نہیں ہے اور نہ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صفیر بلگرامی پر لکنت کا اس قدر غلبہ تھا کہ چوتھائی میل تک اپنا نام بھی ادا کرنے سے قاصر تھے۔

۴- دل میں مارے ہنسی کے لوٹ گئے (ا-تنبیہ، ص ۹۷) مگر بہ ظاہر مسکرا کر انہوں نے فرمایا۔ ہمزاد نے بہزاد کے دل کی ہنسی جان لی مگر صفیر کی مشکل کا احساس نہ کر سکا۔

۵- کیا سید امداد علی خاں صاحب بہادر پر فرض نہ تھا کہ وہ اپنے شہر کے ایک مقتدر شخص کی سخن سے ملاقات کا وسیلہ بن کر قرآن السعدین کا شرف حاصل کرتے؟

۶- خواجہ صاحب اٹھے تو آپ (صفیر بلگرامی) بھی ہمراہ ہوئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ صفیر خواجہ صاحب کے ہمراہ کیوں ہوئے۔ ممکن ہے شاگردی اختیار کرنے کی فکر رہی ہو اور عرض

مدعا کے لیے موقع کی تلاش میں ساتھ ہو لیے ہوں۔ حالانکہ اس وقت تک خود صفیر کے سینکڑوں شاگرد موجود تھے اور اہل علم کی نگاہوں میں ان کا خاص درجہ تھا۔ تذکرہ، سوانح، تاریخ، علم عروض اور تذکیر و تانیث پر کتب مرتب کر چکے تھے، مشاعروں میں شرکت کے لئے آرہ، پٹنہ، مظفر پور اور دیگر مقامات پر بہت اعزاز سے بلائے جاتے تھے اور ان کی شرکت کو لازمی قرار دیا جاتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ جو شخص (صفیر بلگرامی) ''ہمراہ'' ہو اوہ خواجہ صاحب کے ''اسم مبارک'' پوچھنے پر خفا بھی ہوتا اور یہ جواب دیتا ہے کہ:

''میرا نام نہ پوچھیے ...... یہاں تک جھلائے ......اور کان دبا کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔''

اس داستان سرائی کی داد ممکن نہیں ہے۔ کسی نے آج تک ایسا شخص دیکھا یا سنا نہ ہوگا جو چوتھائی میل تک اپنا نام بھی نہ لے سکے! اس ملاقات کے وقت صفیر بلگرامی عمر کی اس منزل میں تھے جب شباب دواع کہہ رہا تھا، بڑھاپا اپنا دامن پھیلائے سایہ فگن تھا، زندگی کی کم و بیش ۴۵ کڑیاں گزر چکی تھیں اور زندگی کی عمارت خستگی کی زد میں آچکی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے ٹھیک ۱۱ سال بعد ۱۳۰۷ھ میں اس ''الکن'' نے قضا کیا۔ لیکن ستم بالائے ستم دیکھئے کہ اس داستان کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور ۱۲۹۶ھ سے ۱۳۵۰ھ تک جا پہنچا۔ تفصیل اس کی تلخ ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ صوبہ بہار میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کی قدر نہیں کی گئی۔ اہل بہار نے ان کو اہل یو. پی سمجھا اور اہل یو. پی نے انہیں اہل بہار جانا۔

بقول شاعر:

زاہد خشک یہ سمجھا کہ کافر ہوں میں
اور کافر نے یہ جانا کہ مسلماں ہوں میں

بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ شاد اور صفیر کے معاملہ میں غیر جانب داری سے کام نہیں لیا گیا ورنہ صفیر کا شاد جیسے شاعر کا استاد ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اقبال کی اہمیت اور ان کی شخصیت کو داغ کی شاگردی سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ داغ سے اقبال نے اصلاح ''برائے گفتن'' ہی لی تھی۔ مگر اہل پنجاب یا خود اقبال نے کبھی بھی اہانت نہیں محسوس کی۔ پھر حامیان صفیر کو اس حق گوئی کو برا کیوں تصور کیا جائے۔ لیکن اس انحراف کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، چنانچہ تاریخ شعرائے بہار (تاریخ شعرائے بہار، جلد اول) مولفہ

سید عزیز الدین بلخی متخلص راز۔ مطبوعہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء۔ قومی پریس بانکی پور۔ پٹنہ صفحات ۱۲۶/۱۳۱) میں صفیر بلگرامی کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے۔

مشہور ہے کہ ان کی زبان میں لکنت بے انتہا تھی، جس کے باعث مشاعروں میں پڑھتے وقت بعض اوقات کسی لفظ کا پہلا حرف کہتے کہتے لیٹ جانے کی نوبت آجاتی تب وہ پورا لفظ ادا ہوتا ہے۔ اسی خیال سے عموماً پشت کی جانب گاؤ تکیے لگا دیے جاتے تھے......"

لکنت کی منظر کشی کی تکمیل کے لئے:

۱- پہلی بار ۱۲۹۶ھ میں صفیر بلگرامی کو آرہ میں مہادیوا سے مہاجن ٹولی تک چوتھائی میل چلنا پڑا۔ پھر بھی اپنا نام زبان سے ادا نہ کر سکے۔

۲- چوّن سال بعد ۱۳۵۰ھ میں مشاعرہ میں صفیر بلگرامی کی پیٹھ سے گاؤ تکیہ بھی لگا دیا گیا۔

اس گاؤ تکیہ کا ذکر تلامذہ غالب (تلامذہ غالبؔ مولفہ مالک رام۔ مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دلّی) مولفہ مالک رام میں بھی ان الفاظ میں ملتا ہے:

"صفیر کی زبان میں لکنت تھی۔ جس سے بزم مشاعرہ میں پڑھنے سے انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ بعض اوقات پڑھنے میں سانس پھول جاتی اور لیٹ جانا پڑتا تھا۔ اس لیے بالعموم ان کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا دیا جاتا کہ اس کے سہارے آرام سے بیٹھ سکیں۔"

صفیر کی زبان میں اس قدر لکنت کی بات تنبیہ صفیر بلگرامی تاریخ شعرائے بہار سے شروع ہوئی تھی۔ غالباً مالک رام صاحب نے بھی انہی کی بنیاد پر صفیر کی زبان میں لکنت کا ہونا لکھا ہے حالانکہ پہلے پہل ان کی لکنت کا ذکر جن حالات میں کیا گیا ہے ان سے نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مالک رام صاحب نے تلامذہ غالب ہی میں صفیر بلگرامی کو غالب کی وفات کے بعد قدر بلگرامی کا شاگرد بھی لکھا ہے۔ مگر حوالہ نہیں ہے۔ بہر حال صفیر بلگرامی نے شاید ان ہی حالات سے جن سے انہیں دوچار ہونا پڑا متاثر ہو کر کہا تھا۔ (گلدستہ جلوۂ سخن، مدراس، جنوری ۱۸۸۸ء باہتمام سید علی قادری بہار)

نظر نے، پلکوں نے، ابرو نے، ساتھ قتل کیا
ہمارے خون کا ساماں جو تھا وہ مل کر تھا

اس تفصیل در تفصیل کے بعد سوال یہ ہے کہ صفیر کی ملاقات غالب دہلوی، مرزا دبیر

اور بحر وغیرہ اساتذہ سے بھی تھی۔ مگر کسی موقع پر بھی صفیر کی اس ہیئت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ سوائے بلخی اور مالک رام کے۔ آخر کیوں؟

یہ درست ہے کہ صفیر کے یہاں لکنت تھی، مگر نہ اس حد تک کہ وہ کام نہ کر سکتے ہوں اور اپنا کلام پڑھتے وقت مشاعرہ میں گاؤ تکیہ لگاتے ہوں۔ گاؤ تکیہ تو آج بھی ہر مشاعرہ میں زیب فرش کے بہ طور رکھا جاتا ہے۔ تو کیا ہر شاعر الکن ہے؟ دراصل صفیر بلگرامی کی ادبی شخصیت واہمیت کو نظر انداز کرنے کے لئے اہل بہار نے ایسے درجے تراشے اور اس کی شہرت کو روا جانا۔ واقعہ ہے کہ وہ الکن تھے۔ ان ہی کی طرح، ان کے پوتے سید وصی احمد فانی بلگرامی بھی الکن تھے مگر ہر مجلس کی جان تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ہوں یا نیاز فتح پوری اور اکبر الہ آبادی نے بھی فانی بلگرامی کو الکن ہونے پر قباحتی جملہ ادا نہ کیا۔ مگر صفیر بلگرامی کی شخصیت مجروح کرنے کی خاطر یہ وضع نکالی گئی۔ بہرکیف۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

☆☆☆

آرزو بلگرامی ...... صفیر بلگرامی

(خط کے آئینے میں)

حضرت سید صاحب عالم بلگرامی ثم مارہروی صاحب تخلص سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ معاصر غالب دہلوی کے نواسے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ خود اپنے متعلق ان کا مشہور شعر ہے:

مُولد و مسکن وطن ہے اے صَفیر۔ تین جا، مارہرہ، آرہ، بلگرام

علمی اعتبار سے آپ کا درجہ بلند اور فکری قدروں سے ممتاز تھا۔ مثنوی، مراثی، قصاید، غزلیات اور نقد و تاریخ سے متعلق طویل فہرست آپ کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ اس کے سوا کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر ظفر اوگانوی صاحب نے اپنا پی. ایچ. ڈی. کا تحقیقی مقالہ پیش کر کے بہت سے پوشیدہ گوشے بے نقاب کیے ہیں، اور صفیر بلگرامی کی علمی صلاحیت کی کلی نشان دہی کی ہے۔ پھر بھی بہت سی تخلیقات صفیر ابھی گم شدہ ورق بنی ہوئی ہیں۔ چنانچہ صفیر بلگرامی کا یہ طویل خط، جس کے چند اہم اقتباسات ہدیہ ناظرین کیے جا رہے ہیں ان ہی تخلیقات کا ایک حصہ ہیں۔

سب سے پہلے آرزو بلگرامی کا خط ملاحظہ ہو:

جناب صفیر، تسلیم، مزاج شریف، بندگی، حضرت بندگی، آپ کی دعا سے، اس جملۂ مہملہ کو یوں معنی پہناتا ہوں کہ آپ تو اس عریضہ اور اس تسلیم کا اور مزاج شریف کا جواب دیں گے نہیں، لہٰذا بمصداق:

ازمن بمن سلام وہم ازمن بمن پیام رنج دلی مباد، پیام و سلام را

خود ہی سلام کہا اور خود ہی جواب دے لیا، خود ہی دعا کہہ لی، آج دو پہر کا وقت، دھوپ کی شدت، گرمی کا تراقہ۔ لون کا زور شور، بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا، رشحات صفیر دیکھنے لگا، اس کتاب کا کیا کہنا، اگرچہ کلیتاً تانیث تذکیر کے قواعد کا انضباط بہت دشوار ہے، تاہم آپ نے خوب ہی قواعد منضبط فرمائے۔ مگر ساتھ ہی اس کے ایک بہت رستخیز یہ کر دیا ہے کہ دہلی اور

لکھنؤ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔

اسی طرح یہ کہ طپش میرٹھی کو بھی مستند ٹھرایا ہے۔ حالانکہ خود آپ اختلاف دہلی اور لکھنؤ کے قابل ہوئے ہیں۔ دیکھئے صفحہ ۱۴۵ رشحات صفیر، درحالہ کہ اختلاف مابین دہلی و لکھنؤ مسلم ٹھراتو مقلدین لکھنؤ کو مجرد دلی والوں کی تانیث و تذکیر پر بھروسا کرنا کب رَوا ٹھرا۔ مگر کیا کیجئے: حب الشئ لعم ولعم۔ (کذا) آپ کو اور جناب قدر کو مرزا غالب صاحب کی محبت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے جیسا قوم نصیری کو حُب علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے۔

حالانکہ میرا بھی اعتقاد ہے کہ مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہل ہند سے بہتر ہیں۔ مگر اُردو میں تو ایک مبتدی لکھنوی کے مقابل نہیں: کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ: ملاحظہ وانصاف طلب ہے۔ اگر نقص اس کتاب میں ہے، تو یہی ہے، مجھ کو یہ بھی آپ کے اور جناب قدر کی طرف سے احتمال ہے، عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایہ سے داخل کردیے جائیں۔ میری اس ناقص رائے سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مرزا صاحب کا غیر معتقد ہوں۔ مگر بہ مقابلہ لکھنؤ، دلی والوں کو میں ضرور ناقص سمجھتا ہوں اس میں کوئی ہوں!

دوسرے یہ کہ اسی کی نسبت جو آپ نے اپنا اعتقاد بہت کچھ ظاہر کیا ہے، کیا میاں بحر صاحب سے کچھ اچھے تھے؟ امیٹھی میں نہیں رہتے تھے؟ بڑے غضب کی بات کہ ناسخ طبقہ سوم میں معلم ثالث کہلائیں اور آتش جو طرز عاشقانہ میں فرد تھے صرف ناسخ کے شریک مشاعرہ لکھے جائیں۔ اور اس پر آپ اعتقاد لائیں۔

آرزو عفی عنہ

۱۸ مئی ۱۸۸۳ م

سید بندہ رضا آرزو بلگرامی کے اس خط کا جواب سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے آرہ ضلع شاہ آباد سے ٹھیک سو سال قبل اور اپنی وفات سے سات سال قبل ارسال کیا تھا، یہ خط بہت طویل اور تقریباً ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے، لہٰذا اس کے کچھ ضروری اجزاء ہدیہ قارئین ہیں۔ صفیر بلگرامی کی تحریر میرے پاس موجود ہے۔ جسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ اب جواب صفیر ملاحظہ ہو:

حضرت آرزو۔ بندگی

آپ کا عنایت نامہ ملفوفہ لفافہ عزیزی محمد ہاشم پہنچا اور سلام کی ترکیب اور ترکیب کی

تہذیب، وتہذیب نے آپ کا پُرانا خط جو آپ نے کانپور سے مجھے بھیجا تھا، یاد دلایا۔ شرمندگی ہوئی۔ سر جھک گیا۔ البتہ تغافل تو ہوا، نہ کہ اغماض۔ اور وہ بھی بہ خدا آپ ہی لوگوں کے کام کاج کے سبب۔ کیوں کہ مجھے آپ کا وہ فتوا یاد ہے کہ اہل بلگرام کے حالات بہت لوگوں سے مانگے کہ کتاب میں مندرج کر کے چھاپے جائیں گے مگر کسی نے ایفائے وعدہ نہ کیا۔ تو آپ سے کیا امید ہے۔ اس کے سوا تاریخ بلگرام کی ترتیب وتہذیب کو تین چار برس ہو بھی گئے۔ اب کہاں تک تکمیل کے خیال میں پڑا رہوں۔

کار دنیا کہ تمام کرد انچہ گیرد مختصر گیرد

ماہ رجب سے طبع میں لگا لگا دیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ دس باب کا پیاں چھپ گئیں۔ اغلب کہ شعبان تک حصہ اول تمام ہو کر پیش کش مشتاقین ہو۔ اس سبب سے کم فرصت ایسا ہوں کہ خط کا جواب بھی نہ دے سکوں۔ معاف ہو، اور طبیعت بھی منتشر رہتی ہے۔ جو کچھ (بھی) اس جلد میں ہو سکا، حاضر ہے۔ پسند کے قابل تو نہیں۔

اب جس خط میں آپ نے اس قضیہ کو چھیڑا ہے۔ اس کے لئے معتد بہ فرصت درکار ہے۔ اگرچہ میں خود رشحات صفیر میں وقیع وخل (کذا) کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی لوگوں کو خیال آہی جاتا ہے۔ میں نے ایک رسالہ تحقیق اللسان، دہلی ولکھنؤ کے جھگڑے میں لکھا ہے۔ افسوس وہ چھپا نہیں۔ ورنہ بھیج دیتا۔ اور مسودہ (بھی) اس کا صاف نہیں ہوا۔ بہر کیف اب میں آپ کے سوالات کا مجمل جواب دیتا ہوں اور تفصیل وار۔ پھر کہیے۔

اعتراض آرزو وبلگرامی:

(۱)......آپ نے خوب قواعد منضبط فرمائے مگر ساتھ ہی اس کے ایک بہت رستخیز یہ کر دیا کہ دہلی اور لکھنؤ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔

جواب صفیر بلگرامی:

پہلے کچھ اس کی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ جہاں اہل علوم وفنون کا اجتماع سلطنت کے ساتھ ہوتا ہے، زبان بلکہ سب کام کے واسطے وہی مقام مستند ٹھہرایا جاتا ہے۔ ورنہ خود کوئی مقام خاص بغیر اجماع مذکورہ کے سند کے قبل نہیں ہوتا۔ چہ لکھنؤ، چہ دہلی، چہ اکبرآباد، چہ عظیم آباد۔ بس ہندوستان میں یہی چاروں مقام ہیں جہاں سلطنت کا کم وبیش قیام ہوا۔ اور ان ہی مقاموں پر بیش وکم مجمع اہل کمال بھی رہا ہے۔ دہلی، کہ ہمیشہ سے دار السلطنت

کہلاتی تھی مگر اہل اسلام کے (جن کی زبان، قلمزد) وقت میں کہ اردو زبان، جن سے منسوب ہے کبھی کبھی سلطنت سے خالی بھی رہی ہے، مثلاً اکبر بادشاہ نے اپنا دارالسلطنت اکبر آباد کو مقرر کیا تھا اور مستقر الخلافتہ اس کا نام رکھا تھا۔ تو اس وقت میں نورتن اکبری اور شعرائے ایران وغیرہ کا مجمع اکبر آباد ہی میں تھا، اس سبب سے اکبر آباد میں خان آرزو وغیرہ شعرائے (شعرائے مسلم الثبوت، قلمزد) نامی فارسی ہو گزرے ہیں مگر اکبر کے وقت میں کیا، بلکہ جہانگیر کے وقت تک اُردو زبان کا رواج نہیں ہوا (تھا، قلمزد) لیکن اس کا سانچہ اکبر ہی کے وقت میں دَرست ہو گیا تھا۔ یعنی اکبر کا زنانہ بازار جس کا ذکر آئین اکبری میں لکھا ہے۔ تیار ہو چکا تھا اور یہ بازار جہاں گیر کے وقت تک رَہا اور اسی بازار کی بول چال سے محاورات اُردو کا وجود ہوا۔ اکبر کے بازار میں پہلے مردانہ بازار لگایا جاتا تھا۔ جس میں تمام وَزراء، عام وخاص ولایتی و ہندی...... لین دین کرتے تھے۔ اس کے بعد زَنانہ بازار مرتب ہوتا تھا اور اس میں بیگمات (بھی قلمزد) مع زنان عوام الناس ولایتی و ہندی سودا سُلف کیا کرتی تھیں۔ پس اہل حرفہ کی عورتیں جو اپنی اپنی بولیاں بولتی تھیں۔ اس سے مل کر محاورے پیدا ہوئے اور بیگمات نے ان محاوروں کا برتاؤ کیا تو مزاولت سے ایک طرح کی صفائی آنے لگی۔ خلاصہ یہ محاورات کا وجود اسی بازار سے ہوا اور بیگمات کی زبان جو شعراء میں مستند ٹھہری، اسی سبب سے ٹھری کہ ان میں جو محاورہ قرار پایا۔ پھر اس میں رَدوبَدل (نہیں ہوتی تھی۔ قلمزد) کی صورت نہ تھی۔ جب تک وہ ہی کسی وجہ سے اس کو درست نہ کریں۔ حضرت ناسخ کی نقل مشہور ہے کہ محلات کی بڑھیاؤں کو بُلا کر محاورے کی تخصیص کیا کرتے تھے:

صفیر بلگرامی نے اس ضمن میں مغل سلطنت اور زبان کی درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کرنے کے بعد، دہلی، اکبر آباد اور پٹنہ کا تاریخی طور پر تجزیہ کیا، پھر اپنی رائے لکھی۔ ''......اب رہا لکھنؤ، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جناب محمد امین بُرھان الملک کے کہ محمد شاہ کے وقت میں ناظم صوبہ اَودھ ہوئے۔ لکھنؤ ایک مقام معمولی صوبہ اَودھ میں تھا، جہاں شیخ زادوں کا عمل دخل ہوا۔ محمد شاہ نے کہ عالم گیر کے کئی پُشت بعد ہوا ہے۔ محمد امین کو صوبہ داری اَودھ کی دی۔ مگر محمد امین (وہ نہیں رہا کئے۔ قلمزد) ہمیشہ بسبب شورش شیخ زادوں کے کم رہے، اور صفدر جنگ تک یہی معمول رہا......''

تاریخی شواھد کا ذکرو بیان پھر زبان ومحاورے کی تبدیلی کے اسباب پر بہت تفصیل

سے صفیر بلگرامی نے روشنی ڈالی ہے۔ جو کئی صفحات پر منضبط ہے۔ آخر میں استدلال کے طور پر لکھتے ہیں۔

"......غرض رشحات صفیر کی سیر سے سب کو معلوم ہو جائے گا۔ اس صورت میں جب آسمان مذکر اور زمین ضرور مونث ہے اور اس کو میاں طپش نے باندھا ہو اور ان ہی کی سند میں نے دی ہو تو اس میں نقصان کیا ہو؟ اگر چہ میاں طپش لکھنؤ کے ہیں۔ مگر جب دہلی کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں تو حسب اصول آئندہ ان کی سند میں جائے تامل کیا ہے......"

اس عبارت کے بعد صفیر بلگرامی نے آرزو بلگرامی کے ایک اور سوال کا جواب شرح وبسط سے دیا ہے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان ومحاورات کے علاوہ ان کی نظر شعراء کی کل ماہیت پر بھرپور تھی۔ اور اختلاف دہلی ولکھنؤ پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔

(۲) اعتراض آرزو بلگرامی:

"......اس پر طرہ یہ کہ طپش میرٹھی کو بھی مسند ٹھہرایا ہے......"

جواب صفیر بلگرامی:

"......دہلی کا مجمع اول تھا لکھنؤ کا مجمع اس پر خُوب ہو گیا۔ لیکن اس خُوب ہونے سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دونوں مقاموں کی زبان میں اس قدر فرق ہو کہ غربت معلوم ہوتی ہو، بلکہ میاں دوآب کی زبان ایک ہی ہے اور وہ جمنا اور گنگا کے درمیان کی کہلاتی ہے۔ اور میاں دوآب، دہلی اور بنارس کے درمیانی ملک کو کہتے ہیں، کہ جمنا دہلی کے نیچے اور گنگا بنارس کے نیچے بہتی ہے.........مثلاً مَت کا لفظ بجائے آج کے ناسخ کے وقت تک دہلی ولکھنؤ میں ایک تھا۔ اب دونوں جگہ متروک ہو گیا۔ یا ہووے (اور کبھو۔ قلم زد) دونوں جگہ اور کبھو بھی پہلے کبھی دہلی میں تھا اب ترک ہے...... میں نے دو ورق پر ابتدائے رشحات صفیر میں لکھ دیا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ جس شہر میں سلطنت اور اَھل کمال کا مجمع ہو، تو وہاں کے خاکروب تک کو اپنی زبان میں مستند سمجھنا چاہیے" پس بے چارے طپش جو کہ میرٹھی تھے وہ مقلد تھے۔ جب اُستاد کو مانا جائے گا تو شاگرد بھی ضرور مانا جائے گا۔ ناسخ کو میں نے مانا کہ لکھنؤ کے تھے مگر سحر تو فیض آباد کے تھے۔ حالانکہ فیض آباد کے شعراء کی زبان مستند نہیں ہوتی تھی۔ جب سحر لکھنؤ میں آئے اور ناسخ سے فیض پایا تو مستند ٹھہرے۔ اسی طرح بہت سے شعرائے لکھنؤ جن کی تقلید سب کرتے ہیں۔ لکھنؤ خاص کے نہ تھے، جیسے وہ مانے جاتے ہیں۔ طپش بھی مانے جائیں

گے۔اب میں دہلی اور لکھنؤ سے شعراء کی تھوڑی فہرست لکھتا ہوں جو دوسرے مقاموں سے آ کر رہے تھے اور استادوں میں شمار ہوتے تھے۔

نام تخلص	وطن
آبرو	گوالیار
آرزو سراج الدین علی خاں	اکبر آباد
آشفتہ	اکبر آباد
انشاء اللہ خاں	مرشد آباد
اختر محمد صادق خاں	ھوگلی (قلمزد)
آزردہ صدر الدین خاں	کشمیر
افسوس شیر علی	نارنول
بیدل عبد القادر	تُوران وطن، بُخارا مولد، مشہور بہ عظیم آبادی
سالک، مرزا قربان علی	حیدر آبادی
طپش مرزا جان	بخار الاصل، دہلی مولد و مسکن
غالب	اکبر آباد، مولد، مسکن دہلی
معروف	فیروز پوری
میر ممنون	وطن سونی پت، مسکن دہلی
منت	مولد سونی پت، دہلی، وطن مشہد مقدس
یقین	سرھند مولد دہلی

شعرائے لکھنؤ جو غیر مقام کے تھے

انشاء اللہ خاں	نجفی الاصل۔ مرشد آبادی
اختر، محمد صادق خاں	ھوگلی
اسیر، مظفر علی	امیٹھی
بقا	اکبر آبادی

تسلیم، کبیر اللہ	فیض آبادی
حسن	ھرات، وطن، دہلی مولد
خلیل، حب علی	ھڈولی
رند، سید محمد خاں	(بیٹھاپوری قلمز د) فیض آبادی، بیٹھاپوری
سودا	کابل، مولد دہلی
سوز	بخارا، مولد دہلی
گویا فقیر محمد خاں	گوالیار
مصحفی	امروہہ
منیر سید حمید	اکبر آبادی مولد، مسکن دہلی
ناسخ خلف شیخ خدا بخش	وطن لاہور، مسکن لکھنؤ
نوا، ظہور اللہ خاں	بدایوں
ہوش، مرزا تقی	فیض آباد
یقین	(سرہند مولد دہلی۔ قلمز د)

یہ ۱۴ر شعراء شاعر دہلی اور ۱۸ر شعراء لکھنؤ سے ہیں۔ جن کا وطن لکھنؤ اور دہلی نہیں ہے، اور یہ لوگ بڑے نامی وگرامی شعراء میں ہیں، بلکہ خود حضرت ناسخ لاہوری ہیں مگر ولادت ان کی لکھنؤ میں ہوئی اور یہاں رہ کر علم وفیض حاصل کیا، تو کس سے، لکھنؤ کے رہنے والوں سے۔ جن میں باہر کے بھی تھے۔ آخر مشاہیر میں شمار ہوئے اور اساتذہ میں گِنے گئے......'' یہ بحث بھی خاصی طویل ہے۔ اس سے قطع نظر اب تیسرا اعتراض ملاحظہ ہو۔

(۳) اعتراض آرزو بلگرامی:

''......آپ کو اور جناب قدر کو مرزا غالب صاحب کی صحبت نے......انصاف طلب ہے اگر نقص اس کتاب میں ہے تو یہی ہے......''

''......میری تحریر کو اساتذہ کے باب میں ہے یا ایسی باتوں میں جو میری رائے ہے، نہ ابھی آپ نے دیکھی نہ سنی، میں اپنے ہوش کے وقت سے کبھی ایسے کا شاگرد نہیں ہوا جس کو سمجھ نہ لیا ہو۔ محبت اور چیز ہے اور سمجھ اور چیز ہے۔ سنئے! میں نے جو غالب کو سمجھا ہے حقاً اور ایماناً بیان کرتا ہوں۔ علم عربی میں تو ان کو محض ناآشنا جانتا ہوں۔ مگر بزور فارسی ان میں

ضروری واقفیت کا قائل ہوں۔ فارسی میں ان سے بڑھ کر کسی شاعر ہند فارسی گو کو نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ سنئے ہندوستان میں یہی نامی شاعر ہوئے ہیں'':

خسرو، بیدل، آرزو، قتیل، مظہر جان جاناں، فقیر، حسن، غالب ان کے سوا غنی کشمیری تھے۔ واقف لاہوری تھے۔ علی سرہندی تھے اور فیض مرادآبادی تھے۔ جو آٹھ شاعر خاص ہندوستانی تھے، ان میں سے خسرو، فقیر، حسن ایک پایہ کے (ہوئے قلمزد) اور آرزو، قتیل ایک سرمایہ کے۔ اور بیدل، مظہر، غالب ایک پایہ کے ہیں۔ امیر خسرو اور حسن دہلوی اسی وضع کے شاعر تھے، جو وضع سعدی کے پہلے تھی، جس کو ابوالفضل نے متروک اور ناپسند لکھا ہے۔ وہ لوگ عرفان مآب تھے۔ شاعر نہ تھے۔ بلند نام تھے، عالی مقام تھے، شاعر نہ تھے۔ (حاشیہ مثلاً مولانا روم) آرزو۔ قتیل...... میں ہیں۔ نہ الا الذی نہ اُولا الذی۔ مگر ان کی معلومات کا قائل ہوں، نہ ان کے مذاق شاعری کا۔ بیدل، مظہر، غالب یہ تینوں بہادران میدان سخن تھے۔ بیدل اور مظہر نے مضامین عارفانہ کو مذاق شاعرانہ سے ملا کر جیسا کہا ہے دل لوٹا جاتا ہے۔ واللہ در من قایل۔

چو سرشک بے سروپا ئیم قدمے زند بہوائی تو | کہ ہزار آبلہ در عراق بگداختم زِ حیائی تو
نہ دبل زِ عجز رسا رسم نہ رَمز آئینہ وراسم | یکجا رسم کہ بجا رسم من بیدل از ہمہ جائی تو
نفس آشفتہ مہ دارد چو گل جمیعت (ما) را | پریشان می نویسد کلک موج احوال دریا را
اے زشوخی ہائے حسنت محو پیچ و تاب ھا | حیرت اندر آئینہ چون موج در گرداب ہا
سخت دشوار اَست ترک صحبت رَوشن دِلان | موج با آن جہد نتواند گذشتہ اَز آبہا
کردہ اَم سر عشق حسرت سرو موزوں ترا | نالہ می خواہم بلندی ھائی مضمون ترا

اس کے بعد نو (۹) شعر اور ہیں۔ پھر خط کی ابتدا اس طرح کی ہے:

نظم تو نظم، نثر بھی ایسی کہ دل پذیر بلکہ دل گیر۔ بیان کی وُسعت ظہوری کی قدرت یاد دلاتی ہے۔ بھلا ظہوری نے تو نورنگوں کو مدنظر رکھا تھا اور نَورس کو بیان کیا تھا، جس میں ہزار ہا رنگ مل سکتے ہیں۔ بیدل تو نیرنگی کے بیان میں اور یک رنگی کے میدان چلا جاتا ہے جس کا حد نہ کنار، نہ آغاز، نہ انجام۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ وسعت بیاں ہو تو ایسی ہو۔ مجھے فیضی فیاضی اور بیدل اس باب میں ایک ہی جوڑے کے معلوم ہوتے ہیں۔

مظہر جان جاناں کا دیوان اس وقت پیش نظر نہیں۔ مگر ان کی شستگی وَرفتگی اور سلیقہ اور شاعری کچھ کم نہیں۔ چند شعر مثنوی کے یاد ہیں۔

خدا دَر انتظار حمد مانیست　　محمدؐ چشم بر واہ ثنا نیست
خدا مِدحت طرازِ مصطفیٰؐ بس　　محمدؐ حامِد حمد خدا بس
منا جاتے اگر باید بیاں گرد　　......می　ثوان　کرد
محمدؐ از تو می خواھم خدا را　　خدایا از تو حق مصطفیٰؐ را

غالب جنت آرام گاہ کہ خاتم الشعرائی فرس ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ ان کی درخشانی طبع نے آخرزمانہ میں ہندوستان کا نام روشن کردیا۔ کلام فارسی ان کا مشہوراور زبانوں پر مذکور ہے چند شعر مثالاً یہاں لکھے جاتے ہیں۔

اے زسازِ زنجیرم دَر جنون تو اگرگن　　بندگزبدن ذوق مست پارۂ گرانِ ترکن
بگذر اَز خستہ دِلانے کہ ندانی ھشدار　　خستگا نند کہ دَاری وندارِی غم شان

اس کے بعد بارہ (۱۲) شعر اور درج کئے ہیں۔ آخر شعر یہ ہے۔

نَقرد اَز تاب بِنا گوش تو مَستانہ وما　　تکیہ بَر پا کئی دَامان گہر داشتہ اِیم

اس شعر کے بعد خط کا سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے:

"یہ حقیقت شعرائی فارسی گوہندوستانی کی تھی۔ اب ان لوگوں میں سب نے اردو شعر کہے ہیں۔ مگر وہ ابتدا تھی۔ تفریحاً اور تفنناً کہنے کا اتفاق ہوا، اور غالب کہ آخر میں ہوئے۔ انہوں نے زُمرۂ شعرائی اردو میں گنجائش کی۔ اور اردو شاعری بطرز خاص کی اور طرز خاص کی وجہ وہی ہوئی، جو ناسخ کا کلام دیکھ کر اہل دہلی کے لئے واقع ہوئی، مگر سب میں غالب نے جو طرز بیان ایجاد کی بہ نسبت اَوروں کے سہل اور صاف ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فارسی ترکیب کے شعر کہے اور اس میں فعل اور حروف اشارہ فقط ہندی رکھے، جیسے۔"

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

نہ پوچھ کی جگہ مپرس ہوتا تو فارسی کا مصرع صاف تھا۔ بخلاف مومن کے کہ ان کے مصرعے ایسے پیچیدہ اَلفاظ تعقیب وتعقید سے مملو ہوتے ہیں کہ جس سے مضمون میں پیچیدگی آجاتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ نہیں۔ دوسری صورت یہ کہ آخر عمر میں غالب نے محاورات اور سلاست کی طرف توجہ کی، تو اس میں بھی فارسی کا مذاق چھپا چھپا ایسا رکھا ہے کہ دل کو لبھا لیتا ہے۔ مثلاً چند شعر دونوں طرز کے لکھتا ہوں۔

طرزاول:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

طرزِ دوم:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سَراب میں
وہ سحر کہ مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سَراب میں

تو ہم غالب کو اچھا اس سبب سے سمجھتے ہیں کہ طرزِ بندش اور صفائی بیان میں سب شعرائے دہلی سے اعلیٰ اور زبان فارسی میں یکتا تھے۔''

صفیر بلگرامی نے مثال کے طور پر ذوق، مومن اور غالب کے کلام سے موازنہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے یہاں صفائی بیان اور ذوق و مومن کے کلام میں گنجلک پن کا احساس زیادہ ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

باقی رہی زبان دانی۔ ان کے سوائے چند محاورات خاص دہلی کے جس کے خود مرزا غالب صاحب قائل ہوئے ہیں۔ چہ غالب، چہ مومن، چہ ذوق، چہ نصیر وغیرہ سب دہلوی اور سب لکھنوی کہیں کے رہنے والے ہوں شرطے کہ انہوں نے لکھنو یا دہلی میں نشو نما پائی ہو اور اساتذہ کے خاندان سے منسوب ہوں، اول درجے کے ہیں۔ اور دوسرا محاوارات میں درجہ عوام و خاص کا ہے...... اور بازاریوں کے تقابل نہیں...... اور یہی رائے انشاء اللہ خاں کی بھی ہے مگر یہ بات فقط دہلی لکھنو کے واسطے ہے۔''

(۷ر جون ۱۸۸۳ء مطابق ۳۰ر رجب ۱۳۰۰ ہجری آرہ)

آرزو بلگرامی نے ۱۸ر مئی ۱۸۸۳ء کو بلگرام سے دستی خط بھیجا تھا، جس کا جواب ۲۱ر یوم بعد صفیر بلگرامی نے ارسال کیا، جو ایک کتاب ہے۔ دقیق مسائل کی تشریح ہے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں، صفیر بلگرامی کا یہ خط بہت طویل ہے۔ لیکن اس کی اہمیت آج بھی ویسی ہی ہے۔ جیسی اُس وقت تھی۔ بالخصوص اس اعتبار سے کہ زبان کی تاریخ اور محاورے کی ترکیب پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے، انہوں نے اساتذہ کی قدروں اور اُن کے کلام کا بہت عمدگی سے جائزہ لیا ہے۔ اس طرح ان کی ناقدانہ صلاحیت کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے اور ان کی نگاہوں میں قدیم و جدید معاصر شعراء کا انداز قدر کیسا تھا۔ اس کا علم بھی ہوتا ہے۔ اور آرزو

بلگرامی کی ناقدانہ اور ادبی صلاحیت کا اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ اس دَور کے ذہنوں میں کسی شاعر کا کیا درجہ تھا۔ نیز ان کی ہمہ دانی کے کیا نظریات تھے۔

حاشیہ از سید مرتضیٰ حسین بلگرامی:

(۱) سید غلام حسنین بلگرامی تاریخی نام ہے، قدر تخلص تھا۔ غالب کے شاگرد تھے۔ اردوئے معلّٰی میں کئی خط موجود ہیں۔ صفیر بلگرامی کے ہم عصر تھے۔ خط و کتابت بھی کافی تھی۔ بے تکلفی کی حد تک۔ قواعد العروض اور ارکان النظم خاص تصانیف ہیں۔ کلیات قدر طبع ہو چکی ہے۔ آپ کی نظم :علی بند: غاصے کی شے ہے اور بہت مقبول۔

صفیر نے اس کے مقابلے پر: حسین بند: نظم کی تھی۔

(۲) سید بندہ رضا بلگرامی نام، آرزو، تخلص تھا۔ علم ادب پر عمدہ نگاہ تھی۔ بلگرام کے محلّہ ملکنٹھ کے باشی تھی۔ صفیر بلگرامی سے اپنے اشعار پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ راقم کے پاس انتیس (۲۹) شعروں کی ایک غزل بخط صفیر موجود ہے۔ جس سے ان کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے:

(۱) آرزو:

رہی بہار نہ ہے لطف بوستاں باقی		فقط تری رہی اک بات باغباں باقی

اصلاح صفیر:

بہار ہے نہ وہ اب لُطف بوستاں باقی		فقط رہی تری اک بات باغباں باقی

(۲) آرزو:

یہی تری ہیں جو نامہربانیاں باقی		زمیں پہ کوئی رہے گا نہ آسماں باقی

اصلاح صفیر:

یہی تری ہیں جو نامہربانیاں باقی		زمیں پہ کوئی رہے گا نہ آسماں باقی

(۳) آرزو:

جمال پہ اِترانہ اُوگل خنداں		بہار باقی رہی کب ہے جاوِداں باقی

اصلاح صفیر:

کمال حسن پہ اِترانہ اُوگلِ خنداں		بہار باقی رہی کب ہے جاوداں باقی

(۳) سید محمد ہاشم نام، تخلص ہاشم۔ بلگرام وطن، سید مبارک حسن بلگرامی کے بیٹے تھے۔ مطبع نورالانوار۔ آرہ صوبہ بہار کے مہتمم بھی تھے۔ صفیر بلگرامی سے کلام پر اصلاح لیتے

تھے اوران کے معتمد و مقتدر شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ شاگردان صفیر کے تذکرہ میں ان کا شمار بھی ہے۔ صفیر سے: جسین بند: ان ہی نے فرمایش کر کے نظم کرائی تھی۔

(۴) ''تاریخ بلگرام'' صفیر بلگرامی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ جس میں بلگرام کا حدودِ اَربعہ۔ مشاہیر بلگرام اور ادباء شعراء بلگرام کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ راقم کے پاس ہندوستان میں مطبوعہ واحد نسخہ ہے۔ اس کے سوادوسرا نسخہ حاجی سید وصی احمد صاحب بلگرامی مرحوم (کراچی، پاکستان) کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ شاید قلمی مسودہ بھی کراچی میں موجود ہے۔

(۵) تحقیق تانیث و تذکیر الفاظ اردو، پر نہایت تحقیق سے ۲۹۲ صفحات پر کتاب لسانی نوعیت کو مدنظر رکھ کر لکھی۔ سال طباعت اول ۱۲۸۹ھ مطبع نورالانوار آرہ، اس رسالے کا نام ''رشحات صفیر'' رکھا تھا۔ شائقین علم و ادب نے اس رسالہ کو اس قدر پسند کیا کہ اس کی کئی اشاعتیں منظر عام پر آئیں۔ چنانچہ طبع دوم ۱۲۹۳ھ طبع سوم ۱۳۰۱ھ اور طبع چہارم ۱۳۰۳ھ میں کی۔ اب بھی اس کتاب کی بہت اہمیت ہے۔

(۶) تحقیق لسانی کے متعلق صفیر بلگرامی کے شاگرد محمد اسمٰعیل مہر آروی کا بیان ہے کہ یہ رسالہ تحقیق زبان اردو کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔

(۷) شیخ امام علی نام سحر تخلص تھا۔ ناسخ و برق کے شاگرد تھے۔ غدر کے ہنگامہ دَارو گیر میں وطن سے بے وطن ہوئے اور ۱۸۵۸ء میں کسی نامعلوم مقام پر قضا کیا، صفیر بلگرامی کو ان سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔

(۸) سید فرزند احمد نام، صفیر تخلص ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۷ھ میں وفات پائی۔ مرزا دبیر۔ شیخ امان علی لکھنوی اور مرزا غالب دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۸۰ھ میں صفیر کا پہلا دیوان، صفیر بلبل طبع ہوا تھا۔ مار ہرہ کے دَوران قیام غالب کو ۱۲۸۰ھ کے آخر میں اپنا کلام برائے تصحیح بھیجا پھر ۱۲۸۳ھ میں خود دہلی جا کر غالب سے ملاقات کی۔ جلوہ خضر دو جلدوں میں تذکرہ شعرائے اُردو ترتیب دے کر شائع کیا۔ رشحات صفیر کے نام سے تذکیر تانیث کا رسالہ مرتب کیا جو خود صفیر کی زندگی میں ۴ بار طبع ہوا۔ اس کے سوا تقریباً پچاس ساٹھ تصانیف اور بھی ہیں۔ شاد عظیم آبادی، خواجہ سخن، سلطان عظیم آبادی وغیرہ کے نام خاص شاگردوں میں ہیں۔

☆☆☆

صفیر بلگرامی پر اعتراضی تحریر

میری خواہش اور برادرم سید احسان احمد بلگرامی سلمہٗ کی توجہ خاص کے باعث سال ۲۰۰۸ء میں جدی سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کی نادر یگانہ تصنیف ''تاریخ بلگرام'' مطبوعہ ۱۳۰۱ھ کو لباسِ نو (طبع جدید) عطا ہوئی، اور سال ۲۰۰۹ھ میں: تذکرہ جلوۂ خضر: حصہ اول کی طباعت دیدہ زیب انداز میں منظر عام پر آئی۔ اس کا پیش لفظ محقق ادیب پروفیسر سید حسن عباس صاحب رضوی صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی (انڈیا) کا عنایت کردہ ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب (سابق استاد شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نیز احسان احمد سلمہٗ کے اصرارِ پیہم نے مجبور کر دیا کہ جدی صفیر بلگرامی مرحوم سے متعلق کچھ اِشارات قلم بند کر دیے جائیں۔ مگر اصل کیا ہو، بیان کیا ہو، یہ اہم سوال میرے سامنے آئے۔ تو ذہن نے طے کیا کہ جلوۂ خضر سے متعلق جو چند اہم امور کی نشان دہی، اہلِ علم حضرت نے کی ہے، اسے پیش کرنا امر مناسب ہوگا۔ اس ذیل میں ایک خط ڈاکٹر ظفر اوگانی (استاد کلکتہ یونیورسٹی) کو سال ۱۹۷۷ء میں لکھا تھا۔ اسے من وعن پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری سمت خود عہد صفیر بلگرامی میں جو چند خطوط: جلوۂ خضر: کی طلب میں آئے تھے۔ اُن کے اقتباس شریک کیے جاتے ہیں۔ ان سے اہمیت ''جلوۂ خضر'' کا اثبات بھی ہوگا اور مؤلف کی شناخت کا بھی اندازہ کرنا ممکن ہوگا۔

سب سے پہلے آمدہ خطوط بنام جدی صفیر بلگرامی کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

۱- قبلہ۔ بندگی۔ میں نے ایک خط بھیجا مگر ریپلائی پوسٹ کارڈ نہ تھا۔ آپ جواب کیوں کر لکھتے؟۔ فرمایئے، جلوۂ خضر کی تیسری جلد چھپ گئی یا نہیں؟ اگر نہیں چھپی تو کتنی تاخیر ہے۔ اطلاع دیجیے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نثر کا تذکرہ بھی مرتب کرنے والے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کی شرائط سے آگاہ کیجیے۔ لیکن اس کا اشتہار کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ فارسی لکھیے گا یا اردو لکھایئے گا۔ مفصل لکھیے۔

۲ / ربیع الاول ۱۳۰۵ھ
فقیر حسن علی عفی عنہ
منڈیاہو ضلع جون پور

نوٹ: پروفیسر رشید احمد صدیقی، سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسی علاقے منڈیا ہو جون پور کے تھے۔

۲- معدن اخلاق، مجمع اشفاق۔ بعد ہدیۂ سلام علیک، ہم کو زبانی احباب سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مطبع میں ایک نادر اور بے مثال موسومہ ''جلوۂ خضر'' شائع ہوئی ہے۔ چونکہ ہم کو ایسے نادر اور عام نفع پہنچانے والی کتابیں دیکھنے اور اس سے بہریاب ہونے کا ذوق ہے، اس لیے ازراہِ نوازش ہم کو اس کی اصل قیمت سے مطلع کر کے ممنون کریں۔ کہ میں قیمت اس کی روانہ کرادوں اور جو کتاب اس قسم کے نوادر آپ کے مطبع سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے مطلع فرمایئے اور آپ نے جو کتاب بابت تانیث و تذکیر کے تصنیف فرمائی ہے، وہ بھی شائع ہوئی یا نہیں۔ اس کی بابت بھی مطلع کریں۔ فدا حسین۔ بتاریخ ۱۶ر ربیع الاول ۱۳۰۵ھ۔

نوٹ: اس پوسٹ کارڈ کی پشت پر ڈاک خانہ کی مہر ۲۳ر جنوری ۱۸۸۸ء پڑھا جاتا ہے۔ بیہان ہو سکتا ہے کہ بہیاں ہو۔

بہ گرامی خدمت منبع جود و کرم مجمع صفات اتم میر فرزند علی صاحب (صفیر احمد) عنایتۂ۔

نوٹ: (مکتوب نگار نے صفیر کا نام غلط تحریر کیا مگر مکتوب الیہ کو مکتوب مل گیا)۔

۳- جناب من۔ سلامت۔ تسلیم و نیاز۔ خیریت۔ مزاج مبارک۔

بہت روز سے نہ کوئی نامہ عنایت آیا۔ نہ فرمائش کتاب جلوۂ خضر ہی۔ اِس نہ آنے کا کچھ حال معلوم ہوا۔ باوجود ایں جانب ایک جلد اول جلوۂ خضر کو بذریعہ والیو پوسٹ روانہ کرنے کی تکلیف دیا تھا۔ باعث فراموشی نامعلوم۔ شاید جلد سوم میں ہمارا تذکرہ رہے گا۔ آیا وہ چھپ چکا ہے یا نہیں؟ اس کے چھپنے میں کتنے مہینے راہ دیکھنی ہوگی۔ ازراہِ الطاف اطلاع دیجیے۔ منتظر جواب۔ جلوۂ خضر جلد اول تُرت روانہ فرمائیں۔

منشی عبدالقادر طالب اَشراف پورہ۔ ملک بنگلور۔

۶ر ربیع الاول ۱۳۰۵ھ۔

اس پورسٹ کارڈ پر ڈاک خانہ کی مہر بہ زبان انگریزی بنگلور نمایاں ہے۔ پتہ انگریزی وار دو دونوں زبانوں میں تحریر کردہ ہے۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے اشخاص کو خضر راہ حصہ سوم کی کس قدر طلب تھی۔ تقریباً ہر خط ہی میں حصہ سوم سے متعلق دریافت کرنا، اس امر کی علامت ہے کہ انتظار بہ شدت سے تھا۔ حسن علی صاحب منڈیا ہو جون پور کے خط سے اس امر کی پہلی بار

آ گاہی ہوتی ہے کہ شاید جلوۂ خضر (حصہ نظم) کی طرح، شہرت اس امر کی بھی تھی کہ نثر کی بھی تصنیف ہوگی اور صفیر بلگرامی ہی اس کو سر انجام دیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کام کا تکملہ (یعنی نثری سرمایہ) صفیر بلگرامی ہی کے عزیز سجادہ نشین سرکار خورد مارہرہ شاہ سید علی احسن، احسن مارہروی (استاد شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کی منثورات نے انجام دیا۔ احسن مارہروی کا انتقال ۱۹۴۰ھ میں ہوا تھا جب کہ صفیر بلگرامی کا انتقال ۱۳۰۷ھ میں ہو چکا تھا۔ ''منثورات'' کا قلمی نسخہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ موقع ملا تو ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

ان خطوط کے مطالعہ سے، اہلِ علم کے ذوق وشوق اور طلب کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ اس دور میں مذکورہ کتاب کی جامعیت کا اعتراف بھی ہر شخص کرتا۔ اب ظفر اوگانوی کے نام کا ایک خط ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اس خط کے آخری پیراگراف سے متعلق توجہ درکار ہے کہ ۱۹۷۷ء میں یعنی اب سے ۳۲ سال قبل میں نے متوجہ کیا تھا۔ ''ذرا محنت سے اس تذکرہ کی ایڈیٹنگ کی جائے''۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی رحلت فرمالی۔ لیکن ہندوسند کے شعبۂ جات اردو کے نگراں حضرات اگر مناسب خیال کریں تو اس کام کو سر انجام دینے کی سمت توجہ دیں۔ یہ ایک علمی، تحقیقی اور تنقیدی کام ہے۔ اسے ریسرچ کا موضوع بھی بنایا جاسکتا ہے۔

اقتباس مکتوب بنام ڈاکٹر ظفر اوگانوی

آپ کے مقالے :صفیر بلگرامی: کی اشاعت (۱۹۷۶ء) آپ نے جس تن دہی، محنت اور لگن سے مقالے کی تیاری کی ہے اس پر آپ تہنیت قبول فرمائیے۔ کتاب اگرچہ ضخیم ہے مگر اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ہاں آپ نے انتخاب :کلام صفیر: میں تھوڑی سہل پسندی سے کام لیا ہے۔ غزل کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ایک ہی شعر کسی کو پسند ہوتا ہے، کسی کو ناپسند۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھا شعر ہر دل کی صدا بن جاتا ہے۔ جیسے یہ شعر۔

ہم نے سنا کہ آپ نے مجھ کو بُرا کہا
دل نے کہا کہ دوست ہے جو کچھ کہا، کہا

آپ جانتے ہیں کہ یہ شعر کس کا ہے؟ نہیں تو سنئے۔ آپ نے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا نام سنا اور پڑھا ہے نا؟ - یہ شعر اسی انشاء پرداز کا ہے۔ دیکھیے کیسا زبان کا شعر ہے اسی طرح صفیر بلگرامی کا یہ شعر کتنا اچھوتا اور نازک خیالی کا آئینہ دار ہے۔

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اُٹھانے کے لیے

یا یہ شعر

قصہ ہمارا تم سے سنا بھی نہ جائے گا
تم کیا سنو گے، ہم سے کہا بھی نہ جائے گا

زبان کی حلاوت اور خیال کی نزاکت ان اشعار میں جو ہے، اس کی داد واقعی طور پر کون دے سکتا ہے؟ تعجب ہے ایسے اشعار پر آپ کی نظر نہیں پڑی۔ بہر حال، آپ نے تنقیدی حصے کو جس وقت نظر سے مزین کیا ہے اور شاعری کے باب میں جس طرح فیصلے کی جانب قدم اٹھایا ہے، وہ خوب ہے۔ شاد عظیم آبادی کی عظمت اور فن کی بلندی پر کسی قسم کی رائے زنی کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ پھر بھی اتنی بات ضرور عرض کرنی ہے کہ ہم لوگ شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی کا اعتراف کیے بغیر زندہ ادیب کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ شاد کے کلام کی دل آویزی اور شگفتگی اپنا جواب آپ ہے۔ ہاں اہالیان شاد نے صفیر بلگرامی سے جس طرح کی پرخاش باندھ رکھی ہے۔ آپ نے اس پر بھر پور محاکمہ کیا ہے اور دلائل سے صفیر بلگرامی کی استادی کو ثابت کیا ہے (قاضی عبدالودود صاحب اور مشفق خواجہ صاحب کے سوا) اس ذیل میں جو جھاڑ اور کانٹیں درمیان راہ آپڑے تھے، جیسے خلیق انجم نے بے سروپا جعل سازی کی داستان والی حکایت۔ آپ نے اس کو غلط ثابت کر کے ،نہ صرف صفیر کو بلکہ ان کی بعد کی ادبی نسلوں کو بھی روشنی سے ہمکنار کیا ہے۔

اب آپ جلوۂ خضر کی از سر نو طباعت کے متعلق غور کیجیے۔ مجھ سے جس طرح کی خدمت ممکن ہوگی۔ اس کے لیے تیار ہوں۔ ضرورت اس امر کی ہے ذرا محنت سے اس تذکرہ کی ایڈیٹنگ کی جائے۔ زائد اور بے کار مبحث والی باتوں کو حذف کر دیا جائے۔ دلائل کی روشنی میں ان امور پر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بات پر فرصت کے لمحات میں ضرور غور کیجیے گا۔

منتظر جواب۔ سید مرتضی حسین بلگرامی، علی گڑھ۔

یکم جولائی ۱۹۷۷ء۔

افسوس کہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی صاحب کی عمر نے وفا نہ کی لیکن ضرورت اب بھی اس کام کے انجام دینے کی باقی ہے۔

تذکرہ جلوۂ خضر کی بابت اہلِ اَدب نے جس انداز سے ذکر کیا ہے ان کا ذکر بار بار کرنا، یاد دلانا، فعلِ اَحسن ہے۔ علامہ جمیل مظہری کا خیال ہے کہ:

☆ صفیر کے ادبی مقام کا صحیح تعین بھی ایک موقر کارنامہ ہے۔

☆ صفیر بلگرامی کی ادبی شخصیت پہلے بھی گراں قدر تھیں اور اب ظفر اوگانوی کے تحقیقی

شعور سے اور بھی محترم ہوگئی ہے۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی:

☆ ظفر اوگانوی کا مقالہ صاحبِ طرز ادیب پر، صاحبِ فکر ادیب کے استدلال کی بہترین مثال ہے۔

صفیر بلگرامی - سحر لکھنوی، خبر لکھنوی اور غالب دہلوی کے سوا مرزا دبیر لکھنوی کے مایہ ناز شاگردوں میں تھے۔

پروفیسر سید احتشام حسین:

ان کی تصنیف ''جلوۂ خضر'' کی بابت قومی زبان کراچی سال دسمبر ۱۹۲۵ء کا یہ تراشہ ایک دستاویزی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، غالب کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ وہ ایک بلند پایہ زبان داں شاعر اور بے مثال تذکرہ نگار تھے جن میں تذکرہ جلوۂ خضر اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار کے ایک عہد آفریں تالیف ہے۔ ہماری تاریخ اردو ادب کا یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ جدید شاعری کا ذکر کرتے ہوئے، صفیر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ افسوس کہ صفیر کو وہ شہرت نہ مل سکی، جن کے وہ مستحق تھے۔''

افسوس کا مقام یہ بھی ہے کہ اہلِ بہار نے صفیر کی قدر نہ کی۔ ان کی علمی شخصیت کا نہ اعتراف کیا، نہ ہی کوئی چیز، یا کوئی گوشہ اُن کے نام سے معنون کیا۔ ان کی تصانیف کی پذیرائی تک کرنا شاید جرم خیال کیا گیا۔ کم از کم جلوۂ خضر کی ہی از سرِ نو طباعت کرائی گئی ہوتی۔ کوئی سیمینار ان کے نام سے کیا گیا ہوتا۔ غرض یہ کہ صفیر کی علمی، ادبی، تنقیدی اور محققانہ طبع کو سراہنے کے لیے، ریسرچ کا کام کسی طالب علم کو سونپا جاتا (یہ کام ظفر اوگانوی کلکتہ یونیورسٹی نے انجام دیا) مگر ایسا کچھ نہ کرنا ایک سوال پیدا کرتا ہے۔ اس شکوہ کے بعد بھی توقع ہے کہ بہار کی یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا کو کم از کم ابتدائی تعارف تو صفیر بلگرامی کا کرانا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ بھی ایک تعمیری، تعلیمی اور معلوماتی کارنامہ ہوگا۔ اس طرح بہار کی تمام یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں صفیر کی تصویر آویزاں کرانا، ان سے رُوشناس کرانا بھی اعتراف کی بات کہلائے گی۔ صفیر کی حالیہ طبع شدہ تصنیف ''تاریخ بلگرام'' ۲۰۰۸ء کے ہمراہ ''شبیہ صفیر'' شریک ہے، اس کا عکس لے کے آویزاں کرایا جا سکتا ہے۔ تاریخ بلگرام کا نسخہ اور 'افراد کے سوا' خدا بخش لائبریری پٹنہ کو پیش کیا جا چکا ہے۔

مقالہ نگار ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے اپنے مقالے میں جن نظریات کے تحت صفیر بلگرامی کی خدمات کا اعتراف کیا کم اشخاص کر سکے۔ ان کے وجدان نے جس طرح صفیر کو، ان کے ادب پاروں میں پایا، اس کی چند مثالیں، بزبان ظفر اوگانوی ملاحظہ ہوں:

۱- جہاں تک لسانی تحقیق اور ہر دَور کے مختلف محاوروں کی چھان پھٹک کا تعلق ہے وہاں صفیر بلگرامی ...... آزاد (مولانا محمد حسین) سے کئی منزل آگے نظر آتے ہیں۔

۲- جلوۂ خضر زبان و بیان کی تحقیق و تنقید کی حیثیت سے ایک اہم اور مفید نیز گراں قدر تالیف کہی جانے کی مستحق ہے۔

۳- صفیر نے جلوۂ خضر کی تالیف کر کے اردو کی ایک اہم اور تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

۴- صفیر نے اپنی تحقیق بصیرت کی جلوہ سامانیوں سے کئی تابناک مینارے قائم کر دیئے ہیں، تا کہ بعد کے محققینِ لسانیات اس چمکتی ہوئی روشنی میں اپنی راہیں متعین کر سکیں۔

۵- معروف اور غیر معروف شعرا کے ملے جلے تذکرہ ہیں۔

۶- جلوۂ خضر میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو شعرا سے ہم تعارف حاصل کر سکتے ہیں۔

۷- یہ حقیقت ہے کہ صفیر سے قبل بہت سے شعرا کو اردو شاعری کی تاریخ بالکل ہی فراموش کر چکی ہوتی۔

۸- جلوۂ خضر اُردو کا ایک ایسا تذکرہ ہے جس کو اردو ادب کی تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی ہے اور اس سے ہمیشہ کسبِ فیض کیا جاتا رہا ہے۔

۹- (صفیر نے) خصوصاً مشاہیر شعرا کے شاگردوں (تک کی) فہرست تیار کرنے میں بہت زیادہ محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

۱۰- آزاد نے اگرچہ قدیم شعرا کو آبِ حیات کی گھونٹ پلا کر زندۂ جاوید بنانا چاہا تھا، لیکن اُن کی یہ کوشش چند حضرات کو حیاتِ جاوداں بخش سکی۔ باقی علیٰ حالہ اپنی قبروں میں پڑے مصنفِ آبِ حیات سے گلا کر رہے تھے۔

اس ذیل میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا فرمان ہے کہ۔ شعرالہند کے مؤلف عبدالسلام ندوی نے بہت کچھ جلوۂ خضر مولوی صفیر بلگرامی سے ماخوذ کیا ہے۔ (شعراء ہند کے تذکرے، ص ۸۲، تنقید از عبدالحق، ص:۱۵۹)

گویا اہلِ دانش نے جلوۂ خضر کو ایک تحقیقی، اضافی اور اُردو ادب کے لیے لازمی تصنیف کا مقام بخشنے میں کوتاہی نہیں کی ہے اور اس کی خدمات کو صمیم قلب سے سراہا گیا۔ اس

ذیل میں انگریزی ادب کے ایک محقق ڈاکٹر عطا کریم صاحب جو صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی کے تھے، ان کی رائے جلوۂ خضر کی بابت (بہ زبان انگریزی) موجود ہے۔ اپنی بات کو جدی صفیر بلگرامی کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔ لیکن اس سے قبل ایک اور گزارش ہے:

دو اہم نسخے:

اپنی بات طولانی ہو رہی ہے اس اعتراف کے بعد جلوۂ خضر جلد اول کی بابت ایک اہم خبر بھی ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری ہے۔ راقم کے پاس جو مطبوعہ نسخہ (۱۳۰۱ھ) کا ہے، اس کے چند صفحات پر اسی دور کے کسی صاحب نے اپنے محرکات کو ثبت کیا جو تنقیصی ہیں۔ اس کا ذکر ایک سال قبل جب پروفیسر مختار الدین آرزو سے کیا تو موصوف نے بتایا کہ اسی طرح کے اعتراضات میرے نسخہ پر بھی درج ہیں۔ اب جو موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ معترض نے ہر دو نسخوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اگرچہ آرزو صاحب کے نسخہ کے زیادہ صفحات اعتراضات کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ لیکن خط ایک ہے مضمون کی یکسانیت میں کوئی فرق نہیں اور تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ آرزو صاحب کے پاس جو نسخہ جلوۂ خضر جلد اول کا ہے وہ برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب کی ملکیت تھا۔ خیر بھوروی صاحب کے توسط سے یہ نسخہ آرزو صاحب کے ہاتھ لگ گیا اور محفوظ ہو گیا۔ معترض کے اعتراضات تحریری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۱۔ سحر کے مرنے پر تو آپ لکھنؤ گئے، ان کی قبر سے فیض حاصل کیا ہوگا۔

۲۔ تذکرۂ جلوۂ خضر کے ٹائٹل کور پر جو تالیفات کی فہرست درج ہے اس کی بابت معترض نے لکھا ہے ''ان کتابوں کا نام جو لکھا ہے۔ خدا سے ڈرو۔ کہاں ہیں؟''۔

۳۔ آپ کا مبلغ استعداد ظاہر ایک مثنوی مائدہ اصلاح بلکہ مصنفہ شاعر ایرانی کی ہے۔ کیا فرما کر اس کی اصلاح غالب سے لی۔ (ص: ۲۴۰، جلوۂ خضر، جلد اول)

۴۔ نواب ضیائے الدین خاں کے دہلی کے سفر کا حال معلوم نہیں۔ شاید صورت، چوک کی سیر میں دیکھی ہوگی۔ رہے آپ دہلی میں کتنے روز جو یہ واقعات پیش آئے۔ (ص: ۲۲۶)

۵۔ جھوٹے پر لعنت کس روز کاروبار خان بہادر کا ہم دست سید تبارک حسین رہا؟ (ص: ۱۹۸) (خان بہادر سے مراد سید نور الحسن بلگرامی مرحوم ہے)

غرض یہ کہ استہزائیہ عبارت جلوۂ خضر جلد اول پر جا بجا تحریر ہے جو کسی دل جلے کا کارنامہ ہے۔ ان عبارات کو دیکھ کر پروفیسر آرزو صاحب نے اظہارِ خیال کیا تھا کہ ممکن ہے

'سخن' کے ہم نواؤں کا یہ کارنامہ ہو، جو بھی ہو اس اعتبار سے یہ نسخہ اہم ہے کہ اس کا ہر حرف پڑھا گیا اور پھر استہزائیہ جملے سے صفیر کو نوازا گیا۔ عرض کیا ہے کہ عرصہ ہوا مختارالدین صاحب آرزو نے جو شبہ ظاہر کیا تھا اس کا ثبوت آج ۲۷/ آگست ۲۰۰۹ء کو جلوۂ خضر جلد اول کی ورق گردانی میں مل گیا۔ عبارت ملاحظہ ہو:

''ایک مرثیہ کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا۔ تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہو گیا''۔ (فرمان غالب دہلوی، جلوۂ خضر، جلد اول، ص: ۲۲۴)۔

اس عبارت مطبوعہ کے حاشیے پر معترض نے یہ عبارت لکھی ہے۔

یہ فقرہ مرثیہ کا خواجہ فخرالدین حسین سخن تخلص کا ہے۔ آپ نے اپنے پر جمالیا۔ (جلوۂ خضر، جلد اول، ص: ۲۲۴)۔

پرفیسر مختارالدین آرزو صاحب کے نسخے جلوۂ خضر جلد اول پر کسی غلام مصطفیٰ کا نام ایک دو جگہ تحریر کردہ ملتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہی شخص معترض تحریر کا فرد ہے۔ تصویر کے اس رُخ سے اردو دنیا ناواقف رہتی اس لیے اس کا تذکرہ کر دیا گیا کہ صفیر کی دل شکنی کا سلسلہ کس طرح رُوزِ اَزل سے جاری رکھا گیا۔ مگر بقول صفیر بلگرامی:

عشق اور حسن کا چرچہ رہا دیوانوں تک
سب یہ ساماں تھا ترے بے سروسامانوں تک

تذکرہ جلوۂ خضر کی کتابت ۳۰۸ صفحات کی صفیر بلگرامی مرحوم کے قلم کی رہینِ منّت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس کہاں سے اِتنا وقت ملتا ہوگا کہ وہ مضمون بھی لکھے، تعلقات دُنیا بھی بَرتے، خطوط بھی لکھے، خطوط کے جوابات بھی دے اور کتب کا مطالعہ بھی کرے۔ مشاعروں میں شرکت کرے، شاگردوں کے کلام کی صحت بھی کرے، طباعت کا انصرام بھی کرے اور خاندان کی کفالت بھی سر انجام دے۔ عقل حیران ہے کہ یہ سب کام کیسے صفیر انجام دیتے ہوں گے۔ افسوس کہ صفیر بلگرامی کو اس عہد کے جو مخالفین تھے انھوں نے کس طرح اُن کو ستایا، لیکن خود صفیر کا کہنا ہے اور اسی بات پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں:

نہ کوئی حال پہ اپنے رَویا رَوئے ہم سارے زمانے کے لیے

جلوۂ خضر جلد اول کے سوا، جلد دوم بھی زیر طبع ہے۔

☆☆☆

شاد عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی

گھر کیا دل میں جو اُن کے تیر نے
وہ لگے میرا کلیجہ چیرنے — صفیر بلگرامی

علامہ تفتازانی اپنے شاگردوں سے اس قدر نالاں تھے کہ ایک مرتبہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تو علامہ نے آبدیدہ ہوکر پوچھا ''اے کانٹے سچ سچ بتا کیا تو نے بھی ہم سے کچھ سیکھا تھا؟

جس طرح علامہ تفتازانی نے اپنے شاگردوں کا گلہ ایک کانٹے سے کرتے ہیں؟ اُسی طرح سید فرزند احمد صفیر بلگرامی تیغ ستم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہیچ مدان ہیچمیرز مقلد گذشتگان معتقد فصحائے زماں حد غرور سے منزلوں دور، شاگرد خاندان ناسخ مغفور، فیضیاب خدمت شیخ امان علی سحر و برق و بحر کوچہ گرد شہر شہر، زلہ ربائے خوان فیض غالب و دبیر روشناس برنا و پیر شعر کا دوست غمخوار یار باوجود ہیچ مدانی مشہور دیار و امصار کشتہ تیغ تلامذہ مورد مراحم اساتذہ بندہ حقیر سید فرزند احمد صفیر بلگرامی.........

اس اقتباس میں مرثیہ کا ٹکڑا ''کشتہ تیغ تلامذہ'' ہے شاگرد اپنے استاد کو ستم کی تیغ سے کیوں کر ذبح کرتا ہے اس کو پوچھنا چاہیے۔ فضل الدین خاقانی سے، جس نے ابوالعلا سے بغاوت کی اور شریف سے۔ جس نے بساطی سے بغاوت کی اور بساطی سے جس نے کمال مجند سے بغاوت کی، اور مومن دہلوی سے جس نے شاہ نصیر دہلی سے بغاوت کی اور سکندر شاہ جہاں پوری سے۔ جس نے مومن دہلوی سے بغاوت کی، قدما کی پیروی میں شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے استاد صفیر بلگرامی سے انحراف کیا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

۱۲۶۲ھ دیوان ''صفیر بلبل'' شائع ہوا اور جناب شاد نے تاریخ طبع دیوان کہی:

چویں دیوان رنگیں طبع گروید
بُر از معنی و الفاظ خوش اسلوب
بجُستم سال طبعش شاد از طبع
شدہ شیریں سخن تاریخ مرغوب

۱۲۸۱ھ اس سال جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت صاحب مطیر رئیس حاجی گنج کے ساتھ میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کے مکان پر صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہوئے اور ان کی درخواست قبول کی گئی ۱۲۸۷ھ تک صفیر بلگرامی سے اصلاح (سات سال) لی۔

۱۲۸۸ء صفیر بلگرامی کو استادی راس نہیں آئی۔ جناب شاد نے شاگردی سے انحراف کیا۔ ۱۳۰۷ھ صفیر بلگرامی نے ۵۷ سال ۹ ماہ اور ۲۰ یوم حیات رہ کر اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اور خود شاد نے اپنے استاد کی وفات سے متاثرہ ہو کر کہا:

اے شاد تم تو روتے تھے نکہت کے واسطے
اے لو! عدم کو آج سدھارے صفیر بھی

حضرت صفیر کی استادی اور شاد عظیم آبادی کی شاگردی کے سلسلے میں خود استاد و شاگرد کی حیات مستعار کے دور میں با قاعدہ بحث مباحثے ہوئے۔ شقہ نامہ و پیام جاری ہوئے۔ ادبی محفلیں اور مجلسیں مبارزت میں تبدیل ہوئیں یہاں تک کہ اس مقدمے کے سلسلے میں گواہی شہادی کی نوبت آئی اور سید حامد حسین نکہت عظیم آبادی نے شاد کے انحراف کے بعد ایک دستخطی مہم چلائی۔ جس میں اس دور کے سبھی اہل سخن نے شرکت کی اور واقع انکار پر انگشت بدنداں ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں رسالہ ''ندیم'' (گیا، صوبہ بہار) کے مدیر نے ایک ''خاص نمبر'' شائع کرنے کا اعلان کیا۔ جس میں سید وصی احمد صاحب بلگرامی سے مضمون بھیجنے پر اصرار کیا۔ موصوف نے ''س ش ص'' کے عنوان سے ایک طویل و بسیط مضمون لکھا اور صفیر و شاد کے متعلق جملہ شواہد انتہائی تحقیق، تدقیق اور جستجو کے ساتھ تحریر کر دیے، اس مضمون کی اشاعت نے موافق و مخالف گروپ اور ادبی حلقے میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا، لیکن حق شناس اس بات سے واقف تھے کہ شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی سے انکار اور بعد میں تحریری اقرار کن حالات میں کیے اس سلسلے میں صاحب طرز ادیبوں نے کیا کیا لکھا ہوگا، اس کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں، لیکن اس دور اور اس مضمون سے متعلق یہ دو تحریریں نہایت اہم ہاتھ آ گئیں ہیں، اس سے کم از کم یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ حق کس طرح اور کس طرف بولتا ہے۔ ان خطوط کے سوا سید وصی احمد بلگرامی کا جوابی خط جو خود ایک صاحب طرز انشاء پرداز اور ادیب ہیں۔ ادب عالیہ کا درجہ رکھتا ہے، خصوصی طور پر خط کا وہ حصہ تو ادبی تنقید کی حیثیت رکھتا ہے جس

میں عہد میر تقی میر اور عہد مبارک کا موازنہ کیا گیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب کا دامن اس خیال کے تحت تنگ ہوتا جا رہا ہے کہ نہ تو کوئی صاحب طرز ادیب پیدا ہو رہا ہے اور نہ صاحب اسلوب شاعر، دراصل ہم قدیم روایت اور ڈگر پر گامزن ہیں، جدت کا کوئی بہتر نمونہ سامنے نہیں آ رہا ہے، اچھوتا اور نیا اسلوب کسی کے یہاں نہیں ملتا۔ شبلی، حالی اور آزاد کا انداز فکر نہ سہی مہدی، رشید احمد اور نیاز جیسا انداز بھی کسی دوسری جگہ نہیں ملتا، ایسا کیوں ہے؟ یہ سکوت کیسا ہے؟ اور ادب میں یہ خاموشی کیوں ہے؟ اس پر واقعی غور و فکر کی ضرورت ہے!

خط نیاز فتحپوری

(خط بنام سید وصی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر، بذریعہ رجسٹرار بورڈ آف ریونیو)

مکرمی! آج گرامی نامہ ملا۔ ۳۰/ نومبر کو آپ کے نام ڈالٹین گنج کے پتہ سے وی پی روانہ ہو چکا ہے۔ معلوم نہیں وہ آپ تک پہونچے، اس لیے دسمبر کا رسالہ مکرر ارسال خدمت ہے۔

میں اس سے قبل ایک عریضہ آپ کے پرانے پتہ سے اور بھی روانہ کر چکا ہوں، جس میں آپ کے مضمون ''س ش ص'' کو پڑھ کر اپنے بے اختیارانہ جذبات تحسین واعتراف پیش کیے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے نگار کو اس مقالہ سے محروم رکھ کر میرے ساتھ اتنی بڑی ناانصافی کی ہے اور ندیم پر اتنا بڑا احسان رکھا ہے کہ میں جتنی شکایت بھی کروں کم ہے اور وہ جتنا فخر کرے کم ہے۔ اگر آپ نے میرے اس جذبہ رشک کو تسکین نہ پہونچائی تو باور کیجیے کہ یہ آپ کی گردن پر بڑا مظلم گا۔ الہ آباد کی فرصت میں میری اس شکایت کو دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ ورنہ آپ مجھ سے دور نہیں اور میں ''من و دست و دامان آل رسول'' سے بھی واقف ہوں۔

مدیر رسالہ نگار لکھنؤ، ۳/ دسمبر ۱۹۳۵ء   خاکسار نیاز

(خط بنام سید وصی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر۔ بذریعہ رجسٹرار بورڈ آف ریونیو، الہ آباد)

''س ش ص'' والا مضمون ندیم کے 'بہار نمبر' میں نظر افروز ہوا۔ یہ مضمون اس وقت پبلک پلیٹ فارم پر لایا گیا کہ اس راز سر بستہ کے جاننے والے الشاذ کالعدم رہ گئے۔ اور حقیقت حال پر امتداد زمانہ اور بطلان حق کی ظلمتوں کا گہرا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر حق کا بول بالا۔ اللہ اکبر! تصویروں کے ورق چھوڑ کر پچھتر صفحوں پر بخط متصل سطور میں ادبی خوبیوں کے ساتھ اس تحقیق و تفتیش و صدق و صداقت سے اور مفصل مشرح بسیط سپرد قلم کیا گیا ہے کہ منکرین کو

بال برابر بھی جادہ حقیقت سے گریز کا موقع نہیں، اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' کی فضا کو آپ کی راست نگاری نے شنیدہ کو مانند دیدہ کر دیا۔ ہر طرف سے حق حق کی صدا آویزۂ گوش ہوتی رہے۔

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ! یہ الجھا ہوا مقدمہ دنیا کو اس طرح سمجھایا گیا۔ کہ بچے بچے کی سمجھ میں آ گیا، فیصلہ کے سیاق عبارت کی داد دیجیے کہ ترتیب و تسلسل واقعات کی ثنا کیجیے۔ اکزیبٹ (خطوط و تحریری شہادتیں) سے اپنے اپنے موقع پر جو معمے حل کیے گیے ہیں، ان کی مدح سرائی کیجیے۔ مختصر یہ کہ جیسے جیسے اس فیصلہ کو پڑھیے ویسے حق کے جلوے بطلان حق کی ظلمتیں کافور ہوتی جاتی ہیں اور بالآخر حق کے جلوے لفظ آتے ہیں۔

کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست
راستی موجب رضائے خداست

ہماری یہ چند سطریں جناب فانی کے اس لاثانی شاہکار کی ہرگز داد نہیں۔ یہ پچھتر صفحے کم سے کم میرے قلم سے (میرے قلم کی تخصیص معنی دارد، مجھے حضرت صفیر بلگرامی علیہ الرحمۃ کی بارہا زیارت کا شرف حاصل رہا ہے۔ میر اعنفوان شباب تھا کہ یہ صوبہ بہار حضرت مرحوم و مغفور کے فیض سخن سے فیضیاب تھا) پچھتر صفحے کی داد کے مستحق ہیں۔ کانوں سے جو کچھ سنا تھا اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہی صدائیں آپ کے صریر خامہ نے سنائیں۔ اور وہی صورتیں آپ کے آئینۂ صحافت حق نما نے دکھائیں۔

آپ نے آج اس الجھی ہوئی گتھی (حضرت صفیر بلگرامی سے شاد و سخن عظیم آبادی کا انحراف شاگردی) کو حق و صداقت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلجھا دیا ہے۔ جو تقریباً ساٹھ برسوں سے ایسی الجھی ہوئی تھی کہ کسی سے سلجھتی ہی نہ تھی، حقیقت حال کا فیصلہ ناطق نہ ہو سکا، یہ فیصلہ حق بجانب ہے کہ دنیا کی پریوی کانسل کیا مال ہے داوری گاہ حشر میں بھی یہ فیصلہ جیوں کا تیوں برقرار و بحال رہے گا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند
ہیچمدان، مبارک عظیم آبادی
ساکن محلّہ چورہا آغا حسینا
ڈاکخانہ بیگم پور- پٹنہ سٹی

سید مبارک حسین مبارک عظیم آبادی

(خط بنام ڈاکٹر سید مبارک حسین صاحب مبارک عظیم آبادی)

محترمی جناب جانشین داغ و آبروئے عظیم آباد سید مبارک حسین صاحب مبارک عظیم آبادی۔ سلام وتمنائے زیارت!

ڈالٹن گنج چھوڑے ہوئے ہم کو دو ماہ ہو گئے۔ متعلقین آرہ میں اور کل سامان ڈالٹین گنج میں۔ بہار گورنمنٹ نے ایک ضرورت سے ہم کو یہاں بھیجا ہے۔ خطوط جو آیا کیے ڈرائیور نے ڈالٹن گنج ہی روک لیے۔ پھر اس کے جی میں کیا آئی کہ اخبار اور خطوط ہم کو الہ آباد بھیج دیے۔ اسی انبار میں ایک ہیرے کی انگوٹھی بھی اتفاقیہ مل گئی۔ وہ انگوٹھی آپ کا اعزاز نامہ مورخہ ۲۲ رستمبر ہے۔

صبا کو یہ کیا آج موج آگئی
کہ پھولوں سے تربت مری چھاگئی

الحمدللہ کہ زمانہ اہل انصاف سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ چنانچہ رئیسان گذری و کشمیری کوٹھی و حاجی گنج نے جب صفیر بلگرامی کا ساتھ دیا تھا اور اس ساتھ دینے پر جناب شاد نے جب باز پرس کی تھی کہ آپ لوگوں نے باوجود ہم وطنی دستخط کیوں کیے؟ تو رئیسان موصوف نے یہی جواب دیا تھا کہ:

''ایمان کے باب میں کسی کا پاس نہیں کیا جاتا جو ہم جانتے تھے لکھ دیا ہے''۔

(ندیم بہار نمبر ۲۲۹) اب ترسٹھ برس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں۔

''حقیقت حال پر امتداد زمانہ اور بطلان حق کی ظلمتوں کا گہرا پردہ پڑا ہوا تھا مگر حق کا بول بالا منکرین کو بال برابر بھی جادۂ حقیقت سے گریز کا موقع نہیں''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج بھی زمانہ اہل انصاف سے خالی نہیں ہے لیکن اس دو ماہ میں آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ منکرین اب تک اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں اور تردیدی مضامین لکھے جا چکے ہیں یا بھیجے جا چکے ہیں۔ ہم اتنی دور ہیں کہ آواز پہونچتے پہونچتے ہم تک پہنچ سکتی ہے، آپ سرزمین پر ہیں اس لیے وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے اس کا حال آپ بہتر جانتے ہوں گے۔

گزارش ہے کہ آپ سے دو برس پہلے کا ندیم بہار نمبر صفحہ ۲۵۴-۲۵۵ بغور ملاحظہ فرمایا جائے اور دیکھا جائے کہ باوجود اس کذب اور بدتمیزی کے ہم نے س ش ص میں ضبط و تحمل سے کام لیا ہے، یا نہیں؟ مثلاً ص ۲۳۱ میں تنبیہ صفیر بلگرامی مولفہ خواجہ فخر الدین سخن کا ذکر آیا ہے، ہم نے صرف لکھ دیا کہ ''یہ کتاب کسی طرح خواجہ فخر الدین سخن کے شایان شان نہ تھی'' مگر

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

باوجود اس احتیاط کے ''اگر کوئی نادان تردیدی مضمون شائع کرے تو مصنفین عظیم آباد کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس قصہ کو یکسو کر دیں۔

''یکسو سے مراد صفیر بلگرامی کی ناجائز طرفداری کرنا نہیں ہے اور مصنفین سے مراد عوام الناس نہیں بلکہ صرف وہ لوگ ہیں جو ہنگامہ شاد و صفیر کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان چشم دید گواہوں میں تین بزرگ قابل ذکر ہیں۔ امداد، آزاد، مبارک''۔

جناب امداد اگر کچھ بولنا چاہیں بھی تو بول نہیں سکتے تھے۔ اعتراض یہ ہوگا کہ یہ اپنے استاد سے بغاوت کر رہے ہیں اور خود اپنے خون کا انتقام اس طرح لے رہے ہیں۔ جناب آزاد اگر کچھ بولنا چاہیں تو دنیا یہی کہے گی کہ یہ تو جناب شاد کے پرانے رقیب اور دشمن ہیں۔ البتہ آپ جانشین داغ ہونے کی حیثیت سے، انصاف کا ترازو اپنے ہاتھ میں لیں تو یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ باغی ہے یا رقیب ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ''دریا میں رہ کر مگر سے بیر کرنا'' خلاف مصلحت ہے۔ اگر اس قسم کی مصلحت مانع نہ ہو تو انصاف کی ترازو اپنے ہاتھ میں ضرور لی جائے اور اپنا فیصلہ ندیم کے ذریعہ دنیا کو سنا دیا جائے۔

حضرت آتش فرماتے ہیں:

''بہار باغ ہوتی ہے خزاں موسم ہے پت جھڑ کا''

اس لیے باغ عظیم آباد میں جب پت جھڑ کا موسم آگیا ہے تو پتوں کو چاہیے کہ بہار کی کہانی وہ سننے والوں کو سنا دیں ورنہ یہ کہانی یونہی رہ جائیگی۔

مضمون 'س ش ص' بہت تشنہ ہے صدہا ضروری باتیں ندیم کی وسعت کا خیال کر کے چھوڑ دی گئیں۔ مکتوب و قطعات تک پورے نہیں دیے گئے، اور باتوں کو کون پوچھتا ہے، مرحوم و مغفور کشمیری کوٹھی کا فسانہ، غفران مآب میر زادبیر کا فسانہ، نساخ کے ظلم و جور کا فسانہ اور اس طرح الف لیلہ کے اکثر ابواب گفتنی ناگفتنی ہو کر رہ گئے، بڑی مصیبت یہ ہے کہ واقعہ اشخاص سے متعلق ہوتا ہے اور اشخاص کو یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ نام لیا جائے۔ داستان گو نام نہیں لیتا پھر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ تو نے اس واقع کو بیان کیوں کیا؟ اس لیے واقعہ سن کر نام لوگوں کو خود ہی یاد آ گیا۔ اب داستان گو لاکھ سر پٹکتا رہے کہ ہم بے قصور ہیں لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔ باوجود ان مجبوریوں کے 'س ش ص' میں کوشش کی گئی تھی کہ یاد ش بخیر عظیم آبادی کی مٹی ہوئی تصویر دنیا بھر دیکھ لے۔

آپ نے دیکھا کہ روحانی وصل کس طرح ہوتا ہے؟ اگر نہ دیکھا ہو تو ندیم کا صفحہ ۲۴۴ دیکھیے جو اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

سکھیو سنیو مری کہانی
میں تو بھئی ہوں برہا دیوانی

اور پھر اس کے بعد کا صفحہ ۲۴۵ دیکھیے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

چتون جو قہر کی ہے تو تیور جلال کے
مطلب یہ ہے کہ رکھ دے کلیجہ نکال کے

عرض ہے کہ قہر و جلال کی ضرورت نہیں کلیجہ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ وصی احمد آپ کا سر سے پاؤں تک زرخرید غلام ہے مگر غور طلب ہے کہ یہ روحانی وصال کہ ہم آپ سے کس پردہ میں بغل گیر ہو رہے ہیں

آپ کی غزل مرصع ہے مگر ہاتھ کا کنگن اور ماتھے کا ٹیکہ پوچھیے تو:

حکمت تو دیکھیے یہ حکومت تو دیکھیے
دل کا سوال ہوتا ہے آنکھیں نکال کے
پھر ڈھونڈتا ہے دل خلش خار آرزو
پچھتا رہا ہوں دل سے یہ کانٹا نکال کے

حالت یہ ہے کہ پنڈت مالویہ کا مسلمان ہو جانا آسان ہے مگر ایک اچھوتا شعر کہہ دینا اب مشکل ہے۔ ''اب'' کی قید اس لیے کی گئی کہ عہد میر تقی اور عہد مبارک عظیم آبادی میں وہی فرق ہے جو الف لیلہ اور امیر اللغات میں یا صحرائے نجد اور لکھنؤ چوک میں یا ایک ورق سادہ اور ایک چنے میں۔

الف لیلہ میں ڈاکو کہتا ہے کھل رے سم سم، خزانہ کا دروازہ آپ ہی آپ کھل جاتا ہے امیر مینائی کا قلم کسی لفظ کی سوانح عمری لکھنا چاہتا ہے تو جب تک اس میں شاہان سلف یعنی کلام اساتذہ سے ہر واقعہ کی تصدیق نہ ہو جائے وہ ایک لفظ نہیں لکھ سکتا۔ ایک بیراگی یعنی برہ کی آگ کا مارا ہوا صحرائے نجد ناقہ لیلہ کے پیچھے دوڑا جا رہا ہے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے، لیکن لکھنؤ چوک میں شانہ سے شانہ چھلتا ہے، ایک سادہ ورق پر سورہ بقر جس طرح چاہے پورا کر لیجیے مگر ایک چنے پر تین آیتوں کی بھی گنجائش نہیں!

اس طرح میر تقی میر نے جو کہا وہی محاورہ ہو گیا، جو سکہ چلانا چاہا وہی چلا گیا، لیکن

مبارک عظیم آبادی کا جسم نصف پتھر ہو چکا ہے۔ گویا کسی ساحر نے کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہے مروجہ قوانین زبان کے خلاف وہ کچھ بول نہیں سکتا، اساتذہ کا میلا لگا ہوا ہے، شانہ سے شانہ چھل رہا ہے...... !ایک شعر بھی کہنا ہو تو سب سے بچ کر چلنا ہوگا، چور بن کتوالی کون جائے؟ بیت الغزل میں بالفرض وہ لیلہ کی جگہ مہاراجہ اندور والی ممتاز بیگم کو بٹھانا چاہے تو شہر میں فوراً بلوہ ہو جائے ہماری لیلہ کے گھر میں یہ چڑیل ممتاز بیگم کہاں سے آ گئی؟ الغرض اسلاف کی آزادیاں اخلاف کو نصیب نہیں، نقشہ حسب ذیل ہے: عہد میر تقی میں...... ''بادل سے چلے آتے ہیں مضمون مرے آگے'' عہد مبارک میں...... ''وائے قسمت اب تخلص بھی نیا ملتا نہیں''] عہد میر تقی میں...... ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' عہد مبارک میں...... ''آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیے''۔

اسی لیے عرض کیا گیا تھا کہ پنڈت مالویہ کا مسلمان ہو جانا آسان ہے مگر ایک اچھوتا شعر کہہ دینا اب مشکل ہے اور اگر کوئی کہہ دے تو یقینی جادوگر ہے، مثلاً پروفیسر عبدالمنان کا یہ شعر [ندیم ص ۱۱۲]

پاؤں رکھتا ہے غیر بھی اس پر
سجدہ سنگ در کریں کیوں کر؟

آپ کے دونوں شعر اور جمیل مظہری کا یہ شعر [ندیم ص ۴۹]

آزادیٔ مطلق لعنت ہے، ہوتا جو سکوں آزادی میں
زنجیروں کی خلعت انسان نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا؟

معلوم نہیں آپ نے کلام مرتب فرمایا یا نہیں؟ اگر مرتب ہو چکا ہے تو مطبع میں کیوں نہیں جاتا۔ اگر مرتب نہیں ہوا تو اس کی وجہ کیا ہے؟

جی چاہتا ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوتی، وہ اس طرح کہ اپنے مفصل حالات مع کام آپ قلم بند فرمائیں اور وہ نوشتہ ہماری آنکھوں کا سرمہ بنے۔ مفصل حالات سے مراد شجرۂ نسب و شجرۂ شاعری، شجرۂ طریقت اور خاندانی اور ذاتی حالات ہیں۔ وہ حالات جو ظاہر کیے جا سکتے ہیں کلام ہے مراد نہ صرف مجموعہ کلام یا انتخاب کلام ہے بلکہ شان نزول، اکثر ابیات کسی خاص واقعہ یا معرکہ سے تعلق رکھتی ہوں گی، اس لیے معرکہ و واقعہ کا اظہار ضروری ہے، ورنہ بیت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ جو شاعر نہیں، وہ شاعر نہیں وہ فن سے واقف نہیں اس کو اپنا کلام بھیجنا خود کلام کی توہین ہے، ہم عرض کرتے

ہیں کہ:

گر نیست جمال و رنگ و بویم
آخر نہ گیاہ باغ اویم

بشرط فرصت اس عریضہ کا مفصل جواب عنایت ہو اور جلد عنایت ہو، کیونکہ الہ آباد میں اب زیادہ قیام نہیں رہے گا، بخدمت گرامی شاہ عبدالرحمٰن صاحب سلام وتمنائے ملاقات!

سید وصی احمد بلگرامی، الہ آباد

امانت لکھنوی

سرمہ انکھوں میں خمار انکھوں میں پیار انکھوں میں
اس کی آنکھوں کو میں پہچانوں ہزار آنکھوں میں

میر انیس

ٹھہرا لیا ہے نقطہ فرضی دہن نہیں
اسرار کردگار میں جائے سخن نہیں

مولانا جامی

تفتمش جامی امیر تست گفتا اگہم
لیک من از طعن بد گویاں تغافل می کنم

زیب النساء

مخفی بدروخو کن و درماں مجوز کس
کیں نسخہ در کتاب فلاطوں نوشتہ اند

حضرت اکبر الہ آبادی

اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے مرے گھر میں جو چلا آتا ہے
بے حجابی ہمسایہ کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

حاشیہ: س ش ص 'ندیم' ۱۹۳۵ء

س: سلطان عظیم آبادی ش: شاد عظیم آبادی ص: صفیر بلگرامی

تتمہ

شاد صفیر کے اس قضیہ سے اب کسی کو مطلب نہیں مگر اہل دانش کو ہمیشہ اس کی فکر رہے گی کہ اصل واقعہ ہے کیا؟ شاد کو شاگردیٔ صفیر کا شرف حاصل تھا یا نہیں؟ اس ذیل میں مشفق خواجہ صاحب کی تحریر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

''مرثیہ شاد عظیم آبادی کے ذیل میں جناب پروفیسر مسلم صاحب نے اس نادر تحریر کو جس میں شاد کی، صفیر بلگرامی کی اور مرزا دبیر لکھنوی کی تحریریں اصلاحی موجود ہیں۔ ان کو دیکھنے کی آرزو کی اور جب مرثیہ شاد عظیم آبادی خود ان کے دست و قلم اور اس پر اصلاح صفیر بلگرامی کے سوا صفیر کے استاد مرزا دبیر لکھنوی کی اصلاح کو ملاحظہ کیا۔ تو خاموشی اختیار کر لی۔ گویا یہ سہ آتشہ تحریر اب نادر و یگانہ تحریر ہے۔ جس سے دنیا ادب ناواقف تھی مگر رسالہ اردو (پاکستان) نے اصل مرثیہ شاد عظیم آبادی کے دست و قلم اور اصلاحی صفیر و دبیر کے عکس کو شائع کر کے جعل کو اصل قرار دے دیا ہے۔

اسی طرح شاد عظیم آبادی نے صفیر بلگرامی کے متعلق تحریر کیا تھا ''صفیر استاد من بود'' یاران طریقت نے 'من: کو فن: بنا کر شاد کو شاگردی سے دور کر دیا۔ ورنہ فن کا یہ محل کہاں ہے۔

اس واقعہ کے بیان سے مقصود محض اسی قدر ہے کہ علامہ اقبال، حضرت نوح ناروی اور احسن مارہروی جیسے ناموران نے داغ دہلوی کی شاگردی پر فخر کیا۔ مگر اہل بہار کے زعماء کو شاد کی شاگردی صفیر بلگرامی پر کل بھی اعتراض تھا اور شائد اس اصلاحی مرثیہ کی بازیابی پر بھی انکار قائم رہے گا۔ اسی لیے صفیر بلگرامی کے پوتے سید وصی احمد فانی بلگرامی نے یہ شعر کہا ہوگا:

آئینہ ایک بھی نہیں ملتا
سب کے دل میں بخار سا ہے کچھ

☆☆☆

خواجہ غلام غوث بے خبر

(ایک جائزہ)

خواجہ حضور اللہ کے بیٹے خواجہ غلام غوث بے خبر ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸ رشوال ۱۳۲۲ھ کو اس درفانی سے عالمِ جاودانی کو کوچ کر گئے۔ آپ کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا۔ یہ خاندان (لاسہ) تبت اور نیپال کے علاقہ سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا اور بنارس میں آباد ہو گیا۔ بے خبر یہیں سنِ شعور کو پہنچے۔ علوم عربی و فارسی کی تکمیل بھی آپ نے بنارس ہی میں کی۔

بے خبر کے خالو سید محمد خان لیفٹیننٹ گورنر صوبہ و مغربی کے میر منشی تھے، جب ان کو پنشن مل گئی تو خواجہ غلام غوث کی صلاحیتوں اور اعلیٰ کردار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ عہدہ عطا کیا گیا، اس طرح ۴۴ سال تک آپ نے میر منشی کے فرائض سرانجام دیئے۔ اپنی کارکردگی اور حسنِ انتظام کے صلے میں سرکارِ برطانیہ سے ''خان بہادر ذوالقدر'' کا خطاب پایا۔

میر منشی کے عہدے کی ذمہ داریوں کے باوجود بے خبر ادبی و علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے، اور ادبی و علمی محفلوں میں برابر شرکت کرتے غالباً ان ہی اخبار کی بنا پر ایک غزل کے سلسلے میں غالب نے یہ رائے ظاہر کی تھی۔

''......رام پور میں ہی تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے ابداع اس کو کہتے ہیں، جدّت طرز اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے، خدا تم کو سلامت رکھے......اردوئے معلّیٰ''۔

خواجہ صاحب اردو کے اچھے مگر کم گو شاعر تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق کچھ فطری اور کچھ ماحول نے پیدا کر دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کلام میں نفاست اور سادگی موجود ہے۔ تذکروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۴۶ء کے لگ بھگ وہ اردو نثر کی جانب متوجہ ہوئے۔ خصوصاً خطوط نویسی میں سادگی اور سہل نگاری کے ابتدائی نقوش بے خبر کی تحریروں میں

ملتے ہیں، بہر حال روشِ عام سے ہٹ کر نثر کو آسان اور سادہ بنانے میں بے خبر کا زیادہ ہاتھ ہو یا نہ، مگر اس روش کے تبدیل کرنے والوں میں ان کا شمار ضرور ہے، آج اردو نثر میں جو سادگی اور پُرکاری نظر آتی ہے اگر اس عہد میں تبدیلی رونما نہ ہوتی تو ممکن تھا ایک عرصہ تک کوئی تبدیلی نہ ہوتی اور میر وسودا سے لے کر بے خبر وغالب کے عہد تک نثر کا جوڈھانچہ تھا وہ بدستور رہتا۔ اس سلسلے میں یہ رائے اگرچہ قطعی نہیں مانی جاسکتی لیکن وقعت ضرور رکھتی ہے کہ مرزا غالب کی نثری تحریروں سے قبل بے خبر کے جو نثری شہ پارے (بصورت خطوط) ہمیں ملتے ہیں، انِ سے انہیں تقدم کا شرف ضرور حاصل ہے، پھر بھی ابھی اسے کلیہ بنانا درست نہیں۔ بے خبر پر بیدل اور فارسی ادب اور اس کے شعراء کا بہت اثر ہے، جس نے ان کی زبان و بیان کو تھوڑا بہت ثقل دے دیا ہے۔ جو اس دور کا شائد امتیاز تھا۔ اس کے باوجود ان کے یہاں روانی اور انشا پردازی اپنے عروج پر ہے، ان کی تحریروں میں جابجا شوخی کی جھلک، قوس وقزح کا رنگ، زبان کی پُرکاری اور خیال کی وسعت آفرینی بھی مکمل صورت میں موجود ہے، جو اس دور کے دوسرے لوگوں سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔

''......زمرۂ خواص میں عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص وصادق الولاء دیکھے، ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ......'' (اردوئے معلّٰی)

غالب کے اس خط کے لہجے اور انداز سے ان کے خلوص اور تصنع دونوں کا اظہار ہوتا ہے اور تعجب بھی۔ تعجب کا سبب یہ ہے کہ غالب جیسی شخصیت جو اعلیٰ اور عمدہ استعداد کے لوگوں کو خاطر میں نہ لاتی ہو، بے خبر کے متعلق 'زمرۂ خواص' کا لفظ استعمال کرتی ہے، اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ان کے عہدۂ 'میر منشی' کو زمرۂ خواص میں تو شامل کر سکتے تھے مگر ان کی علمیت سے مرعوب ہونا ان کے امکان میں نہ تھا، اسی طرح غالب نے اگر 'ابداع' کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے ان کی مراد ہرگز وہ نہ ہوگی جو ایسے موقع پر سمجھے جارہے ہیں، بلکہ اس میں دور اندیشی اور مصلحت اندیشی کو زیادہ دخل نظر آتا ہے۔ بہر حال غالب کی ان تحریروں سے بے خبر کی علمی اور ادبی وجاہت وشخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ نثری اندازِ نگارش کی تبدیلی میں مروجہ راستہ سے ہٹ کر قلم اٹھانا اس عہد میں مشکل مرحلہ تھا۔ جسے بے خبر نے اپنایا اور دوسروں کے لیے میدان ہموار کیا۔ خصوصی طور پر خطوط نگاری میں جو روش انہوں نے وضع کی وہ اپنی مثال آپ ہے، سادہ، سہل، آسان اور عام فہم انداز کے خط لکھنا جب آج

کے اردو ادیبوں کے لیے کٹھن کام ہے تو نصف اِٹھارویں صدی کے اہل علم کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کے باوجود بے خبر کی زبان رواں، شستہ اور آسان ہے، ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''......میرے لیے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو کرے، اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے، گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے......''

(خط بنام غلام امام شہید)

اس تحریر میں بے تکلفی ضرور ہے، روانی اور قصہ خوانی سے بھی اسے خالی نہیں کہا جاسکتا، تاہم اس میں وہ رنگ و آہنگ نہیں ہے جو غالب کی سادگی پرُکاری میں نظر آتا ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس میں خطوط کی زبان سے زیادہ ادبیت، انشاءلطیف اور خطابتِ حسین کے عناصر موجود ہیں۔ یہی رنگ آگے چل کر ہمیں اور زیادہ مکمل، بلکہ بھرپور صورت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سید وصی احمد بلگرامی اور نیاز فتح پوری کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ سوال چند خطوط کا نہیں بلکہ ان کی تحریروں کے مجموعی رنگ اور ادبی مزاج کا ہے۔ اور اس اعتبار سے جب ہم ان کی نگارشات کو دیکھتے ہیں تو ان میں ہمیں وہ اندازِ تحریر کسی قدر نکھری ہوئی شکل میں ملتا ہے جسے ہم انیسویں صدی کے نصف اول کا اسلوبِ نگارش کہتے ہیں، اگرچہ بے خبر نے ایک لمبی عمر پائی اور وہ بیسویں صدی کے شروع تک رہے، تاہم ان کا اپنا اسلوبِ ادا وہی ہے جو دورِ سرسید سے پہلے کی چیز ہے، ان کی عبارت آرائی کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

''......ہر چند یہ دنیا جسے ہم طلسمِ حیرت کہتے ہیں خود ویسی بے مدار ہے کہ نقش برآب اس سے زیادہ استوار ہے، کسی عبارت سے اس کی بے ثباتی بیاں ہو سکے، دشوار ہے کسی لفظ سے اس کی تعبیر ہو دور از کار ہے۔ جس وقت ہم اس کی بے بقائی لکھنے کو قلم اٹھاتے ہیں جب تک خامہ ہاتھوں سے صفحہ تک پہونچے وہ وقت خود باقی نہیں رہتا......''

(بنام نواب عبدالعزیز خاں)
از انشائے بے خبر

بے خبرؔ کی جملہ تصانیف جو منظرِ عام پر آ چکی ہیں، یہ ہیں:

خونابہ جگر	:	فارسی رقعات و نظم
فغانِ بے خبر	:	اردو رقعات و نثر
رشکِ لعل و گوہر	:	بقیہ مجموعہ نظم و نثر

انشائے بے خبرؔ خواجہ صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں کو لکھے تھے، لیکن ان خطوط اور مضامین کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا جس کی تلاش و جستجو ہونی چاہیے۔ متذکرہ بالا تصانیف کے سوا بھی چھان بین کرنی چاہیے اور ان تحریروں کے واقعی سنہ و تاریخ کا تعین کرنا چاہیے جس سے ہم ان کے ادبی مرتبہ کا درجہ متعین کر سکیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اب یہ امر مشکل کیا ناممکن سی بات ہے۔

☆☆☆

احسن مارہروی حیات وشخصیت

یونانِ ہند بلگرام (اتر پردیش) میں جدامجد سید ابولفرح واسطی زیدی کی اولادیں تھیں۔ جو سید زید شہیدؒ بن سید سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام بن سیدنا امام حسین علیہ السلام بن سیدنا علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہاشمی ومطلبی کے فرزند تھے۔ سید ابولفرح واسطی اپنی فہم وفراست اور تدبر وصلاحیت خداوندی کے سبب، شہرۂ آفاق شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے اپنے عہد کے خلفاء وحاکمین کی بدنیتی اور اپنی جان کے حفظ وتدبر کے خیال سے، واسط (عراق) کی سکونت ترک کرکے، اپنے چار بیٹوں کے ہمراہ پہلے خراسان (ایران) تشریف لے گئے۔ مگر وہاں کے حالات حاضرہ کے سبب حفظ جان کی خاطر، آپ نے غزنی وغیرہ کے علاقوں سے بھی ترک سکونت کا ارادہ کیا۔ اور اپنے چھوٹے بیٹے سید معین الدین زیدی کے ہمراہ واسط (عراق) واپس تشریف لے گئے۔ لیکن آپ کے تین بیٹے سید داؤد، سید ابولفراس، اور سید ابوالفضائل نے ہندوستان کا ارداہ کیا اور سرکار دہلی نے آپ سب کے احترام واعزاز کے مدنظر چار مواضعات علاقہ پنجاب کے مظفر نگر کے علاقے میں عطا کئے۔ ان بھائیوں کی کرامت وفیوض وبرکات کے سبب اسلام کی روشنی پھیلی اور سادات بابرہ یا سادات بارہہ کے موجد کہلائے۔ یہاں تک کہ سید محمد بن سید علی، جداعلیٰ: سادات زیدی: نے جو قطب الدین بختیار کاکی عروشیؒ کے مرید خاص تھے۔ اور سلطان شمس الدین التمش کے خاص معتمدین واراکین میں سے تھے۔ اپنے مرشد حضرت بختیار کاکیؒ کی وساطت وحمایت سے تسخیر پرگنہ بلگرام کی اجازت خاص حاصل کی۔ اور مقامی راجہ سری کے مقابلہ آرائی کے لئے فوج شاہی کی سربراہی کرتے ہوئے، جنگ کی اور راجہ سری اور اس کے سپاہیوں کو ختم کرکے، اس علاقے کو فتح کرلیا۔ پھر اس کا نام: بلگرام: رکھا۔ جو سال ۶۱۴ھ میں فتح کیا تھا۔ سید محمد صغریٰ بن سید علی زیدی جو سادات صغریٰ کے بانی وموجد تھے، آپ نے ۶۴۵ھ میں وصال فرمایا۔ بلگرام آپ کا مدفن قرار پایا۔

عہد اکبری کی تالیف: آئین اکبری: میں بلگرام کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے۔

"..........بلگرام ایک قصبہ ہے۔ جہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔ بلگرام کے لوگ (سادات) اپنی فہم وفراست میں مشہور ہیں۔ بلگرام میں ایک کنواں ہے جس کی بابت مشہور ہے کہ چالیس روز اس کا پانی پینے سے فہم و فراست اور ظاہری و جاہت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ : سجن کنواں : کے نام سے مشہور ہے"۔

اس اعلانیہ کے مطابق عرصہ دراز تک بلگرام کے افراد کی خوشبو یکساں رہی۔ اور بلند پایہ ونام آور شخصیتوں نے جنم لیا۔ جس میں سید حسین دادا پیرؒ، خواجہ عمادالدینؒ بلگرامی، اور سید عبدالواحد بلگرامیؒ۔ حضرت شاہ اویس بلگرامی، شاہ سید عبدالجلیل بلگرامی۔ شاہ سید برکت اللہؒ، شاہ سید آل احمد بلگرامی اعرف آل میاں، شاہ سید نجات اللہ عرف شاہ میاںؒ، سید مبارک محدث بلگرامی، علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامیؒ اور سید مرتضیٰ حسین بلجرامی زبیدی کے سوا شاہ سید اسماعیل چھیما بلگرامی اور حضرت سید صاحب عالم تخلص صاحب وغیرہ نامی گرامی شخصیتوں نے اپنے افکار وخدمات علمیہ سے بلگرام اور دیگر علاقوں کو نوازا۔ پھر بلگرام کے سوا جس دیار کا رخ کیا، خواہ مارہرہ ضلع ایٹہ ہو یا اناؤ۔ کواتھ (بہار) ہو یا حیدرآباد (دکن) وغیرہ کی سرزمین، ہر مقام کو بلگرام سے آشنا کرایا۔ اور سبھی نے اپنا لاحقہ بلگرام سے رکھ کر، اپنے نام کے ہمراہ بلگرام کی وطنیت وعلاقایت کو مفتخر خیال کیا۔

بلگرام کے پہلے فرد جو مارہرہ ضلع ایٹہ تشریف لائے وہ حضرت شاہ سید عبدالجلیل بلگرامیؒ تھے۔ ان ہی کی اولادوں میں شاہ سید علی احسن، عرف شاہ میاںؒ۔ سجادہ نشین سرکار خورد مارہرہ شریف ہوئے۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت شاہ نجات اللہ عرف شاہ میاںؒ بن سید شاہ برکت اللہ پیمی، عشقی، سجادہ نشین سرکار خورد مارہرہ تھے۔ سید علی احسن (۱۸۷۶ء پیدائش) عرف شاہ میاںؒ، تخلص احسن مارہروی کی خدمات علمی وحیات کے سلسلے میں پہلے آپ کا شجرہ اور آپ کی اولادوں کی نسبت معلومات حاصل کرلیں۔

شاہ سید علی احسن، احسن مارہروی

محمد احسن، سعید احسن، انعام احسن، سید احسن، سیدہ انعام فاطمہ

شاہ سید علی احسن، احسن مارہروی کی شادی سیدہ افضال فاطمہ بنت حافظ اجل سید عبدالجلیل بلگرامی ثم مارہروی سے ہوئی تھی۔ جن کی اولادیں نام آور ہوئیں۔ ان کے حالات

الگ صفحات کے متقاضی ہیں۔ بروقت صرف احسن مارہروی سے متعلق قلم اٹھانا مقصود ہے۔

مولانا، حافظ، شاہ، سید علی احسن تخلص احسن مارہروی کے والد ماجد الحاج سید مجتبیٰ حسن بلگرامی زیدی، سجادہ نشین سرکار خورد مارہرہ جو صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ آپ کی علمیت اور تبحر علمی کے متعلق اس دور کے اہل کمال شاہد تھے۔ وہی صفت اور خصوصیت احسن مارہروی کے حصے میں آئی تھی۔ شاہ سید مجتبیٰ حسن بلگرامی اردو فارسی و عربی کے عمدہ شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ حج و زیارات عتبات عالیہ کی خاطر اپنے اہل و عیال کے ہمراہ مکہ (۱۳۱۰ھ) میں تشریف لے گئے تھے۔ زیارت عراق کے بعد آپ اپنی اہلیہ احتشام فاطمہ اور بیٹے علی احسن کے ہمراہ بغرض حج مکہ مکرمہ گئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں سیدہ احتشام فاطمہ بنت سید ابن امام بلگرامی نے چند روز علیل رہ کر قضا کیا۔ اور جنت معلیٰ مکہ مکرمہ میں مقام آخر پایا۔ جو بڑے شرف کی بات ہے۔ یوں کہ خاندان ہاشمی اور مطلبی کے جملہ افراد اسی مقام خاص میں آسودہ ہیں۔ حضرت عبدالمطلب، حضرت ابو طالب، حضرت خدیجۃ الکبریٰ زوجہ اول رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم وغیرہ کی یہی آخری آماجگاہ ہے۔

حاجی سید مجتبیٰ حسن بلگرامی اپنے بیٹے سید علی احسن بلگرامی کے ہمراہ وطن واپس تشریف لائے، مگر بمبئی میں ہی آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور چند روز بعد آپ نے بھی رحلت فرمائی۔ بمبئی ہی میں آپ کی تدفین کردی گئی۔ اس حادثہ جانکاہ اور والدین کے اچانک دائمی رخصتی وجدائی نے علی احسن پر بے حد اثر کیا۔ مگر اپنے پر قابو کر کے اور صبر فرما کر مارہرہ تشریف لائے۔ جہاں چند روز بعد رواج خاندان کے مطابق آپ کی سجادہ نشینی و خرقہ پوشی عمل میں آئی، اور باپ کی وراثت یعنی سجادہ نشینی نصیب ہوئی۔ اگرچہ بعد میں آپ نے اس منصب داری سے واسطہ نہیں رکھا اور نہ ہی آپ کی اولادوں نے اس سے تعلق رکھا۔

خاندان بلگرام کے دستور کے مطابق احسن مارہروی نے ابتدائی تعلیم تو خانقاہ بر کاتیہ کے مکتب میں حافظ عبدالکریم اور میاں جی رحمت اللہ سے حاصل کی۔ اور قرآن پاک کے حفظ کے بعد فارسی، عربی، اور اردو کی تعلیم کے حصول میں لگ گئے۔ انگریزی کی تعلیم کی سمت بھی آپ کو رغبت تھی مگر اس دور کے عام مسلمانوں کے رجحان کے مطابق انگریزی تعلیم کو ان کے والد بزرگوار نے مناسب اور گوارہ نہیں خیال کیا۔ مگر آپ اپنے طور پر تحصیل علم انگریزی کرتے رہے۔

احسن مارہروی نے خاندان کے بزرگوں کی صحبت اور معاشرے کے مزاج کے مطابق علمی جہت سے وابستگی رکھی۔ چنانچہ شاعری آپ کو ورثہ میں ملی۔ ان دنوں مرزا داغ دہلوی اور امیر مینائی کا شہرہ تھا۔ مگر دل کی وارفتگی نے مرزا داغ کی شاگردی پر مائل کیا۔ لہٰذا اول اول خط و کتابت کے ذریعہ شاگردی کا سلسلہ استوار کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے سفر حیدرآباد (دکن) بھی کیا۔ فیض صحبت استاد نے آپ کے شعری محاسن وصلاحیتوں کو جلا بخشی۔ سادگی، معنی آفرینی، پُرکاری، بلند خیالی، صحت زبان، تراش خراش اور الفاظ کے حسن استعمال نے احسن مارہروی کو استاد داغ سے اور زیادہ قریب کردیا۔ اور آپ کا ادبی شعور نئی جہت سے آشنا ہوا۔ اسی لئے شاید داغ نے اپنے شاگرد کو سند خاص عطا کی تھی۔

سید احسن جو میرے دوست بھی، شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکر رسا، طبع رسا

استاد کے اس تصور سے، ان کی صلاحیت اور وجاہت شخصی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی سند خاص نے شاید آپ کو شعبہ اردو مسلم یونیوسٹی علی گڑھ کے اساتذہ میں ۱۹۲۱ء میں منتخب کرادیا۔ شعری، فنی صلاحیت اور علمی و ادبی کاوش نے آپ کو ہر جہت سے بلند بنایا۔ زبان، محاورہ، مصطلحات، تعلقات شعری کا شعور بے حد و بے مثل آپ میں تھا۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ الفاظ کا رکھ رکھاؤ، زبان و بیان پر گہری نظر، ادائیگی الفاظ اور ترکیب بندی، فنی رموز پر دسترس جو دراصل داغ کی شاگردی کا بھی فیض ہے مگر برجستگی، ندرت، جودت، اور شگفتگی و معنی آفرینی کو پیش نظر رکھنا احسن مارہروی کا کمال تھا۔ مثلاً

بے داغ ہے دل یہ گماں ہو نہیں سکتا
ایسا کوئی رہنے کا مکاں ہو نہیں سکتا
ان کی سی نگاہِ شرر آمیز نہ ہوگی
میرا سا جگر شعلہ فشاں ہو نہیں سکتا

ان دو شعروں میں جو لطافت، واقعہ نگاری اور کسک ہے یہی احسن مارہروی کا شعری وصف خاص ہے۔ یا یہ شعر

آبرو ضبط نے رکھ لی دم گریہ میری
اشک کے موتیوں کو اس نے بکھرنے نہ دیا

یہی نہیں، اس غزل کا یہ شعر کیف سے مملو نظر آتا ہے۔

عشق نے بحر مصیبت میں ہمارے دل کو

ہائے اس طرح ڈبویا کہ ابھرنے نہ دیا

اس شعر سے اگر لفظ ہائے کو نکال دیا جائے۔ تو مصیبت دوگنی ہو جائے گی۔ اور اگر بحر مصیبت کو نظر انداز کر دیا جائے تو شعر مہمل کہلانے کا مستحق ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ احسن مارہروی کا کلام صاف، ستھرا، اور غنایت سے بھی بھر پور ہے۔ اسی طرح ان کی نظمیں پند ونصائح کا، اتحاد قومی، عظمت اسلامی، حب وطنی کا مرقع ہیں۔ بے حد خوبصورت اور یادگاری ہیں۔ یہی نہیں موصوف نے ابتدائی درجوں کے معصوم بچوں تک کا خیال رکھا ہے۔ اور لطیف کہاوت وقصے وتربیت ذہنی کو مدنظر رکھ کر جو بے مثال، مثالیں نظم کی ہیں وہ ایک باکمال اور عظیم المرتب شاعر کے لئے مشکل مرحلے کی بات ہے۔ مگر احسن مارہروی نے ہر صنف کا خیال رکھا ہے ورنہ جو انشاء پرداز ہو، نثر نگار ہو، لسانیات کا ماہر ہو، شعری فن امور کا استاد اور عروض وقواعد کا بے مثال فرد ہو، اس سے بچوں کے ادب کا توقع کرنا، اور خود موصوف کا طبع آزمائی کرنا وصف خاص کی بات کہلانے کی مستحق ہے۔

احسن مارہروی طبعاً خوش گو، خوش مزاج، باوضع، سنجیدہ، متین اور باوقار شخصیت کے فرد تھے۔ متواضع اور مہمان نواز یہ صفت آپ کو خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ جو علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی (۱۰۷۱ھ ولادت) اور شاہ حضرت برکت اللہ پیمی تخلص (۱۰۷۰ھ رحلت) اور شاہ سید آل محمد بلگرامی (۱۱۱۱ھ ولادت) اور شاہ سید محمد حقانی (۱۲۱۰ھ وفات) کے علمی محرکات پر مبنی ہے۔ موصوف کے علمی کارنامے طویل ہیں۔ ان میں سے چند تالیف درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ کلیات ولی (تدوین ومقدمہ) ۲۔ منثورات جو دراصل تاریخ نثر اردو عہد بہ عہد، زبان ومثال زبان کی ترقی پر اول بار دنیائے اردو میں تحریر کی گئی۔ اس سے نثر اردو کی تاریخ وار منزل کی آگہی ہو جاتی ہے۔ ۳۔ جلوۂ داغ۔ سوانح مرزا داغ، یہ احسن مارہروی کی تصنیف اول ہے۔ جس سے آپ کی نثری صلاحیت اجاگر ہوتی ہے ۴۔ یادگار داغ۔ مجموعہ کلام مرزا داغ ۵۔ انشائے داغ۔ مجموعہ مکاتیب داغ۔ ۶۔ منتخب داغ۔ چار دواوین کو حُسنِ کلام کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ یادگار داغ۔ اور مہتاب داغ۔ اس سے احسن مارہروی کے نقد وترتیب وتدوین کی آگاہی ہوتی ہے ۷۔ فصیح اللغات۔

امیر اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے طرز کو مدنظر رکھ کر، مرتب کیا گیا۔ خود احسن مارہروی کا خیال ہے کہ۔

"..........اس میں بظاہر وہ الفاظ، محاورات، کلمات اور نام ہیں جو داغ نے اپنے کلام (شاعری) میں لکھے"۔

اس رسالے کی تصنیف دراصل احسن مارہروی کی جو کمزوری تھی کہ زبان و بیان کی غلطی کو برداشت کرنا، ان سے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کی بابت میں ان کا فرمان تھا۔

"..........زبان کی غلطی کیسے سن لوں؟ ساری عمر اسی میں گذری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھا یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا ہو"۔

موصوف کی قادر الکلامی اور فن پر ایک نامور محقق پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضمون کا یہ تراشہ ملاحظہ ہو۔

"..........رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور شرافت خیالی و مقالی سے مقبول اور ادبی مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہ معلوم ہوتی وہ دوسرں سے پوچھ لیتے۔ خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا ہو۔ مطلق تامل نہ کرتے۔ اکثر دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں، باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آ گیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرہا ہوا، فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ یہ محسوس ہوتا کہ کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی تامل کے، سب کو چھوڑ کر لائبریری چلے جاتے۔ وہاں بھی کام نہ چلتا تو کئی کئی دن اسی اُدھیڑ بُن میں رہتے۔ آخر بات واضح ہو جاتی تو خوش خوش آن کر اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے"۔ (گنج ہائے گراں مایہ۔ ص ۱۶۷)

اس رخ سے احسن مارہروی کے یہاں تحقیقی کاوش اور علمی شغف کا رجحان ملتا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سوا پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے۔

شعری و نثری کارناموں کے سوا، صحافت کے سلسلے میں ماہنامہ: ریاض سخن: سے اس کی ابتدا کی تھی۔ جو مارہرہ شریف سے نکالنا طے کیا تھا۔ یہی نہیں، اپنے استاد داغ دہلوی کی وفات کے بعد ان کے نام اور کلام کو زندہ رکھنے کی خاطر موصوف نے: فصیح الملک: کے

نام سے لاہور سے ایک رسالے کی طرح بھی ڈالی تھی۔ جس کی مدت حیات پانچ سال تین ماہ رہی۔ اس کے بعد حالات کے اقتضا نے اسے ملتوی کرا دیا۔

احسن مارہروی کا ایک اور علمی کارنامہ ایسا ہے جس کی آگاہی کم اشخاص کو ہے۔ لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ پانی پت کے مولانا الطاف حسین حالی نے عورتوں کی بے بسی، ناچارگی، خاموش طبعی کے مدنظر : چپ کی داد : ایک نہایت دل کش، دل سوز اور کسک و معلوماتی نظم کہی۔ جس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی تھی۔ ابتدائی دو شعر اول و آخر ملاحظہ ہوں۔

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
یہ جیت کیا کم ہے کہ خود حق ہے تمہاری پشت پر
جو حق کے منہ آیا، آخر اس نے منہ کی کھائی ہے

اس نظم کے جواب میں یا مثیل، احسن مارہروی نے : چپ کی فریاد : نامی نظم کہی۔ پہلا بند یہ ہے۔

اے باپ بیٹوں، بھائیوں، ہم کو شکایت تم سے ہے
غیروں سے ہو کیا واسطہ، اپنی قرابت تم سے ہے
بے درد یا ہمدرد، ہے، عورت کا وارث مرد ہے
ہر حال میں اس کے لئے دنیا کی عزت تم سے ہے

اس طویل نظم کے آخری حصے کے یہ اشعار لائق مطالعہ ہیں۔

جس چپ کی لی تھی داد کل، اس چپ کی ہے فریاد آج
ہیں منتظر تاثیر کے، گود اس لئے پھیلائی ہے
فریاد ہے اللہ سے، یا اب رسولؐ اللہ سے
سنتا ہے کوئی اور کب، دنیا پہ غفلت چھائی ہے
اے شاہؐ بحروبر تو ہی مردوں کو ہمت کر عطا
توڑیں وہ اپنے عہد کو جھوٹی قسم کیوں کھائی ہے؟
بے پردا نہ ہوں تفریح کو، در پردہ یہ خواہش نہیں

لیکن طبیعت جہل کے پردے سے اب گھبرائی ہے
عورت میں ہیرے کی طرح، جوہر بہت سے ہیں نہاں
لیکن نہ ہو ترشہ ہوا، ہیرا تو قدر اس کی کہاں؟

آخری حصہ نظم : چپ کی فریاد : میں جو پیغام پوشیدہ بلکہ عیاں ہے وہ اپنی مثال آپ اور احسن مارہروی کے دل کی آواز ہے۔ جو دراصل وقت کی آواز کہلانے کی مستحق ہے۔

احسن مارہروی کی ایک اور تصنیف جس کا ذکر سطور بالا میں نہیں کیا گیا ہے وہ :

تحفہ احسن : کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا منظوم قطعہ ملاحظہ ہو۔

۱- مالی نے سخن کے اک کھلایا ہے چمن — بھر لیں پھولوں سے بچے اپنے دامن
تحفہ سے ہوا اسم با مسمیٰ احسن — کہتے ہیں بجا اس کو مثلث مثلاً

۲- لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل
جو شخص کے اپنے کو بتائے قابل — اس سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی جاہل
ان جلوہ فروشوں کی حقیقت کیا ہے — لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل

۳- ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟
ہم تمہیں کیا بتائیں اے بچوں — مربی کیا ہے، قدسی کیا ہے
پڑھ کے خود کیوں سمجھ نہیں لیتے — ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟

منظوم کہاوتوں اور کہانیوں کے اس مجموعہ کو احسن مارہروی نے بچوں کے لئے، آسان، ہلکی، پھلکی زبان میں، بچوں کی لیاقت اور عمر کو پیش نظر رکھ کر نظم کیا ہے۔ گویا ایک آفاقی شاعر کا یہ بچوں کے لئے نایاب تحفہ ہے۔

رثائی، حزنیہ اور غم زدہ، نوحہ، سلام، اور مرثیہ کے ضمن میں ان کا مجموعہ: کارنامۂ غم: سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کو نذرانہ ہے۔ یہ مقتل نامہ احسن مارہروی نے ۱۳۵۷ھ میں یعنی اب سے ۵۷ سال قبل نظم کیا تھا۔ چند رباعیات وسلام کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ آنکھ نہیں تر جو محرم میں نہیں — وہ دل نہیں مغموم جو اس غم میں نہیں
سن کے غم شبیر نہ رونے والا — ممکن ہے کہ ہو بشر، مگر ہم میں نہیں
جو شاہ کی محفل عزا میں آئے — وہ ظل حمایت خدا میں آئے
اب فکر قضا و خوف دوزخ کیسا — جب جیتے جی جنت کی ہوا میں آئے

سلام کے چند شعر جو اہل مجلس کی پسند کے ہیں۔

مختصر ہے اور جامع یہ بیانِ کربلا ‏ ‏ ‏ شرح بغض دوستاں ہے داستان کربلا

جان دی لیکن نہ جانے دی کسی نے اپنی آن ‏ ‏ ‏ تھا وفا میں کامل اک اک مہمان کربلا

کعبۂ مقصود احسن حضرت شبیر ہیں ‏ ‏ ‏ مرکز اہل یقیں ہے آستان کربلا

عدو کے جور سے شبیر کو مدینے میں ‏ ‏ ‏ ملا نہ گوشۂ راحت کوئی اماں کے لئے

یاد گار غم شبیر ہے روز عاشور ‏ ‏ ‏ حشر تک اس کو نہ بھولے گیں زمانے والے

جو منکر حسینؑ ہوئے ، مرتضا کے بعد ‏ ‏ ‏ گویا پھرے خدا سے ، رسولؐ خدا کے بعد

احسنؔ قوی امید شفیع الامم سے ہے ‏ ‏ ‏ لے جائیں گے بہشت میں روزِ جزا کے بعد

رثائی وحزنیہ کلام میں احسن مارہروی نے تاریخ اسلامی، تاریخ عاشورہ کو مدنظر رکھ کر نظم کرنا ضروری خیال کیا۔ یہی نہیں آپ نے اپنے دیباچہ کے آخری الفاظ میں اس طرح اظہارغم کیا ہے۔

"......سید الشہدا علیہ السلام کے غم و ماتم میں رونا، رولانا۔صبر وشکر کرنا مناسب ومفید جانتا ہے"۔ (کارنامۂ غم۔ص۳)

احسن مارہروی کے ادبی واقعات میں ایک اہم واقعہ بھی سن لیں،

احسن مارہروی کے ہمعصر اور سمدھی حاجی سید آل حسین صاحب بلگرامی نے قصبہ کواتھ (بہار) سے خط بطور شکوہ مارہرہ روانہ کیا جس میں لکھا کہ "بہت دنوں سے نہ کوئی خطِ خیریت آیا، نہ تم آئے۔کم از کم ایک تصویر تازہ ہی روانہ کرادو۔ احسن مارہروی نے تعمیل مکتوب میں ایک تصویر کشید کرائی اور لوح تصویر پہ یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

اپنی تصویر کی تقدیر پہ احسن ہے رشک ‏ ‏ ‏ یہ منگائی گئی، لیکن میں بلایا نہ گیا

تصویر اور مکتوب جب جدی سید آل حسین صاحب بلگرامی کو ملا، تو موصوف نے شکریہ کا خط اور ایک شعر لکھ کر ارسال کر دیا۔شعر یہ ہے۔

تصویر تم نے بھیجی میں نے دیکھی غور سے ‏ ‏ ‏ سب ادا اچھی، خموشی کی ادا اچھی نہیں

تصویر بولتی کہاں ہے۔مگر شکوہ کا انداز اور مطالبہ قابل غور ہے۔ایسے بہت سے واقعات مرحوم احسن مارہروی کے ہیں جو الگ مضمون کے متقاضی ہیں۔

احسن مارہروی کے شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔جو ہندوسندھ میں پھیلا ہوا

ہے۔ دراصل اصلاح کلام کے واسطے سے ان کا دروازہ علم ہمیشہ کھلا رہا۔ لہٰذا اصلاح سخن کے لئے بھی آپ سے لوگ رجوع رہتے تھے۔ ایسے شاگردوں میں چند کے نام یہ ہیں۔

حضرت ابر احسنی گنوری، مست گنوری، صغیر احسنی مظفر نگری، نواب زادہ عمار احمد خان، رئیس مینڈو مشکور علی خاں، عبدالحمید منظر باغپتی، راز مراد آبادی، اور احسن مارہروی کے دوسرے بیٹے سید سعید احسن مارہروی وغیرہ۔ ان تمام تلامذہ میں حضرت ابر احسنی کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے رامپور سے تین سال تک اپنے استاد کے نام نامی سے رسالہ: احسن: کی اشاعت کی۔ یہ عقیدت کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔

مولانا حافظ حاجی سید علی احسن، احسن مارہروی کے ہم عصر، ہم سن اور شاگردوں میں صاحب طرز ادیب کی تعداد خاصی ہے جنھوں نے موصوف کی حیات پر قلم اٹھایا۔ اپنی نگارشات میں ان کی ادبی قادر الکلامی اور زبان کی صحت کی سمت ان کی توجہات کو سراہا۔ ایسے اشخاص میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، محمد سعید، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، مرزا علی حسن لکھنوی، صابر حسین جلیسری، جلیل قدوائی، ساجد علی خان راز، رئیس احمد جعفری، زاہد حنا، احمد علی، اسعد بدایونی، سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، پروفیسر حاذق صاحب اور احسن مارہروی کے چھوٹے بیٹے سید احسن ایم اے۔ ڈاکٹر سید انعام احسن حریف، سید تقی رضا بلگرامی کے سوا پروفیسر مختار الدین آرزو وغیرہ کے نام سرِ فہرست لکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اہم اور نادر تحریر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دستخطی راقم کے پاس محفوظ ہے جس میں مولوی صاحب نے احسن مارہروی کی علمی صفات و ہمہ دانی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مولانا حافظ شاہ سید علی احسن، عرف شاہ میاںؒ استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کلام کے چند اشعار کے بعد دو غیر مطبوعہ غزلیں، نذر قارئین کی جاتی ہیں۔ پہلے کلام احسن کے دو شعر مطالعہ کرلیں۔

جستجوئے یار میں کیا کیا پریشانی ہوئی شہر چھوٹا، پاؤں ٹوٹے، خانہ ویرانی ہوئی

یا یہ شعر

ایک احسن کی جگہ خالی بھری محفل میں ہے تیری بزم ناز میں تھیں جمع ساری خوبیاں

اس شعر سے خالی کا لفظ نکال دیا جائے تو شعر مہمل کہلانے کا مستحق ہوجائے گا۔ شاعر کا یہی کمال ہے کہ لفظ نگینہ کا کام انگشتری میں دے۔

غیر مطبوعہ کلام احسن مارہروی

خواب میں ہم نے تجھے رشکِ قمر دیکھ لیا / ڈال کر پردۂ شب ، روئے سحر دیکھ لیا
اس نے دل دیکھ لیا، اس نے جگر دیکھ لیا / اپنا اپنا خلش و درد نے گھر دیکھ لیا
اب تک فسانۂ نیرنگ جہاں سنتے تھے / آ کے باتوں میں تیری شعبدہ گر دیکھ لیا
شاملِ محفل جاناں ہوں ، یہ تقدیر کہاں / کبھی اس راہ سے گزرے، تو ادھر دیکھ لیا
سعی مشکور رہِ شوق میں یوں ختم ہوئی / تجھ کو پہچان لیا، غیر کا گھر دیکھ لیا
دل کے آنے کو نہ کیوں جان کا جانا سمجھوں / درِ الفت جو کھلا، موت نے گھر دیکھ لیا
جب مجھے اک نگہ ناز سے تسکین نہ ہوئی / اس نے پھر مڑ کے باندازِ دیگر دیکھ لیا
نہ ملی سیل حوادث سے کہیں مجھ کو پناہ / میں نے ساحل کو بھی بادیدۂ تر دیکھ لیا
مل گئی دادِ غم عشق کہ احسن اس نے / سن لیا قصۂ دل ، زخم جگر دیکھ لیا

۸ر فروری ۱۹۳۹ء

غزل دوم غیر مطبوعہ

مجھے خبر نہیں غم کیا ہے اور خوشی کیا ہے / یہ زندگی کی ہے صورت، تو زندگی کیا ہے؟
جو مانگے وہ ملے، اک عیش ہی کیا ہے / خدا کے گھر میں کسی چیز کی کمی کیا ہے
نہ دل میں جوش ہو جس کی وہ آدمی کیا / جیئے تو مردہ دلی سے، تو زندگی کیا ہے
فغاں تو عشق کی اک مشق ابتدائی ہے / ابھی تو اور بڑھے گی یہ لے، ابھی کیا ہے
گلی میں ان کی جو پہونچا، وہ دل کو رو بیٹھا / یہ رہزنی ہے حقیقت میں، دلبری کیا ہے
تمام عمر اسی رنج میں تمام ہوئی / کبھی یہ تم نہ پوچھا، تری خوشی کیا ہے
تم اپنے ہو تو نہیں غم کسی مخالف کا / زمانہ کیا ہے، فلک کیا ہے، مدعی کیا ہے
نثار کیجئے اس شکریہ میں جان عزیز / وہ پوچھتے ہیں، مری خواہش دلی کیا ہے
وہ حلق پر ہی رہے، دل میں یہ اتر جائے / مقابل اک نگہ ناز کے، چھری کیا ہے
نہیں بہشت کی حوروں میں بھی جواب ان کا / پری کو لوگ لئے پھرتے ہیں، پری کیا ہے؟
دلوں کو کھینچ رہی ہیں کسی کی مست آنکھیں / یہ دلکشی ہے تو پھر عذر مے کشی کیا ہے
صلاح کار بنایا ہے مصلحت سے اسے / وگرنہ ناصح ناداں کی دوستی کیا ہے
مذاق عشق کو سمجھو گے یوں نہ تم ناصح / لگا کے دل کہیں دیکھو، یہ دل لگی کیا ہے

ازل میں قادر مطلق نے دے کے حکم سجود
بنادیا یہ فرشتوں کو، آدمی کیا ہے
وہ رات دن نہیں ملتے، تو ضد نہ کر احسن
کبھی کبھی کی ملاقات بھی، بُری کیا ہے

۱۲/۱۰/۱۹۳۶ء

حافظ شاہ سید علی احسن بلگرامی زیدی الواسطی، احسن مارہروی عرف شاہ میاں سجادہ نشین سرکار خورد، مارہرہ شریف نے ۶۴ سال کی عمر پا کر ۳۰-اگست ۱۹۴۰ء کو مرض کاربنکل میں پٹنہ میڈیکل کالج میں قضا کیا تھا۔ جہاں آپ کے ایک بیٹے ڈاکٹر سید انعام احسن، حریف تخلص بحیثیت معالج ملازم تھے۔ مگر آپ کی لاش آبائی قصبہ مارہرہ شریف کے درگاہ برکاتیہ میں لا کر دفن کی گئی۔ جو آپ کے اب وجد کا مرقد ومکتب بھی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ سب سے آخر میں ایک نادر یگانہ نظم بنام تقسیم اوقات۔ جو اب سے ۷۹ سال قبل کی ہے۔ پیش خدمت ہے۔

تقسیم اوقات

یہ نظم ۱۹۲۲ء میں حضرت احسن مارہروی مرحوم نے اڈیٹر اخبار ''ریاست'' دہلی کی فرمائش پر ارشاد فرمائی تھی۔ بے حد مقبول ہوئی اور متعدد جگہ شائع ہوئی ہے آج ان کی برسی کے سلسلہ میں قارئین کے لیے قند مکرر کے طور پر حاضر کرتے ہیں۔

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل
کیا حسنِ عمل دفترِ عصیاں میں ملے گا
اوقات ہیں بے ضابطہ حالات ہیں بے ربط
ہر وقت وہ فکر وغمِ دوراں میں ملے گا
اس پر بھی ہے اصرار کسی کو تو وہ سُن لے
آوارہ دورنگی کے بیاباں میں ملے گا
یا صبح کو ہوگا وہ مصلے پہ نمایاں
یا خفتہ کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا
جب تک نہ ڈھلے دوپہر اس وقت تک اس کو
ڈھونڈو گے تو اطفال دبستاں میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک
سویا ہوا بیٹھا ہوا ایواں میں ملے گا
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک
مشغول ملاقات عزیز اں میں ملے گا
ہوگی پس مغرب جو تلاش اُس کی تو اکثر
پڑھتا ہوا کچھ بزم شبستاں میں ملے گا
ہوگا انہیں اَوقات میں جو وقت میسر
سرگرم عمل شعر کے میداں میں ملے گا
جب تا بہ کمر زلف شب آئے گی تو اُس کو
پہلوئے سکوں خوابِ پریشاں میں ملے گا
القصہ جو ہے آج یہاں محو تکلم
لب بستہ وہ کل شہرِ خموشاں میں ملے گا

☆☆☆

بولتی ہوئی خاموشی

(پروفیسر عبد العلیم)

اب کہاں ڈھونڈیں انھیں، ان کا پتہ چلتا نہیں
ان سا انسان، ان سا ہمدرد، آشنا ملتا نہیں

ہندوستان کے ایک قدیم شہر جو اگرچہ اتر پردیش کے مشرقی حصہ میں واقع ہے اور نسبتاً کوردہ علاقہ ہے مگر اس خطہ میں بہت سے ایسے افراد نے جنم لیا جو علم و فن کے اعتبار سے، تسلیم گزاروں کی صف میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان ہی اشخاص میں پروفیسر عبد العلیم بھی تھے۔ ان کی پیدائش کا سال اگرچہ تعلیمی ریکارڈ کے مطابق ۱۹۰۶ء ہے، مگر خود علیم صاحب نے ایک تذکرہ میں فرمایا تھا کہ 'ضرورت شعری کی طرح میری تاریخ بوقت داخلہ اسکول بجائے ۱۹۰۷ء کے ۱۹۰۶ کی گئی۔ ورنہ میرا داخلہ کم عمری کی وجہ سے اسکول میں اس سال نہ ہوتا۔ ویسے ہم آپ آگاہ ہیں کہ پہلے ان امور پر توجہ نہ دی جاتی تھی جو آج مروج ہے۔ ہمارے دور میں اسکول کے ریکارڈ میں ماں کے نام کا اندراج ہونا فہم سے بالاتر بات تھی۔ مگر آج ہر مرحلہ پر اسے لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔

ہمارا خاندان علمی طور پر آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے اکابر کا نام عز و احترام سے لیا جاتا تھا۔ آج ہم تنزلی کا شکار ہیں مگر اسے ہر کمالے را زوال کے مصداق کہنا اور سوچنا ہوگا۔ اس تنزلی کے باوجود بھی ایسے افراد باقی ہیں جو خاندان بلگرام کے افراد کو بنظر احترام دیکھتے اور مانتے ہیں۔ وجہ اس کی کیا ہے، خدا علیم ہے۔ خود میری ذات اگرچہ کوئی تشخص کی حامل نہیں۔ مگر اہل علم نے ہمیشہ اعتباری خیال کیا۔ پروفیسر شیخ عبد الرشید، سابق صدر شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر سید نور الحسن، سابق صدر شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جو بعد میں وزیر تعلیم حکومت ہند اور گورنر مغربی بنگال کے عہدے سے وابستہ ہوئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نیز صدر مملکت ہند۔ الحاج سید حامد، چانسلر جامعہ

ہمدرد، پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی، گورنر ہریانہ وغیرہ۔ نے ہمیشہ ایک اخلاص خاص رکھا۔ ذاکر صاحب جب گورنر بہار تھے۔ میں ان دنوں پریس انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی سے وابستہ تھا۔ میں نے ایک خط اور چند عنوانات لکھ کر، موصوف کو اس کی خانہ پُری کے لیے روانہ کرنے کی جسارت کی۔ مقام شکر ہے کہ ذاکر صاحب نے اپنی مصروفیت بے پناہ کے باوجود اُس خط کی گزارش کو قبول کیا، اور اپنے مختصر حالات زندگی، مع ایک خصوصی تحریر کے، مجھے ارسال کیا۔ جو بعد میں 'حیات ذاکر' میں شریک کیا گیا۔ (یہ تصنیف اگر چہ ذاکر صاحب کی حیات میں مرتب ہو چکی تھی مگر ابھی پریس کے مراحل سے گزر رہی تھی کہ قضائے فرشتہ نے عجلت کی اور بحکم رب اکبر، ذاکر صاحب کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت جامع کمالات تھی اور وہ انسانی صفات کے رمز شناس بھی تھے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے) اور پھر ترقی اردو بورڈ کی ڈائریکٹر محترمہ فہمیدہ خاتون نے اس خط و تفاصیل ذاکر صاحب کو، اپنی تصنیف میں شریک کیا۔ مگر حوالہ دیئے بغیر۔ جو ایک اخلاقی اور عملی مجرمانہ فعل ہے، ورنہ وہ بتائیں کہ یہ مختصرترین تفصیل از قلم ذاکر صاحب انھوں نے کب حاصل کی تھی؟ میں اپنے علم کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ موصوفہ نے کبھی ذاکر صاحب سے ملاقات بھی نہ کی ہوگی۔

اس تفصیل سے مدعا صرف اس قدر ہے کہ پروفیسر عبدالعلیم کی ذات وصفات سے جو لوگ متاثر تھے اور جن سے میرا واسطہ کسی نہ کسی حد تک رہا۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سوا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شریک وسہیم تھے۔ چنانچہ علم وادب کی دنیا اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ بلکہ بنیادی انفرادیت میں علیم صاحب کی شخصیت نمایاں حیثیت کی مالک تھی۔ ایک علمی مجلس میں ترقی پسند مصنّفین کی بے راہ روی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ مخلوق خدا پر جو شفقت رکھے، وہی ترقی پسندی کا ضامن کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اس جملہ کے تحت علیم صاحب کی حیات کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ اس کے مصداق نکلیں گے۔ یہ بات کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ رشید احمد صدیقی صاحب ترقی پسند تحریک سے عرصہ دراز تک منسلک رہے ہاں اس کے اجلاس میں شرکت تو کرتے مگر اپنی رائے محفوظ رکھتے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کو شہرت اس ذیل میں نہ مل سکی، نہ کی گئی۔ اگر چہ ہم یہ بات کمال افسوس کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں نے علیم صاحب کی شخصیت، انفرادیت، علمیت اور ان کے تشخص سے انصاف کرنے کی سعی نہ کی۔ یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اردو دنیا میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جو اس منصب پر اس وقت فائز

ہوتا کہ مملکت روس اسے اپنا 'معتبر' تسلیم کرے۔ بہت کم اشخاص اس رمز سے واقف ہوں گے کہ مملکت روس میں ان کی جامع شخصیت کا، علمی صلاحیت کا، تدبر اور بروقت فیصلے ونکات اور شعوری بالیدگی کا اعتراف کیا جانا طے کرلیا گیا تھا اور ایک فرد خصوصی طور پر ہندوستان بھیجا گیا۔ موتی باغ نئی دہلی کے قیام گاہ پر اس نے علیم صاحب کا انٹرویو تقریباً نصف گھنٹہ لیا۔ اور جاتے وقت ان سے مصافحہ کیا اور ایک ایسا فقرہ کہا جس کا مفہوم ہی میں بیان کرسکتا ہوں کہ 'روس انتظار کرے گا' بعد میں جب علیم صاحب سے اس شخص کی بابت ہمت کرکے دریافت کیا تو کہا 'روسی سفارت خانہ سے انٹرویو لینے آیا تھا' یہی نہیں حکومت ہند کے ایک ذمہ دار فرد نے ذکر کیا۔ اگر علیم صاحب زندہ ہوتے تو مہاراشٹر کے گورنر ہونا طے ہو چکا تھا۔ میں نے تمسخر سے کہا 'ان کے لیے گورنری کوئی معراج کی بات نہ تھی، افسوس اس امر کا ہے کہ وہ علمی، تہذیبی اور فکری شخص تھے مگر ان سے وہ کام نہ لیا جا سکا۔ جس کے وہ مستحق تھے۔ دراصل علیم صاحب میں گروہ بندی کا ملکہ نہ تھا۔ صاف گوئی اور حق پسندی ان کا شیوہ تھا۔ ممکن ہے آپ اس رائے سے متفق نہ ہوں مجھے اس پر اصرار بھی نہ ہوگا۔ مگر ان کے یہاں مشرقی لوازم جس حد تک تھے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ان کا لباس، ان کا انداز گفتگو، خاموش مسکراہٹ اور پاس داری، وضع داری اس امر کی غماز ہیں۔ بہت سے واقعات میں سے چند تو میں شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مجلّہ 'علیم صاحب' میں بیان کر چکا ہوں۔ آج ان کی تجدید نہ کروں گا مگر نئے واقعات بدیہی کا ذکر کرکے، فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔

علیم صاحب پر قرآن پاک کے سلسلہ میں جو ان کا تحقیقی مقالہ 'متعلق اعجاز القرآن' تھا۔ بہت شدید حملے کیے گئے ہیں۔ ایک بار ان سے قیام چنڈی گڑھ میں ذکر آ گیا۔ موصوف نے نگاہ خاموش اٹھا کر فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کرام نے قرآن پاک کی حرمت اور عظمت کو جو سوالیہ نشان بخشا اور بعد وفات رسول، خلیفہ اول نے جب قرآن کو حفاظ وغیرہ کے ذریعہ قلم بند کرانے کا کام شروع کیا تو کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ حضرت عمر کے دَور میں، جو کلام پاک کہا جاتا ہے کہ جناب عائشہؓ کے پاس جمع شدہ تھا، اس کے بجائے حضرت حفصہ کے نسخہ کو بنیاد بنانے کی طرح ڈالی گئی۔ کیا یہ اختلافی امر انجام دیا گیا، پھر بھی میرے مقالہ کو اس یا اس جیسی بحث سے کوئی واسطہ نہیں۔ ضرورت تھی کہ علماء کرام میرے مقالہ کا مطالعہ کرتے اور جن امور پر ان کو حق بیانی سے متعلق اختلاف تھا، اس کی نشان دہی کرتے، تاکہ مقالہ نگار اس سمت کی شناخت کرکے، صحت مقالہ کرتا، مگر وہاں دانش وری کے خلاف تعصبی نظریہ

اپنایا گیا۔ محض اس لیے کہ میرا تعلق ترقی پسند گروہ سے تھا۔ بین مذہبی ناموری کا دیوتا نہ تھا۔

میں علیم صاحب کی گفتگو سن کر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کے چہرے کا رنگ جیسا ہو گیا تھا اس کو کوئی مصور یا موقلم کا فرد منعکس نہیں کرسکتا تھا۔

ایک واقعہ سٹی اسکول کے ایک استاد کے ساتھ درپیش ہوا وہ اردو میں ایم۔اے تھے مگر چاہتے تھے کہ انگریزی مین ایم۔اے. کریں۔ قاعدے کے مطابق انھوں۔ نے درخواست یونیورسٹی کو دی۔ پرنسپل نے NOC لکھ کر دے دیا۔ اب پرو وائس چانسلر کی منظوری کے لئے فائل رجسٹرار نے بھیج دی۔ مگر موصوف نے اسے روک لیا۔ داخلہ ختم ہونے میں جب دو روز رہ گئے تو وہ ٹیچر دریافت حال کے لیے رجسٹرار سے ملے انھوں سے بتایا کہ پرووائس چانسلر کے یہاں فائل گئی ہوئی ہے۔ وہ ٹیچر پرووائس چانسلر آفس آئے اور نظامی صاحب سے بہزار وقت و خرابی ملاقی ہوئے۔ موصوف نے فرمایا کہ دوسرا ایم۔اے. کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب یونیورسٹی ایسے فاضل امتحانات کی اجازت نہیں دے سکتی۔ صرف ایک دن داخلہ کا باقی رہ گیا تھا۔ موصوف غم زدہ وائس چانسلر سے ملنے آئے۔ دریافت کیا۔ وجہ ملاقات تو بتایئے۔ انھوں سے پوری داستان سنادی۔ ان سے کہا کہ شام کو ۵ بجے آیئے۔ ملاقات کرادوں گا۔ مگر ایک درخواست لیتے آیئے گا اس پر پرنسپل کی سفارش بھی ہو۔ شام کو وہ آئے وائس چانسلر نے ساری داستان سن کر رجسٹرار کو لکھ دیا کہ ان کو داخلہ ایم۔اے. انگریزی میں دے دیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ان کو داخلہ مل گیا اور موصوف نے انگریزی میں ایم۔اے. کرنے کے دو ایک سال بعد جب یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں انگلش لکچرر کی پوسٹ مشتہر ہوئی تو یہ بھی ایک امیدوار ہوئے اور لکچرر کے منصب پر مقرر ہو گئے۔ بعد میں ریڈر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ ان استاد کا نام عثمانی صاحب ہے اور اب ریٹائرڈ ہو کر بھی ممنون علیم ہیں۔ مجھے جب دیکھتے ہیں تو نگاہ احسان سے۔

علیم صاحب کو جب وزارت تعلیم حکومت ہند نے ترقی اردو بورڈ کا چیرمین مقرر کیا اس ذیل میں بعض اہم لوگوں نے غلط خیالی سے کام لے کر کہہ دیا کہ علیم صاحب کو وائس چانسلر کے عہدے سے ہٹا کر ترقی اردو بورڈ پہنچا دیا گیا۔ یہ قطعاً غلط ہے صرف دو روز قبل ان سے استعفیٰ دلا کر چارج دلانا مقصود تھا یہ ایک انتظامی فعل تھا نہ کہ انتقامی۔ علیم صاحب کی تقرری کے کچھ عرصہ بعد شہباز حسین صاحب PPO کو ان کے محکمہ نے واپس طلب کرلیا۔ اس اسامی کی جگہ مشتہر ہوئی۔ جن افراد نے درخواست دیں ان میں حسن نعیم صاحب اور شارب رودولوی بھی تھے۔ وزارت تعلیم کو خطرہ تھا کہ حسن نعیم صاحب کا تقرر نہ ہو سکے گا۔ اس

لیے وزارت تعلیم کے سکریٹری کو نمائندہ انتخاب کا فرد بنا کر نام بھیج دیا گیا۔ یعنی ملازمت کے پینل میں چیرمین ترقی اردو بورڈ کا نام وزارت تعلیم نے مصلحت کی بنا پر نہیں بھیجا، مگر انٹرویو سے دو روز قبل علیم صاحب نے کہا نورالحسن سے فون ملائیے۔ میں نے بحیثیت سکریٹری چیرمین، وزارت تعلیم کے سکریٹری سے فون پر کہا کہ منتری صاحب سے چیرمین بات کرنا چاہتے ہیں۔ چند لمحہ بعد دونوں کے درمیان بات ہوئی۔ علیم صاحب نے صرف اسی قدر کہا کل PPO کا سلیکشن ہے اس میں میں بھی جاؤں گا۔ فائل بھجوادی جائے اور یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ وزارت تعلیم میں ہنگامہ مچ گیا مگر نورالحسن صاحب نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریری حکم جاری کر دیا کہ PPO کے سلیکشن میں وزارت تعلیم کی طرف سے چیرمین علیم صاحب شرکت کریں گے۔ سکریٹری کا نام واپس لیا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت اہم موڑ تھا۔ سچ یہ ہے کہ نورالحسن صاحب کے بجائے کوئی دوسرا وزیر تعلیم ہوتا تو وہ اسے اپنی انا کی بات قرار دے کر اپنے پہلے فیصلہ پر قائم رہتا۔ ایک گھنٹہ بعد انتخاب کے سلسلہ کی فائل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ جسے چیرمین کو پیش کر دیا گیا۔ علیم صاحب سے فائل کا معائنہ کرکے حکم دیا کہ اسے فوراً وزارت تعلیم کو واپس کرادیا جائے۔ میں نے ضروری کارروائی کراکے خصوصی چپراسی کے ذریعہ تعلیم کے سکریٹری کو فائل بھجوادی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر سلیکشن کمیٹی میں شرکت کے لیے موتی باغ سے UPSC کے دفتر شاہجہاں روڈ آئے۔ علیم صاحب تو میٹنگ میں چلے گئے میں .P.A وغیرہ سے بات کرتا رہا۔ دو گھنٹہ بعد علیم صاحب کمرے سے باہر آئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر کہا، موتی باغ چلیے (موتی باغ رہائش گاہ تھی) درمیان راہ میں دریافت کیا۔ نعیم صاحب کا سلیکشن ہوگیا۔ کہا دیکھیے -! اس جواب سے میں نے اندازہ لگالیا کہ نعیم صاحب کا سلیکشن نہیں ہوا۔ دفتر ترقی اردو بورڈ آیا تو شہباز حسین صاحب PPO نے دریافت کیا کس کا سلیکشن ہوا؟ میں نے علیم صاحب کا جواب پیش کر دیا۔ دیکھیے اس پر شہباز حسین اور دیگر افراد نے کہا یہ تجسانہ جواب کیوں؟ عرض کیا حالات کا تقاضا ہی یہ ہے۔ دوسرے روز حسن نعیم صاحب بغرض ملاقات علیم صاحب موتی باغ آئے۔ مجھ سے پہلے شناسائی اور تعلقات تھے۔ دیکھتے ہی کہا یہ اچھی بات ہے کہ آپ کا ساتھ رہے گا۔ میں نے کہا، دیکھیے۔ اب نعیم صاحب اور علیم صاحب کے درمیان گفتگو شروع ہوئی۔ جو تقریباً دو گھنٹہ جاری رہی۔ اور ترقی اردو بورڈ کی توسیع اور جامعیت پر باتیں ہوئیں۔ علیم صاحب ہاں ہوں کرتے رہے، ادھر جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر جو تقرری کے پینل میں تھے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ اشارہ دے دیا کہ حسن نعیم صاحب کا تقرر ہو گیا۔

اس کی تصدیق کے لیے آمد حسن نعیم صاحب گواہ بن گئی۔ دفتر کے لوگوں نے بھی سن کر اسے خوش آمدید کہا۔ لیکن میں نے خاموشی ہی کی راہ اختیار کی۔ ادھر شادیانے بجے مگر اس روز بعد جب UPSC سے تقرر نامہ کی اطلاع عام کی گئی تو حسن نعیم صاحب کے بجائے (جو منتری کے کنڈیڈیٹ تھے) شارب رودولوی صاحب کا تقرر نامہ جاری کیا گیا۔ درحقیقت علیم صاحب کی دانائی اور شرافت کو اس میں زیادہ دخل رہا۔ انھوں نے محکمہ وزارتِ تعلیم سے فائل منگا کر معائنہ کیا اور ایک فیصلہ کر لیا۔ اسی کے مطابق انھوں نے سلیکشن کمیٹی میں وزیر تعلیم کے کنڈیڈیٹ حسن نعیم کے حق میں ووٹ دیا۔ ساتھ ہی یہ صلاح دی کہ شارب کا انٹرویو بھی بہتر ہوا ہے۔ لہٰذا اُن کا نمبر ۲ پر نام لکھ لیا جائے۔ ممبران نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور نمبر ایک پر حسن نعیم، نمبر دو شارب رودولوی کے نام رقم کر لیے گئے۔ UPSC کے قاعدے کے مطابق جب یہ انتخاب معائنہ آخر کے لیے محکمہ کو بھیجا گیا تو علم ہوا کہ حسن نعیم صاحب تعلیمی اعتبار سے بی.ایس.سی. ہیں۔ مگر ایم.اے. نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف ان کی دیگر صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا تھا مگر اس میں ایم.اے. ہونا ضروری تھا اور اس صفت سے حسن نعیم صاحب محروم تھے۔ لہٰذا نمبر ۲ پر جس اسامی کا نام منظور کر لیا گیا تھا۔ اس کو تقرر نامہ جاری کرنا، محکمہ کی ذمہ داری تھی۔ علیم صاحب نے اس کم زوری سے فائدہ اٹھایا اور وزیر تعلیم کی پسند کے مطابق اس کے امیدوار کو اپنی رائے دے دی تھی، مگر عواقب سے وہ باخبر تھے۔ چنانچہ شارب رودولوی نے بحیثیت PPO دفتر ترقی اردو بورڈ کا کام سنبھال لیا۔ ایک بات اور، وہ یہ کہ انتظامی صلاحیت اور تعلیمی صلاحیت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق باقی رہا۔ مثلاً شارب صاحب نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ جو ممبران وضع اصطلاحات کمیٹی میں شرکت کے لیے آئیں۔ وہ کم از کم مثلاً آٹھ گھنٹہ ضرور شریک کمیٹی رہیں۔ اس پر ممبران کو اعتراض ہوا۔ بات چیرمین تک پہنچی۔ علیم صاحب نے فرمایا یہ کوئی مزدور تو نہیں ہیں جو مقررہ وقت تک لگے رہیں۔ تعلیمی ماحول میں یہ نامناسب فیصلہ ہے لہٰذا اس میں فوراً تبدیلی لائی گئی۔

اسی طرح حکومتی طرز میں دفتری محکمہ کی تساہلی کے سبب وزارت تعلیم سے اسٹاف بورڈ کی تنخواہ کی منظوری کا پروانہ وقت مقررہ پر جاری نہ ہونے کی وجہ سے اسٹاف کو تنخواہ کی ادائیگی دو ماہ تک نہ ہو سکی۔ چند روز اور گزر گئے۔ علیم صاحب چیرمین کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کو جب اطلاع ملی تو انھوں نے متعلقہ عملہ سے دریافت حال کر کے حکم دے دیا کہ اسٹاف کی تنخواہ کی رقم کا چیک مجھ سے لے کر ادائیگی کر دی جائے۔ ذمہ دار افسر نے کہا سرکاری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے صلاح دی۔ ایسا کیا جائے کہ رقم کا چیک

میرے نام سے بنایا جائے۔ میں وقتی طور پر جز وقتی رقم کی ادائیگی اس وقت اس رقم سے کرادوں گا اور جب محکمہ ذاتی طور پر منظوری آجائے گی تو اس رقم کے دستخط کرانے کے بعد، تقسیم شدہ رقم واپس کرادی جائے گی اور میں چیرمین کو ادا کر کے حساب برابر کرالوں گا۔ چنانچہ ایسا یہ ہوا۔اس سے علیم صاحب کے انسانی جذبے کی اہمیت کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ہی ایک بار جب وہ شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے صدر شعبہ تھے اور اس کے قدیم ملازم سے جو ہر ماہ بینک سے پورے عملہ کی تنخواہ لایا کرتا تھا، ایک دوپہر میں درمیان بینک اور دفتر اسے لوٹ لیا گیا وہ ہراساں و پریشان دفتر آیا، مطلع کیا۔ بڑی لے دے مچی۔ علیم صاحب کو خبر ملی تو آپ نے اپنی جیب سے پوری رقم ادا کر کے اس چپراسی کی امداد کی اور جان بچائی۔

انسانی ہمدردی کا خاموش جذبہ علیم صاحب کے دل میں جس حد تک تھا اس کے واقعات بے پناہ ہیں۔ میں جس زمانے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھا اس ملازمت کے درمیان صدر شعبہ نے میرے خلاف محض اپنی جان (وہ بھی بلاوجہ) بچانے کی خاطر ایک افسر بالا سے مل کر میری ملازمت ختم کرانے کا فیصلہ کرالیا۔ اصلی حالات سے سب ہی واقف تھے۔ اس وقت پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور پروفیسر عبدالعلیم نے بے حد اخلاص واخلاق برتا۔ میں نے ایک درخواست جامعہ اردو کے ذمہ داران کو گزاری کہ سرسید بک ڈپو کو سپلائی کتب و دیگر اداروں میں اس کی کتب کے آرڈر سپلائی کرنے کا یک معاہدہ نصف نصف منافع پر اگر منظور کرنا مناسب ہو تو اس کی شرائط سے آگاہ کیا جائے۔ چند روز بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے یاد کیا اور کہا بلگرامی صاحب آپ کی تجویز تو مناسب ہے مگر خازن جامعہ اردو ڈاکٹر علیم صاحب کی رائے ہے کہ آپ سرسید بک ڈپو کے اسسٹنٹ منیجر کا عہدہ سنبھال لیں۔ اگرچہ اس زمانہ میں علیم صاحب سے میرے کوئی خاص مراسم نہ تھے مگر وہ باخبر شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باقاعدہ جامعہ اردو کے سرسید بک ڈپو کا عہدہ دار مقرر ہو گیا۔ ان دنوں میں معطلی کے دور سے گزر رہا تھا۔

اسی درمیان دلّی یونیورسٹی کے رجسٹرار کا تار آیا کہ ملازمت پر حاضری دو! میں نے تار پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دکھایا۔ انھوں نے علیم صاحب سے بات کرنے کی بات کہی۔ موصوف سے جب ملا تو فرمایا ٹھیک ہے جوائن کرلیں۔ میرا ابھی یہاں علی گڑھ میں رہنا بے یقینی سا ہے۔ اس وقت اس جملہ کا میری ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر بعد میں سیاق سمجھ میں آگیا کہ علیم صاحب کو بجائے کشمیر کے علی گڑھ کا وائس چانسلر مقرر کر دیا گیا۔ میں نے دہلی

یونیورسٹی جوائن کر لی اور بڑا الزام میرے سر سے ہٹ گیا۔ جس کے لیے ذاکر صاحب (نائب صدر مملکت ہند) اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تک نے میری موافقت میں عملی قدم اٹھا لیا۔ مگر ناکامی ہاتھ آئی تھی، لیکن خدا بھلا کرے ہردے ناتھ کنزرو صاحب کا کہ انھوں نے دلیش مکھ، وائس چانسلر یونیورسٹی سے ایسے سوالات مجلس انتظامیہ کے سامنے کیے کہ رجسٹرار کو کہنا پڑا کہ دراصل صدر شعبہ ان کو ملازم رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ویسے ان پر کوئی بھی الزام نہیں ہے۔ اس بات کے ریکارڈ میں آتے ہی ایگزیکٹیو کمیٹی نے فیصلہ کر دیا کہ مرتضی حسین بلگرامی کی برخواستگی ملازمت کو رد کیا جاتا ہے۔ اور ان کو بحال کرنے کا حکم وفیصلہ کیا جاتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں دل سے اس ملازمت کو اختیار کرنے کا خواہاں نہ تھا۔ پھر بھی فیصلہ یہی کیا کہ ایک داغ کو دھونے کے لیے جب تک ملازمت پر بحال نہ ہو جاؤں، علیحدہ رہنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ مجبوراً دہلی یونیورسٹی جوائن کر لی۔ پھر کسی اور جگہ کا خواہاں نہ رہا۔ دہلی میں کئی ایسے مقامات تھے جہاں سے مجھے آفر بھی ملے۔ مگر میں نے بروقت عافیت اسی میں خیال کی کہ دہلی یونیورسٹی کے غیر مسلم اسٹاف کی مکمل حمایت مجھے حاصل تھی۔ جو تکریم انھوں نے دی اس کا اعتراف نہ کرنا خود ایک جرم کی بات ہوگی۔ اس ایک سال میں کئی اشخاص مثلاً ابن فرید صاحب، عبدالحلیم، پروفیسر ماجد صدیقی اور رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بوقت ملاقات کہا آپ سے وائس چانسلر ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے اتنا وقت نہ ملتا کہ ان سے ملاقات کرتا۔ اگر چہ ایک سال کے اندر ایک دو جلسوں میں صاحب سلامت بھی علیم صاحب سے ہوئی۔ مگر کسی بات کا موقع اس وقت نہ اُن کو ملا نہ ہی مجھے۔ اچانک ۲۵/ دسمبر ۱۹۶۸ء کو تفصیلی ملاقات کا موقع بہم ہوا۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے دوران کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں آجائیں۔ میرا ذہن قطعاً خالی تھا۔ پھر بھی جواب دیا کہ بہتر ہے۔ جب جگہ مشتہر ہوگی تو درخواست دے دوں گا۔ کہا نہیں آپ درخواست دے دیں۔ یہ جملہ ایسے دردمندانہ انداز میں کہا کہ میں انکار نہ کرسکا۔ مگر اسامی کیا ہو، تنخواہ کیا ہوگی۔ قطعاً لاعلم تھا۔ گھر آکر ایک عزیز سے کہا کہ بھئی آج وائس چانسلر سے ایسی ایسی بات ہوئی، تم ایسا کرنا کل ایک دوسطری درخواست لکھ کر وائس چانسلر آفس میں دے دینا اور دوسری صبح میں اپنی ملازمت پر دہلی چلا گیا۔ دو روز بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کا تار ملا کہ یکم جنوری ۱۹۶۹ء کو جوائن کریں۔ بھلا دو تین روز کے اندر میں کیا کرتا۔ لہٰذا سید بشیر الدین صاحب لائبریرین دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سے مشورہ کیا دونوں نے کہا کہ جوائن کرلو۔ اس لیے میں نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء کو دہلی

سے جز وقتی رخصت لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر آفس میں جوائن کر لیا۔ دوران ملازمت اس امر سے آگہی ہوئی کہ ایک صاحب کا سال بھر قبل تقرر ہو گیا تھا۔ پروانہ ملازمت کی کاپی وائس چانسلر کو آئی مگر علیم صاحب نے یہ کہہ کر رجسٹرار کو واپس کر دیا کہ اس اسامی پر بعد میں غور کیا جائے گا۔ ایک سال تک یہ جگہ خالی رہی اور میری نام نہاد درخواست جیسے ہی ملی اس پر تقرری کا حکم لکھ کر رجسٹرار کو بھیج دیا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ ''مجھے تار سے مطلع کرایا جائے''۔ اگرچہ میری سمجھ سے بالا یہ بات ہے کہ علیم صاحب کو مجھ میں کیا خوبی نظر آئی جو میرا انتخاب کیا اور سال بھر تک جستجو کرتے اور انتظار فرماتے رہے۔ بہر حال میرے لیے یہ امر باعث فخر ہے کہ علیم صاحب نے مجھ پر بھروسہ کیا اور اپنے تقرر ''مشیر حکومت ہند وزارت تعلیم'' میں ترقی اُردو بورڈ کے عہدے کی وصول یابی کے بعد بہ اصرار مجھے بھی وزارت تعلیم سے وابستہ فرمایا۔ جس کا سلسلہ ان کی حیات کے آخر تک رہا۔ اس تفصیل سے قطع نظر اُن کی وفات کے اعلانیہ کی سب سے پہلی اطلاع میں نے پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی کو دی اور موصوف سے کہا کہ آپ وزیر تعلیم نور الحسن صاحب اور پروفیسر رئیس احمد صاحب کو آگاہ کر دیں۔ نصف گھنٹہ سے بھی کم عرصہ میں پوری دنیا کو علیم صاحب کے انتقال کی خبر معلوم ہو گئی۔ اس وقت کے صدر مملکت ہند فخر الدین علی احمد کے پرسنل سکریٹری کو میں نے اس حادثہ کی اطلاع دی۔ چند ثانیہ بعد صدر ہند کا فون آیا اور انھوں نے تدفین وغیرہ سے متعلق دریافت حال کیا۔ اتفاق سے اس وقت اچانک پروفیسر ماجد صدیقی (داماد علیم صاحب) علی گڑھ سے دلی ولنگڈن ہسپتال آئے تھے۔ اُن سے آخری ملاقات اور گفتگو بھی میری ہوئی۔ ایک گھنٹہ بعد وہ شفاخانہ سے موتی باغ قیام گاہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب میری اور صدر مملکت کی بات ہو رہی تھی تو ماجد صاحب سے صلاح کے بعد موصوف کو مطلع کر دیا کہ لاش علی گڑھ کے یونیورسٹی قبرستان مین دفن ہو گی۔ پھر ضروری انتظامات پر لگا رہا ایک لمحہ کی فرصت نہ مل رہی تھی۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر میت کو علی گڑھ لے جانے کی سب تیاری منٹوں میں مکمل ہو گئی۔ مگر صدر مملکت کے دفتر سے فون پر فون آرہے تھے کہ ''صدر خود میت پر حاضری دیں گے''۔ مگر میں اس کو عام نہ کرنے کا پابند تھا۔ پھر بھی قدوائی صاحب اور پروفیسر رئیس احمد صاحب سے اس کا تذکرہ (خفیہ طور پر) کر دیا۔ کہ لوگ باگ بہ عجلت میت کو علی گڑھ لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد راشٹر پتی کا عملہ آخری رسوم کے واسطے گلدستہ اور پریڈ کے لیے فوجی عملہ لے کر آیا۔ سکریٹری نے بتایا کہ ایک

خصوصی وجہ سے صدر نے شرکت سے معذرت ظاہر کی ہے۔ مگر خراج عقیدت کے لیے یہ فوجی عملہ، سلامی، دینے کو حاضر ہو رہا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے بعد، میّت علی گڑھ روانہ ہو کر اور اپنی آخری منزل یونیورسٹی کے قبرستان میں پہنچ کر تمام ہوئی اور بقول جگر مرادآبادی:

نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو　　　　عالم ہی عالم، منظر ہی منظر

وہ انسان جو سدابہار، پُر وقار، اہل دل، انسان پرور، فرشتہ صفت اور پُر مغز و پُر شکوہ تھا۔ مٹی کے تودے کے درمیان چلا گیا۔ یہی نظام قدرت ہے البتہ اپنی حیات سے چند روز قبل پروفیسر بی. اے. خاں صدر شعبۂ انگریزی کی خبر وصال کو سن کر رضیہ آپا بیگم بی. اے. خان کو جو خط لکھا وہ موصوف کی آخری تحریر تھی۔ جس میں لکھا تھا کہ: ’’آج وہ، کل ہماری باری ہے‘‘ کیا علیم صاحب کو علم تھا کہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں وائس چانسلر کے گھر سے جو تحریر وہ ارسال کر رہے ہیں اس کے مصداق وہ واقعی ۱۸ر فروری ۱۹۷۶ء کو قضا کر جائیں گے۔ لیکن وقت آخر ان کی زبان پر اللہ اللہ تھا۔ اس کی شہادت کے لیے فرشتہ اجل کو شاہد بنایا جا سکتا ہے۔ میں وقت وصال علیم صاحب اور دو ڈاکٹر ولنگڈن ہسپتال کے اُس وقت موجود تھے جب ان کا وقت نزاع اور موت آئی۔ اللہ مغفرت کرے۔

علیم نامہ

علیم صاحب کے عقیدہ سے متعلق اُن کی حیات میں بعض اشخاص نے سوالات کیے، مگر بدعات و خرافات سے اُن کو پاک رکھا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن پر کسی نے اس زمرے پر توجہ نہ دی، مگر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انھوں نے اپنی خانگی زندگی، اپنی اولادوں یا اِرد گرد کے افراد سے کبھی تعصب یا نفرت کا اظہار نہ کیا، بلکہ میں شواہد کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ وہ ایک راسخ العقیدہ فرد کی طرح احترام مسلک کے پابند شخص تھے۔ اپنی زندگی کے عملی سفر میں انھوں نے کبھی بھی زبان و بیان سے مذہب کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ دراصل ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے سامراج کے خلاف آواز بلند کرنا اور اعلانیہ طور پر اس سے انحراف کرنے کی دعوت دینا ان کا انداز فکر تھا۔ معجزات اور خارق عادت و واقعات کا اُن کے یہاں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ وہ اس امر کے خواہاں تھے کہ دینی، اجتماعی اور سیاسی بصیرت سے مسلمان بھی اسی طرح ہم آہنگ ہوں جیسی اور قومیں ہیں۔ ایک موقع پر مولانا تقی امینی صاحب (صدر دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) سے گفتگو میں کہا تھا۔ اُمت

کو بیدار کرنے اور اس کو اسلام کی سمت لوٹنے اور اندھی تقلید کو ترک کرنے، بلکہ نہ اپنانے پر توجہ نہ دینا۔ کیا اسلامی وقار کے خلاف عمل نہ کہلائے گا؟...... مولانا نے جواباً کہا:...... مختلف قوموں بلکہ فرقوں کے درمیان تعاون کی راہ ہموار کرنا، اجتہاد کے بند دروازوں کو کھلا رکھنا، اسلامی شعار کہلانے کی بات کہی جاسکتی ہے۔

اس تناظر میں اگر آپ اور ہم ان کی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ علیم صاحب علوم عربیہ واسلامیہ کے پروفیسر بھی تھے تحقیقی کام کرنے والے طلبا کے سپروائزر بھی تھے۔ عربی زبان کے علاوہ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبان سے مکمل طور پر آشنا تھے۔ رُوسی زبان سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھے۔ علیم صاحب شیخ محمد عبدہ پر تحقیقی مقالہ کے سپروائزر بھی تھے۔ جوایک طالب علم کے مقالہ کا عنوان ہے۔ شیخ محمد عبدہ کی ذات اسلامیات کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا رسالہ ''رسالۃ التوحید'' جو ۱۸۸۰ء کے آس پاس لکھا گیا تھا۔ اس کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح یورپ کے طرز حیات اور مادہ پرستی کے برخلاف، محض ''دینی افکار وملل'' پر ہی رَوا رکھنا، امر نیک ہوگا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اسلام جبر کا نہیں سائنس اور فلسفہ کا بھی ہم نوا ہے۔ لہٰذا وہ امر جو اُمت کے حق میں ہو، اس پر کاربند رہنا اس پر عمل پیرا ہونا، شیخ کا بنیادی نظریہ تھا۔ علیم صاحب کا نظریہ کم از کم اُمت مسلمہ سے متعلق اسی کا متقاضی تھا۔ اس کی اصل وجہ میری دانست میں یہ تھی کہ...... وہ عرب ملکوں کے سفر کر چکے تھے، وہاں کی تہذیب، علم اور تحریکوں سے بھی آشنائی حاصل کی تھی۔ مغربی ادب اور عرب ملکوں کے ادبی، ملکی، سیاسی امور کے اثرات سے واقف تھے۔ جدید عربی ادب اور زبان وعلم کلام سے واقفیت کی بنا پر اس کے جدید ہم نواؤں سے مثلاً احمد امین اور طٰہٰ حسین جیسے ہفت اقلیم دانش وروں سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ ان کے ادبی تحریکات سے ہم آہنگ بھی تھے۔ میں نے ذکر کیا ہے کہ علیم صاحب شیخ محمد عبدہ کی تصنیفات اور ان کی فکری، مصطلحات بلکہ اصلاحات سے آگاہ تھے اور شاید دَر پردَہ وہ اس کے غماز بھی ہوں کہ عام لوگ یعنی امت مسلمہ کی بیداری اس وسیلے سے ہو۔ علیم صاحب جس شعبہ سے وابستہ تھے، اس کا تقاضا بھی تھا کہ وہ اسلامی مسائل سے صَرفِ نظر نہ کریں۔ جدید دَور میں مسلمانوں کے وجود اور ان کی بقا کے لیے لازم تھا اور ہے کہ امت کی تاریخ، اس کے واقعات اور اس کے انحطاط پر نہ صرف غور کیا جائے بلکہ موثر انداز اپنانے پر توجہ دی جائے۔ میں پوری ذمہ داری سے اس امر پر یقین دلا سکتا ہوں کہ پروفیسر عبدالعلیم کی عبقری شخصیت نہ ہوں، مگر وہ اسلامی طرز حیات کو موجود تمام اغراض و

مقاصد کے زیر سایہ پروان چڑھانے پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی کم گوئی یا دوسرے فرد کی حِس و سمجھ ان کی اصل بات کو نہ سمجھ سکے اور اس انفرادی بات سے غافل رہے۔ جس پر علیم صاحب توجہ دلانا چاہتے تھے۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں جمع ہو کر، لوگوں کو بدظنی کا موقع ملا ہو، یہ ممکن ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کو خارجی اثرات سے آزاد کرنا، ان کا اصل نظریہ تھا۔ ان کا لباس اُن کی طرز زندگی، اُن کی شائستگی، اُن کی انفرادیت، اُن کا لہجہ، اُن کی پاس داری، اُن کا اسلوب حیات، اُن کی خاموشی اور اُن کی تہذیبی اساس، اُن کی شاعری، ان کا ادبی اور فکری نظریہ، اُن کی جامع شخصیت اور اُن کا رکھ رکھاؤ، صلح جوئی، تنگ نظری سے علیحدگی، امید سے وابستگی، اسلامی وقار سے اُلفت اور انسانی حیات سے بہرہ مندی اس امر کی شاہد ہیں کہ وہ ادب عالیہ اور انسانی سماج کو حُسن و جامعیت کی نظر سے دیکھنے کے قائل تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی اور ہے کہ ان کی شخصیت پر جامع نظر ڈال کر، ان کی عملی زندگی کے وَرق وَرق اور سَطر سَطر پر نگاہ ڈالی جائے۔ علیم صاحب کا حافظہ بلا کا تھا۔ برسوں پرانی بات ان کے حافظہ میں لفظ بلفظ، حرف بحرف بعینہٖ باقی رہتی تھی اور وقت پر وہ اس جملہ اس بات اور اس تحریر کو بیان کر کے، اپنے آپ کو ممتاز کر لیتے تھے اور جب اس تحریر کا معائنہ کیا جاتا تو تصدیق کے سوا کسی سے کچھ نہ بنتا۔ علم وفن کے وہ شہدائی تھے۔ احراری لکھنے کو پسند کرتے تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ چنانچہ ایک بار جب مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد العصر (سابق ڈین و صدر شیعہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) سے ان کی ہی ایک ضرورت کے تحت علیم صاحب کا نام آیا تو فرمایا تھا...... ہاں، وہ اور ہم جب لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے تو لوگ باگ ان کو حافظ اور احراری بھی کہتے تھے۔ میں نے ایک بار اُن سے دریافت کیا کہ آپ جس تحریک سے وابستہ ہیں اس اعتبار سے احراری تو سمجھ میں آیا مگر یہ حافظ......؟ تو مسکرا کر کہا تھا...... احراری تو میں عبیداللہ احرار جو ہمارے جدِ اعلیٰ تھے۔ ان کی نسبت سے اپنے کو شناسا کرنا خیال کرتا ہوں۔ باقی رہی بات حافظ قرآن ہونے کی وہ میں مولانا حافظ فرمان علی صاحب کے طرز پر ہوں...... اس پر میں نے ہمت کر کے مولانا علی نقی صاحب سے دریافت کیا کہ...... یہ مولانا فرمان علی صاحب کا کیا قصہ ہے؟...... غلافی آنکھیں اٹھا کر کہا...... دراصل ایک فرقہ کا خیال ہے کہ فرقہ جعفریہ میں حافظ نہیں ہوتے، جب کہ یہ غلط ہے۔ تعداد کے اعتبار سے شیعوں میں حافظ کم ہیں، لیکن اگر اہل سنت کی تعداد کو جو کروڑوں میں ہے، اگر جائزہ لیا جائے تو شاید آٹے میں نمک کے برابر کی مثال صادق آسکتی ہے۔ علیم

صاحب کا اشارہ اسی سمت تھا۔ دراصل ان کے یہاں مزاح کا عنصر بے پناہ تھا۔ اس صفت سے بہت کم لوگ آگاہ تھے۔ عرض کیا، آپ بھی تو کم گو ہی ہیں۔ فرمایا: کم قلم نہیں ہوں، یہ سچ ہے۔ مولانا صاحب طرز ادیب ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں آپ کی تصانیف ہیں بے شمار مقالے اور خطبے۔ ذاکری میں مولانا کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ذاکر حسین، حکیم عبداللطیف، کرنل بشیر حسین زیدی، خواجہ غلام السیدین اور بہت سے اکابر محض مولانا کا نام سن کر مجالس میں شرکت کرنا، اپنے لیے فخر اور معلومات میں اضافہ کا باعث خیال کرتے تھے۔ علیم صاحب بھی مولانا سے بے حد متاثر اور ان کا احترام فرض سمجھتے تھے۔

علیم صاحب کی تصانیف کی تعداد ان کی کم گوئی کی طرح تھی۔ لیکن ان کی وہ تقریریں اور گفتگو جو ادبی جلسوں اور محفلوں میں ہوتی تھیں، اگر ان کا ریکارڈ رکھا جائے یا ان شرکاء افراد کی زبان پر جو کلمات آئے، ان کو قلم بند کرلیا جاتا تو خود ایک کتاب کا عمیق مضمون بن سکتی تھیں، لیکن افسوس کہ علیم صاحب کی علمی تقاریر کو بھی قلم بند نہ کیا جاسکا۔ پھر بھی اگر ان کے مختلف مقالے، تقاریظ، تبصروں کو یکجا کر کے کتابی شکل دی جاسکے تو یہ بھی ایک تاریخی کارنامہ ہوسکتا ہے۔ اس سے زیادہ اہم کام یہ تھا کہ علیم صاحب کی شعریات کو منظر عام پر لایا جاسکتا۔ میں نے خود ان کے اپنے کتب خانے میں ان کی شعریات کا مجموعہ دیکھا تھا۔ افسوس کہ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کا رواج نہ تھا۔ مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے ان کی نام نہاد 'بہو' سے اس مجموعہ کا مطالبہ، نقل کی غرض سے کیا تھا، مگر اس نااہل نے اتفاق نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ مکان جسے بہت توجہ سے بنوایا تھا مگر رہائش کا موقع ان کو نہ مل سکا۔ نہ ہی ان کے بیٹے ڈاکٹر عبدالحلیم کو قیام کی مہلت ملی۔ اس پختہ اور ٹھوس عمارت کو ان کی بہو نے فروخت کر کے بے حیثیت کرا دیا، خریدار نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اب اس پر فلیٹ بن کر، قدیم عمارت کو بیخ و بُن سے ختم کرا دیا۔ جب کہ اس علی گڑھ میں ان کی بیٹی اور داماد بھی مقیم ہیں، لیکن یہ سب بے بس رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ مجھے ذاتی طور پر مکان کو ملبہ کی شکل اختیار کرنے کا شکوہ نہیں، مگر ان کے کتب خانے کے ختم ہوجانے اور ان نوادرات کے تلف ہوجانے کا ملال ضرور ہے اور رہے گا۔ یوں کہ ان کتب اور رسائل پر، کئی پر، ان مرحوم کے نوٹس، حاشیے پر درج تھے۔ ایسی ہی ایک نادر تحریر کا نسخہ میری تحویل میں ہے۔ جس کا نام "اردو کیسے لکھیں" (صحیح املا) مصنفہ رشید حسن خاں صاحب ہے۔ اپنی یہ تصنیف بغرض ملاحظہ پروفیسر عبدالعلیم کو خود موصوف نے عطیہ کی تھی۔ جس کو بالاستیعاب علیم صاحب نے پڑھا اور

حاشیہ پر اغلاط کی نشان دہی کی۔ کتاب ہاتھ میں آتے ہی جب ہم جلد کو ہٹائیں اور سادہ ورق نظر آئے گا تو اس صفحہ کے بالائی حصہ مین بال پین سے دو لفظ ملیں گے۔ مأ رخ، مأ نث۔ اس کے بعد صفحہ ۳۸ سطر ۱۶ پر نذیر کے تحت یہ عبارت: یہ رسول اللہ کا ایک نام ہے۔ اس ضمن میں علیم صاحب نے حاشیہ پر ''لقب'' لکھا ہے۔ یعنی لفظ نذیر، رسول اللہ کا نام نہیں ہے، لقب ہے۔ صفحہ ۴۵ سطر ۵ پر نمبوتری لکھا ہے۔ علیم صاحب نے اس کی صحت کے لیے اصل اور صحیح نام نمبودری حاشیہ پر لکھا ہے۔ صفحہ ۴۷ سطر ۲ پر ''کھونسنا، کونچنا'' کے نیچے خط کھینچ کر حاشیہ پر؟ نشان بنا دیا ہے۔ اسی طرح سطر ۱۷ پر لفظ ''مچھندر'' کے لفظ پر نشان لگا کر ت کے دو نقطوں پر ایک نقطہ کی نشان دہی کی ہے۔ یعنی اس کتاب کا بہت باریکی سے مطالعہ کیا گیا۔ صفحہ ۵۰ سطر ۴ پر لفظ ''پانوؤں'' جو پانو کی جمع ہے، اس پر اعتراض یہ وارد کیا کہ ہمزہ پہلے واؤ پر۔ صفحہ ۵۱ سطر ۱۸ پر لفظ عمرؔ کے نیچے ہلکا سا نشان بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں علیم صاحب کا اعتراض یہ تھا کہ عَمر و اور عُمر میں جب واضح فرق زبر، زیر پیش کا ہے تو اس لفظ کو اس ذیل کی مثال بنانا ہی غیر مناسب ہے۔ عَمر و کے ساتھ جب واؤ کا اضافہ ہو گیا تو یہ لفظ قسم دوم کی شے ہو گئی، اور رشید صاحب نے رومال کے ذیل میں جو رومالی سویاں اور رُمالی، پاجامہ کی بتاتے ہوئے خود تفریق کا موقف اختیار کر لیا ہے۔ جب رُمالی پر پیش دے دیا گیا تو اسے بھی رومالی کے صف میں رکھنا، کیا عیب کی بات کہلانے کا موجب نہ ہوگی۔ صفحہ ۵۲، سطر ۱۸ پر ''کم خواب'' کے نیچے خط کھینچ کر حاشیہ پر؟ لگایا ہے۔ دریافت کرنے پر کہا۔ کم خواب دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک نیند کے کم آنے یا ہم کم خواب دیکھتے ہیں۔ اس کے سوا کپڑے کی ایک گراں اور قیمتی قسم کو بھی کہا جاتا ہے۔ اسے کم خواب کے بجائے ''کمخاب'' لکھنا یا بولنا متروک ہے۔ اس کے سوا اسے خورشید کے وزن پر لکھنا اور بتانا خود استعجابی بات ہے۔ صفحہ ۵۵، سطر ۱۳ پر، ہائے ملفوظ کے تحت رشید صاحب نے لفظ ''توبہ'' کو شریک کیا ہے۔ علیم صاحب نے کہا تختی کے اعتبار سے یہ لفظ تو اس ذیل سے باہر کی بات ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس لفظ توبہ کو دائرہ میں لے لیا ہے۔ اس قسم کے اور بھی الفاظ پر علیم صاحب کو اعتراض تھا۔

صفحہ ۵۷ سطر ۱۹ پر ''مصرع'' کو ''مصرعہ'' لکھنا بھی غلط ہے۔ اس عبارت کے نیچے خط کشید کیا ہے۔ اس ذیل میں فرمایا اور ''قطع'' قطعہ کے بات میں کیا فیصلہ ہوگا، دریافت کیا۔ اس مثال سے کیا مقصود ہے؟ کیا...... قطع کرو نہ محبت مجھ سے، میں لفظ قطعہ کا لکھنا غلط ہوگا۔ یوں ایک قطعہ ایک حصہ کو بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے ایک قطعہ مکان یا زمین کا حصہ۔ تو ہم مصرع کو مکمل ع کے بجائے ہوہائے مختفی سے لکھتے ہیں وہ درست ہے؟ فرمایا بول چال اور تحریر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اسی صفحہ ۵۷ سطر ۲۲ پر "اسلحہ جات" کے نیچے خط کشید کر کے، حاشیہ پر ؟ نشان بنایا ہے۔ حوالہ جات کے نیچے بھی خط کشید کیا ہے۔ اس پر اعتراض کیا کہ اس میں واؤ کے شراکت کی گنجائش اور ضرورت کہاں ہے؟۔ بیرون جات کی طرح اسلحہ جات اور حوالہ جات میں و کب استعمال کرنا یا کر سکتا ہے؟

صفحہ ۶۱ سطر ۱۴ پر انتہاء، علماء، شعراء، اولیاء کے ذیل میں رشید صاحب کی صلاح ہیکہ ہمزہ کی علامت ان لفظوں کے ہمراہ نہ لکھنی چاہیے۔ علیم صاحب کا اعتراض نہیں بلکہ خیال تھا علما عالم کی جمع کے لیے ہمزہ کی علامت سے مقصد پورا ہو جاتا ہے اور تقصیر بھی ہو جاتی ہے۔ اضافت کے لیے "ے" کی علامت کے بجائے اگر ہمزہ کی علامت رہے تو تحریر میں آسانی ہو سکتی ہے۔ البتہ عطف کی صورت میں واؤ کا اضافہ کر کے جمع کا صیغہ بنانا درست ہوگا۔ جیسے علما و فضلا۔ اس میں ہمزہ کے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ عالم کی جمع علما اور فاضل کی جمع فضلا کافی ہے۔ اس میں نہ تو ہمزہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی علامت 'ے' کی۔ جیسا خان صاحب کا خیال ہے۔

صفحہ ۶۲ سطر "توأم" کے نیچے خط کھینچ کر، حاشیہ پر سوالیہ نشان بنایا گیا ہے۔ رشید صاحب کا خیال ہے کہ ہمزہ الف کا قائم مقام ہے۔ لہٰذا دونوں علامتوں یا حرف کا استعمال نامناسب ہے۔ علیم صاحب کا کہنا تھا کہ تأمل کی طرح تو أم کیسے مماثل ہو سکتا ہے؟ اور جرات کا تلفظ بغیر ہمزہ کے کیوں کر ممکن ہوگا۔ تلفظ سے مقصود ادائیگی لفظ ہے۔

صفحہ ۶۳ سطر ۱۸ تا ۱۹ میں "لاکھوں لگاؤ" اور سطر ۱۹ میں "کھاؤ" کے نیچے علیم صاحب نے خط کشید کر کے، حاشیہ پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ رشید صاحب کا خیال ہے کہ فعل اور مصدر میں فرق ہوگا یعنی فعل آئے گا مگر مصدر میں ہمزہ نہیں آئے گا۔ علیم صاحب کا کہنا تھا کہ واؤ کیا سکون و سکوت کی علامت ظاہر نہیں کرتا ہے، پھر عام قاری اتنی نزاکتوں کو کیسے خاطر میں لا سکتا ہے؟ لہٰذا اگر فعل میں لفظ جماؤ کو ہمزہ سے لکھا اور پڑھا جائے تو مصدر کے تحت بھی اگر ہمزہ کا استعمال ہو، تو کیا قاری کو الجھن سے واسطہ ہوگا؟ یا سہولت ہوگی۔ لہٰذا "لاکھوں لگاؤ" اور "کھاؤ" میں فرق بتانا، قاری کو الجھن میں مبتلا کرنے کے مترادف ہوگا۔ غور طلب امر ہے!!

صفحہ ۶۵، سطر ۱۶ کے الفاظ "پرمیشور، راجیشور کملیشور" کے سلسلے میں رشید صاحب کا لکھنا ہے کہ ان میں کسی لفظ پر واؤ پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ علیم صاحب نے ان الفاظ کے نیچے خط کھینچ کر حاشیہ پر سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ دریافت حال کے ذیل میں کہا۔ ان الفاظ میں واؤ پر ہمزہ کی حاجت کیا ہے؟؟ زیر کی علامت تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ہمزہ کا تو سوال ہی نہیں آتا!!

صفحہ ۶۶، سطر ۳ "باؤلی" کے نیچے خط دے کر حاشیہ پر سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ اس

ذیل میں علیم صاحب کا کہنا تھا کہ اسے اگر بغیر ہمزہ کے لکھا جائے تو پڑھنے والا اسے باولی بھی پڑھ سکتا ہے۔ یہی حال بکاؤلی کا ہے۔ اسے بکاولی بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ واؤ پر زبر کے ساتھ۔

صفحہ ۶۷، سطر ۱۳ و ۱۶ پر بھی نشان اور حاشیہ پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ اس پر اعتراض اور تشریح یاد نہیں۔ شاید اعتراض یہ تھا کہ دو واؤ اور اس پر ہمزہ کی ضرورت کیا ہے؟ صرف ایک واؤ پر ہمزہ کی علامت کافی تھی، یعنی چاقوؤں، آرزوؤں۔ دوسرا واؤ گویا اضافی ہے۔

صفحہ ۲۸- اس صفحہ کی سطر ایک، سات بلکہ پورا صفحہ محل نظر ہے اور ان پر نشاناتِ اعتراض اور سوالیہ نشانات کی علامت ظاہر کرتی ہے کہ ان لفظوں کے املا سے، ترقی اردو بورڈ کے چیرمین کو اتفاق نہ تھا۔ رشید صاحب کا خیال ہے کہ اردو میں ایک آواز کے لیے صرف ایک حرف آئے گا۔ علیم صاحب نے اس کتاب کے صفحہ اول پر جو لفظ مارّخ، مانّث تحریر کیا ہے وہ اعتراضی بھی ہے اور اصلاحی بھی۔ اس کے صفحہ ۲۸ پر جن الفاظ کے نیچے خط کشید کیے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- واؤ متحرک ہے (جیسے موںّث)

۲- مورّخ، مونّث، موتّر، مودّب، مواخذہ، مونّس، موکّد، مولّف، مویّد، موذّن، مورّخہ، مورّخہ، سوزخوں، موذّنوں، مواخذوں، مونثوں، اور مولّفوں۔

۳- انگریزی کے ایسے لفظ جن میں الف اور واؤ یک جا ہیں۔ اُن میں بھی واؤ پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے۔ رشید حسن صاحب کی تجویز ہے، مگر اسی ایک لفظ اناؤنسر، کو لے لیا جائے تو بقول علیم صاحب، قاری اسے کئی طرح پڑھ سکتا ہے، جیسے اناونسر یا ساوتھ' کو ساؤتھ' جب کہ یہ لفظ ساؤتھ ہے اور پہلا لفظ اِناؤنسر ہے۔ اگر الف کے ساتھ ہمزہ کی علامت بھی ہوگی تو قاری غلطی نہ کر سکے گا۔ اس صفحہ کی مثالوں میں صاحبِ تصنیف کا خیال ہے کہ مورّخ پر ہمزہ کی علامت نہ دے کر تشدید کی علامت بنا دی جائے۔ جب کہ تشدید کی علامت سے آسان ہمزہ کی علامت بنانا ہے۔ پھر موازنہ کے لفظ میں تو ہمزہ آتا ہی نہیں ہے۔ اسے مثال میں کیوں شریک کیا گیا۔ پھر جو الفاظ عربی کے ہیں، ان کے املا میں تبدیلی کرنے سے مفہوم و معنی میں بھی فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ ایسا ہی انگریزی الفاظ کے استعمال کا حال ہے۔ انگریزی میں نمونیا کی جو الفاظ لکھے جاتے ہیں ان کو بولتے وقت استعمال نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اناونسر میں ہمزہ کا ہونا، صوتی اعتبار سے بھی مناسب ہے، ورنہ "ساؤتھ" کو پڑھنے والا، سا، وُتھ پڑھے گا اور اس سے مفہوم بدل جائے گا۔

صفحہ ۷۰، سطر ۲۰-۲۱، گاو کے سلسلے میں سوالیہ نشان حاشیہ پر اور گاو کے نیچے خط کشیدہ

لائق بحث ہے۔ رشید صاحب نے لکھا ہے ''گاؤ'' میں واو پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ اس کی ہندی صورت ''گئو'' ہے اس کو اسی طرح لکھا جائے گا۔ جیسے گئو شالا، گئو دان، لیکن رشید صاحب کا اصرار ہے کہ گاون میں ہمزہ کی علامت کے بجائے، دو واؤ لکھے جائیں یعنی گاووین۔ اس اعتبار سے گاو پر اگر ہمزہ کی علامت نہ لگائی جائے گی تو قاری اسے کچھ کا کچھ پڑھے گا۔ ہاں اگر گئو گھات لکھنا ہو تو اسے گائے گھاٹ بھی لکھا جاسکتا ہے، علیم صاحب کی یہی تجویز تھی کہ زبان کو سہل بنانے کی خاطر، تنگ نظری کو راہ نہ دی جائے۔

صفحہ ۸۱، سطر ۱۴ کے حاشیہ پر سوالیہ نشان لگایا گیا ہے۔ رشید صاحب کی تجویز ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں یے ہو اور اس کا ماقبل مفتوح ہو تو اس یے پر اضافت کا زیر لگایا جائے گا۔ جیسے، مے صاف، شے دیگر۔

سوال یہ ہے کہ ''شئے دیگر'' پر اگر ہمزہ کی علامت لگی ہو تو کیا حرج ہے۔ جو اضافت کا زیر لگایا جائے۔ اس طرح تو اس لفظ کو ''شے دیگر'' پڑھا جائے گا۔ اشتراک لفظ ختم ہو جائے گا علیم صاحب اس تجویز سے متفق نہ تھے۔

صفحہ ۸۲، سطر ۱۴ میں ''پُربیا'' پر نشان لگا کر حاشیہ پر سوالیہ نشان لگایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کہا کہ مشرقی اضلاع اتر پردیش میں عام طور پر پورب کے رہنے والوں کو پوربیا، ہی کہا جاتا ہے۔ اختصار کے طور پر لوگ باگ پُرب یا کہتے ہیں، نہ کہ پُربیا۔

صفحہ ۸۳، سطر ۴ کے سامنے حاشیہ پر جمع ؟ لکھا ہے۔ لیکن سطر ۵ کے پہلے لفظ مرثیہ کے سامنے اِ کی علامت بنی ہوئی ہے۔ علیم صاحب کا خیال تھا کہ رشید حسن خاں نے جمع بنانے کی کوئی اصل یا طریقہ نہیں لکھا۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ 'مرثیہ' کی جمع صرف مرثیے ہوگی۔ مگر جملہ میں یہ لفظ جمع واحد کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے اس مرثیے کا یہ بند لائق توجہ ہے۔ یہاں مرثیہ جو واحد ہے۔ اگر بولا یا سمجھا جائے تو فصاحت کے خلاف ہوگا۔

صفحہ ۸۴، سطر ۱۶۔ کے حاشیہ پر سوالیہ نشان اور لفظ پائے دار، پائے داری کے نیچے خط کشید کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں کہا کہ اس لفظ سے ان کا کیا مقصد ہے؟

صفحہ ۸۵، سطر ایک تا ۴ کو یک جا نشان لگا کر، سوالیہ نشان بنایا گیا ہے۔ علیم صاحب کا اعتراض یہ تھا کہ صاحب تصنیف الف اور ہمزہ کو ایک جگہ دیکھنے کے رَوادار نہیں ہیں مگر صرف ہمزہ کو ی سے بدلنے پر مُصر ہیں۔ اس سے مسئلہ کا کیا حل نکلے گا؟ سرمائیہ دار سے اگر ہمزہ نکال بھی دیا جائے یا شریک رکھا جائے تو لکھنے والے یا قاری کو کیا زحمت ہوگی۔ ہاں اگر

نمائندہ کے معنی الگ ہوں اور نمایندہ کا مفہوم جدا ہو تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔

صفحہ ۱۰۷، سطر ۱۱- اندرائین، اندرائن۔ حاشیہ پر سوالیہ نشان بنایا گیا ہے۔ یہ صحیح اِملا کی صنف کا لفظ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اِن دونوں میں اندرائن تو سمجھ میں آتا ہے مگر اندرائین تو بعید از عقل ہے۔ یوں کہ اس میں الف کے بعد ہمزہ بھی ہے اور ی کا حرف بھی، اور ان کے اشتراک پر رشید صاحب کو سخت اعتراض ہے۔

پروفیسر علیم، صاحبِ علم، صاحبِ فن، صاحبِ دانش اور صاحبِ لسانیات بھی تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی، جرمنی اور روسی زبانوں سے مکمل طور پر واقف تھے اور شعوری طور پر وہ نابغہ بھی تھے۔

رشید حسن خاں صاحب کی اس تصنیف کا حرف حرف علیم صاحب نے پڑھا۔ جگہ جگہ نشانات اور اعتراضیہ جملے بھی لکھے۔ بحث بھی کی اور استدلالی و اِبلاغی گفتگو کر کے، سوالیہ نشانات بھی قائم کیے۔ اگر دیکھا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس توجہ اور غور سے اس کتاب کا مطالعہ کیا گیا اور غور و فکر کیا اس طرح شاید ہی کسی نے مطالعہ کیا ہو۔ ہر صفحہ کو پڑھنا رائے قائم کرنا اور عملی اعتبار سے نظر کرنا ان کی صلاحیت علمی کے، شغف کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے اس کو ایک مقالہ ہی خیال کرنا اور اِسے ایک الگ تصنیف کا درجہ دینا، طے کرنا چاہیے۔ دراصل قیام چنڈی گڑھ میں میٹنگ اور جلسوں کے بعد جو بھی وقت ملتا، اس میں مطالعہ کتب اُن کا مشغلہ رہتا۔ اس تصنیف کا گہری نظر سے مطالعہ اور نشانات کا سلسلہ وہیں رہا۔

جب یہ تصنیف میرے ہاتھ آئی تو میں نے بھی اس کا غائرنظر سے مطالعہ کیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ رشید صاحب مجھ سے ایک خاص تعلق رکھتے تھے۔ عزت و احترام اور خلوص فرماتے تھے۔ اپنی تصنیفات کی ایک جلد مجھے بھی عطا کرتے تھے۔ بے پناہ اُلفت اور رَواداری فرماتے۔ وہ خاموش طبع، اور مفکر طبع شخصیت کے مالک تھے۔ علم کتاب، تصنیف و تالیف اور فکر اندازی اُن کو ممتاز بنانے کے لیے کافی ہے۔ غلط بات نہ وہ خود کرتے، نہ ہی پسند کرتے تھے۔ احترام شخص اُن کا شیوہ تھا اور ہے۔ مگر اپنی بے احترامی بھی اُن کو پسند نہ تھی۔ خوشامد اور اِلحاح سے وہ کوسوں دُور تھے۔ اپنی محنت کا اُن کو معاضہ بلکہ سلوک بھی زیادہ نہ ملا، لیکن اُن کے علمی لگن میں فرق نہ آیا۔ اگر رشید صاحب کے لیے یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگی کہ ان کے یہاں ظاہری تصنع، خوشامد اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اور بقول پروفیسر ظہیر صدیقی: وہ ایسا ملمع ہیں جو دائی ہوتا ہے، مگر مرحوم مشفق خواجہ صاحب نے ایک ملاقات میں شاہد علی خاں (مکتبہ جامعہ دہلی) کے ذیل میں ایک خوبصورت بات کہی کہ شاہد صاحب

ایک ایسی اکائی ہیں جو سب کے دل کی آواز ہیں۔ اسی طرح ایک تذکرہ میں مالک رام صاحب اور قاضی عبدالودود صاحب کا ذکر آیا۔ بہت سی باتوں کے ساتھ رشید حسن خاں صاحب کے سلسلے میں ایک نادر بات کہی کہ وہ ایک جامعہ نہیں ''جامعات'' ہیں۔ وہ کتاب کو آنکھوں سے نہیں، دِل سے مطالعہ کرتے ہیں اور صاحب نظر کی طرح اہل الرائے ہو کر، فیصلہ کرتے ہیں۔ بالغ نظری اُن کا فن اور رسم الخط کے سلسلے میں اُن کا مزاج صوتی اور تحریری دونوں کے اِمتزاج، کا متلاشی ہے۔ ویسے ضد بھی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ یہی ضد رشید صاحب کی شان بلکہ جان ہے وہ اُردو طرزِ تحریر کو یکساں بلکہ یکسانیت دینے کے خواہاں ہیں۔ یہ لگن کی بات ہے اور رشید حسن خاں میں یہ درجہ بدرجہٗ اُتم موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور فرمایا۔ جو شخص تحقیقی کام کا عادی ہو وہ خلعت فاخرہ کا طلب گار نہیں ہوتا۔ رشید حسن خاں پر یہ بات صادق آتی ہے۔ پروفیسر علیم صاحب، ذاتی طور پر رشید حسن خاں کی رشحات اور ان کے ادبی خدمات کے معترف تھے۔ ایک بار موصوف نے ذکر کیا تھا کہ اگر رشید صاحب کو ترقی اردو بورڈ سے وابستہ کر لیا جائے تو یہاں لغت سازی اور تحقیقی کام میں بے حد سہولت اور یکسانیت آ جائے گی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ''بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے''۔ یہ تجویز وزارت تعلیم کو بغرض منظوری پیش کی جائے۔ کب وہاں سے منظوری ملے، پھر اس سخت جانی کو، مسافت اور دفتری لوازم کو رشید حسن خاں کی منظوری مل سکے گی یا نہیں۔ بس اسی این وآں میں یہ بات رہ گئی۔ کاش یہ بیل منڈھ گئی ہوتی تو اردو زبان کا بہت بھلا ہوتا۔ بہر کیف، پروفیسر عبدالعلیم کی فکر صالح تھی وہ اُردو کی بقا کے لیے منصوبہ بند طور پر سوچتے تھے۔ میٹنگ میں حصہ لیتے، لغت سازی کے جلسہ میں شرکت کو لازمی خیال کرتے تھے۔ آج علیم صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ تلف ہو گیا۔ ان کا وہ مکان جو شوق سے علی گڑھ میں بنوایا تھا، مسمار ہو گیا، لیکن اہل علم اور مردان شوق کے دل میں اُن کی عظمت برقرار ہے۔ پروفیسر سالم قدوائی (سابق صدر شعبہ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے علیم صاحب کی خدمات علم واَدب پر جو خصوصی کتاب مرتب کی وہ ان کی خدمات کے اعتراف نامہ کے طور پر مقبول اَنام ہوئی۔ اب عابد سہیل اور ان کے ہم نوا اس ضمن میں جو کام کر رہے ہیں وہ متاثر کرنے کے لیے شاید کافی ہوں گی، یا نہیں۔ خدا علیم ہے!۔

اس کی چپ بھی سنائی دیتی ہے

نوٹ:- اعتراف ہے کہ اس کا عنوان پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کا عطیہ ہے۔

☆☆☆

سلامِ آخر

(آہ مشفق خواجہ!)

اردو کے مایہ ناز ادیب کالم نویس، نقاد، تبصرہ نگار اور محقق و مزاح نگار، مصور اور صاحب طرز انشا پرواز، مشفق خواجہ صاحب کی لاہور (مشترکہ ہندوستان) میں ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ عبدالوحید صاحب کے یہاں پیدائش ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بی اے (آنرز) اور ایم اے کیا فارسی اور عربی زبان کو بھی اپنے لیے لازم قرار دیتے ہوئے تحصیل علم کی۔ قدیم و جدید تہذیب سے ہم آہنگی اور زبان و ادب کی شستگی سے اپنے کو سنوارا۔ علمی دنیا میں تعارف اور نام پایا۔ محنت شاقہ اور کسب علم ذہانت و فطانت سے مقبول انام ہوئے۔

مشفق خواجہ صاحب سے میری پہلی ملاقات عم ذی قدر حاجی سید وصی احمد فانی بلگرامی نبیرہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، شاگرد مرزا دبیر کے واسطے سے ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب اور فانی بلگرامی کی دلی وابستگی اور علمی نہج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے لیے ان دو نوں کے حالات کا مطالعہ مزید لازمی ہے۔

میری پہلی ملاقات پر موصوف نے قدردانی کرتے ہوئے ایک شام اپنی اہلیہ صاحبہ اور چند احباب کے ہمراہ مختصر سی نشست ایک ہوٹل میں فرمائی تھی۔ دوسری صبح اپنے کتب خانہ کی زیارت کے لیے بھی مقرر فرمائی۔ میں جب حاضر ہوا تو ادھر ادھر کچھ گفتگو کے بعد میرے خطوط جو اُن کے نام لکھے گئے تھے، اُن کو چند ثانیہ کے اندر نکال کر دکھایا اور میرے مطبوع مضامین اور اسکی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے جسے میں دلجوئی کہوں گا فرمایا:

"آپ سب میں تحقیق و تدقیق کا مادہ جس قدر ہے وہ ایک نعمت ہے۔ رشحات صفیر ہو یا عکسی زیارت سب ہی میں یکسانیت کو دخل دیا ہے"۔

اس گفتگو کے دوران خواجہ صاحب نے اچانک کیمرہ اٹھا کر تصویر کشی کر لی اور بعد میں اس تصویر کی دو چھوٹی کاپیاں اور ایک بڑی تصویر بطور عطیہ اپنے معتبر کی معرفت مجھے نارتھ ناظم آباد کے علاقہ حیدری میں، میری قیام گاہ پر ارسال فرمانے کی زحمت کی۔ میں نے شکریہ کے دو بول فون پر ادا کیے تو کہا: سید کی خدمت ہمارے لیے وسیلہ مغفرت ہے!"

ایک اور ملاقات میں اہل بلگرام کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے علمی جہد کا ذکر کیا۔ میں نے عرض کیا'' نہ تحقیق، نہ توفیق (جیسا کہ آپ نے اظہار خیال فرمایا تھا) دراصل ہمیں ورثہ میں جو ملا ہے اس کا اعادہ کر دیتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ادھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز اور حق آگاہی کو ضرور مدنظر رکھتے ہیں۔ اب یہ وصف ہو یا ہنر یا کچھ اور''

خواجہ صاحب نے اتفاق رائے کرتے ہوئے یعنی کتب اور کتب خانہ کی ترتیب کے متعلق بہت سی نادر باتیں فرمائیں اور یہ کہ ان کو کن کن مشکلات سے واسطہ پڑا۔ کن مراحل سے گزر کر نادُر نایاب نسخے، رسائل، خطوط، تصاویر اور نقد و نظر کے مجموعے، مخطوطے حاصل کیے۔ ان کی تربیت و ترکیب میں کیا کیا کاوش ان کی ہوئی۔ ملازمت اور کسب معاش، فراہمی آذوقہ اور سفر و حضر ادبی پروگراموں اور جلسوں جلوسوں میں حاضری کے بعد جو بھی وقت ملتا ہے اسے ترتیب و تحصیل کتب خانہ کی نذر کرتا۔ بس میرا مطمح نظر رہا اور واقع یہ ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک کی منزل کا ہر کونہ کتابوں کے انبار سے بھرا پڑا ملا۔ میں نے پھر دو دن بعد حاضر ہو کر ہر طبقہ کا دورہ کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ بشوق اسے قبول کیا۔ خود تو بالائی منزل تک ہی کتب کی سیر پر اکتفا کی۔ اس عرصہ میں جو فون آتے اسے خود ہی سنتے، جواب دیتے۔ مصروفیت کا اظہار کسی سے کرتے اور کسی کو وقت کا تعین فرما کر مطمئن کرتے۔ نیچے کی منزل اپنے معاون کی معیت میں دیکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہر طبقہ کے کتب کی فہرست مکمل تھی۔ اخباروں کا سلسلہ الگ، کتب کی ترتیب جدا۔ آئینہ خانہ کے بطور ہر کتاب کو صاف اور مجلی پایا۔ ایک بات اور جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ اپنے اردگرد بے ترتیبی کو گوارہ نہ کرتے تھے۔ نفاست پسندی بدرجہ اتم تھی۔ چنانچہ اپنے معاون کو ایک بار سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ کالر کو موڑ کر رکھنا پسند کرو گے؟ پہلے تو میں اس جملہ کو نہ سمجھا مگر شعور نے بتایا کہ تنبیہ کا یہ بھی ایک شائستہ طریقہ ہے جو خواجہ صاحب نے اپنایا۔

چند سال بعد ایک اور ملاقات میں خواجہ صاحب سے عرض کیا...... صفیر بلگرامی کی ایک تصنیف ''تاریخ بلگرام'' آپ کی نظر سے گزری ہے؟ صاف گوئی سے فرمایا...... ایک ناقص نسخہ وصی احمد بلگرامی کے یہاں نظر سے گزرا۔ میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اس نادر تصنیف کا نسخہ خدا بخش لائبریری میں ضرور ہوگا۔ اس لیے میں نے مایہ ناز محقق قاضی عبدالودود صاحب سے ذکر کیا۔ موصوف نے لکھا۔ میری نظر سے یہ نسخہ نہیں گزرا ہے۔ نہ ہی

کسی فہرست یا کتب خانہ میں نظر آیا۔ تب میں نے خواجہ صاحب سے کہا:

''ایک نسخہ میرے پاس محفوظ ہے لیکن اس کے چند صفحات غائب ہیں۔ اس پر قاضی عبدالودود صاحب نے ہدایت کی تھی کہ اس نسخہ کو بحفاظت رکھنا لازم ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی فرمایا اور یہ کہا کہ کاش یہ نسخہ آپ کے ہمراہ ہوتا۔ ہم اس کی زیارت کر لیتے اور دیکھتے کہ اس کا مواد کیا ہے؟''

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ جب اس لائق ہوا کہ وہ عظیم تحریر و تخلیق صفیر بلگرامی کی خواجہ صاحب کے نگاہ تلطف سے گزارتا۔ ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا۔ وہ موقع میسر نہ آیا۔ البتہ اس نسخہ کی ایک فوٹو کاپی عزیزی احسان احمد بلگرامی سلمہٗ کے سپرد کردی کہ خواجہ صاحب کی نظر سے گزار دینا لیکن! خیر کراچی میں جو نسخہ ہے (قدیم وہ اس لائق نہیں کہ کوئی اس کا مطالعہ کر سکے۔ میرا نسخہ بہتر حالت میں ہے اور ضروری ہے کہ اس کو زیور طبع سے آراستہ کیا جائے۔ اس تاریخ بلگرام کی نوعیت دیگر تاریخوں سے یکسر اور قطعاً مختلف ہے۔ اس میں بلگرام کی تہذیبی، معاشرتی اور سوانحی خاکے کے سواء مذہبی اور ملی معلومات کا خزانہ بھی ملے گا جو اور کسی خاندانی تاریخ کا حصہ نہ بن سکا۔ اس سے صفیر بلگرامی کی اختراعی اور ذہنی کاوش کی آگاہی بھی ممکن ہے،

۲۸/جنوری ۲۰۰۵ء کو کراچی چند روز قیام کے لیے روانہ ہوا تو اس نسخہ کو ایک ٹین کے کیس میں رکھ کر لیتا گیا۔ ۲۹/جنوری کو میں نے عزیزی سید احسان احمد بلگرامی سے کہا کہ وہ مشفق خواجہ صاحب سے ملاقات کا وقت طے کر لیں۔ میرا قیام ڈیفینس کے علاقہ میں تھا۔ دوسرے روز اطلاع ملی کہ خواجہ صاحب نے کل صبح ساڑھے سات بجے کا وقت مقرر فرمایا ہے مگر اسی شب اتنی بارش ہوئی کہ کراچی شہر کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ گاڑیاں پھنس گئیں۔ دو ایک حادثہ بھی رونما ہوئے۔ پاکستان کے دیگر علاقہ تو سیلاب کی زد میں تباہی و بربادی کا المیہ بن گئے۔ لہٰذا ایسے حالات میں نور چشم فیروز احمد بلگرامی مجھے لینے نہ آسکے۔ پھر یکم فروری کو لاہور کا سفر پیش تھا۔ ریزرویشن پہلے سے ہو چکا تھا۔ وہاں سے واپسی ۹/فروری کی سہ پہر (نو گھنٹہ تاخیر سے) ہو سکی۔ پھر بھی میں نے دس فروری کو ملاقات و عیادت کا شرف حاصل کرنے کی سعی کی۔ اب میرا قیام فیڈرل بی ایریا کے علاقہ میں تھا۔ دوسرے روز ملاقات کا وقت ۱۱ بجے مقرر ہوا۔ مگر موسم کی خرابی اور خود خواجہ صاحب کی علالت کے تحت ملتوی کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۱۳/فروری کو ۴ بجے شام کو بھی فون کر کے ملنے کی آرزو ظاہر کی مگر جواب میں یہ

اطلاع ملی کہ خواجہ صاحب آرام کر رہے ہیں بیدار ہونے پر مطلع کر دیا جائے گا۔ میں منتظر ملاقات رہا۔ صدائے برنہ خواست آسکی تو شرف آباد سے ۷ بجے شب میں فیڈرل بی ایریا واپس آ گیا۔ ۱۴ر فروری کی صبح ۱۰ بجے میرا ہوائی اڈے پر حاضر ہونا ضروری تھا۔ شرف آباد میں تین چار گھنٹے انتظار میں گزارا اور احسان احمد سلمہ سے خواجہ صاحب ہی کا ذکر درمیان میں ہوتا رہا۔ اس عرصہ میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی تحریریں، ان کے خطوط اور چند نادر یگانہ تحریریں دکھا کر کہا اور آرزو ظاہر کی کہ ایسی وقیع تحریریں موصوف کو دکھا کر احسان مند ہوں گا اور یہ کہ اگر وقت ہوتا تو جمیل الدین عالی صاحب کی نظر سے بھی گزارتا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مجبوراً واپس اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔ تنگی وقت کا احساس ضرور رہا۔ لیکن ہمت کر کے خواجہ صاحب کی فون پر دریافت عافیت کرنے کی آرزو نہ روک سکا۔ فون کیا تو بتایا گیا کہ اس وقت غنودگی میں ہیں۔ مجبوراً اس شخص کو اپنا سلام پہنچانے کی استدعا کر کے رابطہ ختم کر دیا۔ کیا جانتا تھا کہ میرا یہ ننا کو ''سلام آخر'' ہوگا۔ کاش دست بوسی اور شرف زیارت کا موقع حاصل ہو جاتا۔

۲۳ر فروری ۲۰۰۵ء کو اخبار سے یہ دل خراش خبر ملی کہ ۲۱، ۲۲ر فروری کی درمیانی شب میں (غالباً) رحلت خواجہ ہوئی تو تڑپ گیا۔ کیسی شفیق اور مشفق ذات تھی۔ اسم بامسمہ جب بھی ملاقات ہوتی، گفتگو کا لہجہ اور انداز تکلم نرم، الفاظ کو پرکشش ہی پاتا، فون پر بات ہوتی تو۔ اس میں بھی حلاوت کو دخل رہتا تھا۔ شائستگی اور شرافت مزاج میں تندی ہوگی۔ مگر ظاہرہ نہیں معلومات سے پر مگر گفتگو میں خود اعتمادی کے سوا ظاہر داری کا شائبہ نہ ہوتا۔ ہجو ملیح کی بات ہوتی تو شرافت کو ملحوظ رکھتے۔ تمکنت کو دخل رہتا۔ اختلاف رائے میں معلومات میں بھی احترام شخصی کا عنصر اُن کی تحریروں سے ہویدا ہے۔ کالم نویس کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی معلومات کو اہل بصیرت تک اپنے انداز فکر سے پہنچائے۔ خواجہ صاحب نے اسے بھی لغویات سے پاک رکھا۔ جو سوچا، کہا اور لکھ دیا۔ قاری کے دل میں بات اتر گئی تو ٹھیک ہے ورنہ گزر گئے اور اپنی راہ اختیار کر لی۔

ایک گفتگو میں جدی صفیر بلگرامی کے سلسلہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ عرض کیا کہ خلیق انجم صاحب اور دیگر اہل قلم نے (دیگر اہل قلم پر زور دیا تھا) نے بلا جواز محض ادھر ادھر کے حوالہ سے (مخاصمت رکھ) غالب اور صفیر کے خطوط پر جو اعتراضات کیے ہیں اس پر اب خود آپ کی رائے کیا ہے؟ جواب دیا ''غالب اور صفیر بلگرامی پر میرا مضمون آپ نے پڑھا ہوگا۔ میرا نظریہ ہے'' میں نے درمیان میں ہی عرض کیا کسی نے بھی پایہ ثبوت کی کوئی بات نہ کہی، نہ لکھی سوا ابہام

کے، مجھے یاد ہے۔ بہت نرمی سے کہا تھا کہ بلگرامی صاحب صفیر کی بدقسمتی یہ ہے کہ اُن کے اردگرد جو ہالہ تھا وہ شاد کی طرح کا نہ بن سکا۔ سخن شناس نہ ملا اور نہ قضیہ نہ کھڑا ہوتا جس کی بنیاد س، ش، ص، بن گیا۔ مگر جہاں تک اس مضمون بلکہ کتاب کا تعلق ہے نہایت تہذیب اور دیدہ وری سے اسے پیش کیا گیا ہے۔ مگر ہم نوائی کرنے والے اسے بھی نہ مل سکے۔ خاموشی سے فائدہ اٹھا کر میں نے کہا 'حضرت والا۔ اہل بلگرام کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہوا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سید علی بلگرامی کی تمدن عرب اور تمدن ہند ہو یا سید علی احسن بلگرامی ثم احسن مارہروی یا شاہ برکت اللہ کی ادبی خدمات ہوں یا وصی احمد فانی بلگرامی کی علمی و ادبی کاوشیں۔ کسی اور نے بھی (سوا آپ کے اور حسن مثنیٰ صاحب کے) ان پر قلم نہ اٹھایا۔ کیا اہل بہار کا فریضہ نہ تھا کہ وہ جہاں شاد اور دیگر اہل فن پر قلم اٹھانا گوارا کرتے ہیں، وہیں صفیر بلگرامی پر بھی قلم اٹھاتے۔ ان کی ادبی اور دیگر علمی حیثیت کو اجاگر کرنا مناسب خیال کرتے۔ یہ ایک المیہ ہے نا؟

خواجہ صاحب نے احتیاتی نظر ڈالتے ہوئے فرمایا کہ دراصل آپ کے خاندان کے بزرگ اہل قلم گوشہ نشینی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ مجادلہ اور مقاتلہ (محاکمہ) کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہ وجہ بھی گوشہ گمنامی کی ہے۔ کیا سید اولاد حیدر فوق بلگرامی کی شخصیت اس لائق نہ تھی کہ اہل بہار ان کو نمایاں طور پر ظاہر کرتے۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد کے معتبر معتمد خاص جناب محمد اجمل خاں صاحب کو بیان مجھے یاد ہے کہ ابوالکلام آزاد سے کسی نے کہا کہ مولانا شبلی نے سیرۃ النبی میں مولا علی سے متعلق جو روایت تحریر کی ہے اس پر آپ کی رائے کیا ہے؟ مولانا آزاد نے برجستہ فرمایا تھا جو رائے اسوۃ الرسول کے مصنف کی ہے وہی میری ہے۔ لیکن محض ملک خطا کے شاہزادے یا ایک دو مضمون کے سوا جو علامہ شبلی سے متعلق تھے کسی نے فوق بلگرامی سے استفادہ کا اعتراف نہ کیا۔

اس طرح کی بہت سے باتیں خواجہ صاحب کی یادگار کے طور پر حافظہ میں ہیں۔ اس وقت اس کے بیان کا یہ محل نہیں، سوا اس کے کہ:

زمین کا طبق آسماں کا طبق　　　سنہرے روپہلے ہوں جیسے ورق

میں جب کراچی کا سفر کرتا تو پروفیسر مختار الدین آرزو اور شاہد علی خان (مکتبہ جامعہ دہلی) کو ضرور خبر کر دیتا۔ خط، کتب یا سوغات جو بھی مشفق خواجہ صاحب کے لیے دیا جاتا وہ اُن تک پہنچا دیتا۔ واپسی پر بھی یہی عمل دہراتا۔ شاہد صاحب کے لیے کم مگر آرزو صاحب سے متعلق

تفصیلی گفتگو درمیان میں ہوتی۔ایسا ہی آرزو صاحب کا عمل تھا۔خواجہ صاحب سے متعلق اُن کی مصروفیت اور علمی اموراوران سے متعلق اشخاص واحباب پر ہمارے درمیان اکثر گفتگو ہوا کرتی۔

لیکن افسوس کہ اب ہم اس آسمان علم وادب کے ورق کو سنہرا اور روپہلا کر کے اپنے دامن علم میں جگہ دے کر اسے یادرکھیں۔ان کی تخلیقات کو نگاہ قدر سے دیکھیں اس کے سوا اب ہمارا کوئی اختیار نہ رہا۔بقول شاعر

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے　　　یہ رنگ آسمان دیکھا نہ جائے

سب سے آخر میں مشفق خواجہ کی اپنی مختصر ترین حیات کا تحریری خاکہ پیش کر کے رخصت کی اجازت چاہوں گا۔یہ قلمی کشکول جب ان کے سامنے رکھی کہ ان عنوانات کی خانہ پری فرمادیں تو مسکراتے ہوئے کہا تھا:

''یہ آپ نے میرے امتحان کی طرح تقریباً پچاس سال بعد پھر امتحان میں ڈالا۔ نہ جانے مجھے کامیابی نصیب ہوگی یا نہیں؟''

عرض کیا: نقل کرنا ممنوع ہے:''

مسکرا کر کہا۔نہیں۔دراصل یہ سوال نامہ نہایت اہم ہے اور معلوماتی بھی اس سے ادیب بلکہ ممتحن کی فنکاری صلاحیت اوراس کے ادبی ذوق کی آگہی بھی کی جاسکتی ہے۔

جواباً میں نے صرف اسی قدر عرض کیا تھا:

صاحب، نہ یہ امتحان کا پرچہ ہے نہ ہی محاسبہ، بلکہ یہ اہل بلگرام کا ایک شوق علمی ہے۔جس کی پذیرائی ہر اہل علم نے کی۔میں ذاتی طور پر آپ سب کو ممنون کرم ہوں کہ اب تک تقریباً دو ڈھائی سو اہل علم وادب سے ان ہی عنوانات کی خانہ پری کرا چکا ہوں۔

وہ دیکھ رہا ہوں میرے ہم عصر بھی ہیں اور میرے پیش رو بھی مگر یہ کام تو اکیدمی کا ہے جسے آپ نے تن تنہا انجام دیا اور دینے میں لگے ہوئے ہیں ضرورت اس کے اشاعت کی ہے کہ یہ ایسا علمی سرمایہ ہے جو لازوال کہلانے کا مستحق ہے۔

میں نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔اس گفتگو کے خاتمے پر مشفق خواجہ صاحب کے چہرے پر جو مسکان آئی تھی وہ یاد کر کے آنسو بہانے کے سوا اب کچھ امکان میں نہیں ہے۔خدا مغفرت کرے۔آپ سب موصوف کے تحریری عکس کا مطالعہ کر کے بخشش کی دعا کریں۔

نام: مشفق خواجہ ولدیت: خواجہ عبدالوحید
تاریخ پیدائش: ۱۹/دسمبر ۱۹۳۵ مولد: لاہور
سکونت: کراچی وطن لاہور
تعلیم (سند): بی۔اے (آنرز) ایم اے
دیگر کوائف: (پہلی غزل شعر/افسانہ/مضمون)

تصانیف/نمونہ کلام: ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۲ء ابتداء شاعری سے ہوئی ۱۹۵۴ سے مضمون نگاری شروع کی۔ آپ اردو کے کس شاعر/ادیب سے متاثر ہیں اور کیوں؟ جیسے۔ غالب اقبال کیوں؟ کا جواب دینے کی گنجائش اس مختصر جگہ میں نہیں ہے۔ا

آپ کی نظر میں بہتر شعر:

میر: میران باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
غالب: دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہے
مصحفی: چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نو بہار ٹھہریگا

مومن	×
شاہ عظیم	×
طنز نگار	مشتاق یوسفی
مزاح نگار	مرزا فرحت اللہ بیگ
ناول نگار	قرۃ العین
افسانہ نگار	سعادت حسن
شاعر (دور جدید)	فیض
صحافی	ظفر علی خاں

تاریخ ۹۱/۱۱/۲۳ مشفق خواجہ، کراچی شہر

☆☆☆

دو بھائی

سید احمد شاہ بخاری بن سید اسد اللہ شاہ بخاری کی پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور (مشترکہ ہندوستان) میں ہوئی تھی۔ پشاور ان دنوں مایہ ناز شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اہل علم و دانش اور فنکاروں کے سوا، ارد گرد کے ممالک اور ملکوں سے آمد و رفت کا سلسلہ بھی لگا رہتا تھا۔ گویا ایک طرف یہ شہر افغانستان، روس، ازبکستان، ایران اور دیگر ممالک کے راہ گزر کا کام بھی انجام دیتا تھا، بہت سے حقائق اس سے وابستہ ہیں۔ اسی شہر میں سید احمد شاہ بخاری نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی زبان میں کیا، پھر کیمبرج یونیورسٹی لندن سے اعلیٰ ڈگری پا کر وطن واپس آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔ تعلیم کے تکملے اور استاد ہونے کے باوجود اپنے دور کے اساتذہ اور اہل علم کے نزدیک موقر شمار کیے جاتے تھے علم کے مختلف درجات کے آپ کو مزاح نگاری کا بیحد شوق تھا۔ بات بات میں بات پیدا کرنا آپ کا ہنر تھا۔ آپ نے اپنا قلمی نام پطرس ؔ رکھا اس سلسلہ میں کچھ تفصیل درمیانی سطور میں پیش کی جائیں گی۔ ملازمت کے سلسلہ میں آپ کا مایہ ناز کام ریڈیو اسٹیشن کی ترتیب اور تہذیب ہے۔

ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کی ابتداء غالباً ۱۹۳۷ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ اس محکمہ کے لیے برطانوی حکومت نے احمد شاہ بخاری کا انتخاب کیا۔ ان کی صلاحیت ان کی اصابت رائے اور شعور کو دیکھتے ہوئے ریڈیو کا سیکشن آپ کے سپرد کر دیا گیا اور اسسٹنٹ کنٹرولر ریڈیو کی حیثیت سے آپ نے کام کی ابتداء کی۔ ریڈیو کے محکمہ میں نشریات اور عوامی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے بخاری صاحب نے نہ صرف محکمہ میں بلکہ ملک میں بھی اہمیت حاصل کر لی۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں اقوام متحدہ کے شعبہ نشریات میں بھی جنرل سکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ جس سے انہوں نے ملک اور غیر ملک دونوں میں شہرت پائی۔ لیکن وہ انگریزی ادب کے طالب علم تھے اور اسی زبان میں اپنی نگارشات پیش کیا کرتے تھے مگر اردو میں بھی وہ اپنے قلم کے جوہر کبھی کبھی دکھایا کرتے تھے۔ اردو میں وہ جیسا کہ ذکر کیا ہے، پطرس کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ اگرچہ اردو کا سرمایہ بہت کم ہے۔ لیکن اگر

ہم اس کمیت کو نظر انداز کردیں تو ان کی شخصیت ایک مستحکم ادیب کی نظر آئیگی ان کے مضامین میں 'کل آنکھ میری کھلی' 'انجام بخیر۔ لاہور کا جغرافیہ اور 'کتے' شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ کتے کے اوپر اردو میں دو شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے قلم اٹھایا ایک سرسید احمد خاں اور دوسرے سید احمد شاہ بخاری۔ دونوں مضمون اگر چہ اپنی نوعیت سے الگ ہیں مگر مقصدیت ایک ہے۔ وہ یہ کہ زبان اور مدعا میں بیحد مماثلت ہے۔

سید احمد شاہ بخاری کے ایک اور بھائی سید ذوالفقار علی شاہ بخاری بھی تھے جن کی ولادت بھی پشاور میں ۴ / جون ۱۹۰۴ کو ہوئی تھی۔ اس طرح آپ پطرس سے چھ سال چھوٹے تھے۔ سید احمد شاہ بخاری کو شہرت ان کے نام یا خاندان سے نہیں ہوئی بلکہ ان کی صلاحیت، قابلیت اور قلمی نام پطرس سے ہوئی۔ پطرس سے راقم کی ملاقات کاؤس جی سید آل عبا آوارہ حیدر آبادی کے واسطہ سے ہوئی تھی۔ موصوف آل انڈیا ریڈیو دہلی کے فوجی پروگرام کے نامور شرکاء میں تھے۔ اپنی آواز، الفاظ کی ادائگی اور ساخت کے سبب مقبول انام تھے۔ زبان کے سلسلہ میں آپ اودھی، دکنی اور دہلی کی عام محاوراتی زبان سے کماحقہٗ واقف ہی نہیں۔ اس کی ترسیل پر بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ آپ کے سلسلہ میں ایک مضمون رسالہ تہذیب الاخلاق (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) شمارہ فروری ۲۰۱۱ء میں کاؤس جی آل عبا کے تحت شائع ہوا تھا۔ جس سے آل عبا صاحب اور بخاری صاحب سے متعلق کچھ گوشے مل جائیں گے۔ بخاری صاحب بھی ایک گونہ الفت وانسیت راقم سے رکھا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ 'میں بخارہ کا سید ہوں مگر آپ بلگرام اور واسط سے تعلق رکھنے والی ذات ہیں۔ لہٰذا مجھ سے انسب ہیں۔ تب میں نے کہا کہ، جب ہم آپ الفت محمد و آل محمدؐ سے وابستہ ہیں تو پھر یہ این و آں، چہ معنی دارد؟ مسکرا کر کہا، بخارہ اور واسط کا فاصلہ تو برقرار رہے گا نا۔ پھر ہمارا خانوادہ یقیناً سادات سے ہی وابستہ ہے۔ اس اعتبار سے بھی آپ اور ہم ایک جان ہیں۔ ویسے مجھے حیرت ضرور ہوئی کہ عمر کے اعتبار سے وہ ۲۷ سال بڑے تھے۔ پھر عہدہ کے لحاظ سے بھی وہ عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ مگر گفتگو مجھ سے برابر کے فرد کی طرح کیا کرتے۔ ایک روز میں نے عم ذی قدر آل عبا صاحب سے ذکر کیا کہ بخاری صاحب کو مجھ جاہل میں کیا نظر آیا جو مجھ سے اس طور سے پیش آتے ہیں؟ مسکرا کر کہا۔ برخوردار تم جس نسل اور خاندان کے فرد ہو وہ امتیازی شان رکھنے والی ذات ہے۔ کیا تم واقف نہیں کہ میر عبدالواحد بلگرامیؒ سے ان کے کلام کی سماعت قوال کے بعد تادیر اکبر اعظم نے گریہ کیا اور جب قوال سے اس کلام کے تخلیق

کار سے متعلق دریافت کیا اور اس نے بتایا کہ یہ میر عبدالواحد بلگرامی کا کلام ہے۔ تو اکبر بادشاہ نے آپ سے خود ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اور کچھ عرصہ بعد دونوں میں آگرہ میں ملاقات ہوئی تم اسی نسل کے فرد ہو اور بخاری صاحب کو قدیم اور جدید کے فرق کی مکمل آگاہی ہے۔

ایک دن ریڈیو اسٹیشن گیا، بچوں کے سکشن اور دیہاتی پروگرام کے انچارج سے مل کر باتیں کر رہا تھا کہ اچانک بخاری صاحب معائنہ کرتے ہوئے آ گئے۔ پہلے تو محکماتی امور پر بات کرتے رہے، چلتے وقت مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا، کس کے پروگرام میں آپ حصہ لیں گے؟ میں نے عرض کیا، بروقت کسی پروگرام میں حصہ نہیں لونگا، چلتے چلتے میں نے ایک بات کہی، کچھ عرض کروں، پوچھا کیا؟ پطرس کے معنی کیا ہیں۔ مسکرا کر کہا۔ فضول۔ اصرار کیا کہ نہیں کوئی اور معنی تو ہونگے؟ اور آپ نے یقیناً معنی کے اعتبار سے اسے منتخب کیا ہوگا۔ ذرا سنجیدگی سے کہا۔ اول تو اب تک تو کوئی سوالی نہیں ہوا، آپ پہلے فرد ہیں دراصل میرا قلم ادھر ادھر کے عنوانات پر اٹھتا ہے اس لیے میں نے اپنا قلمی نام ایک مہمل اور فضول نام پطرس سے جوڑ رکھا ہے۔ کہ کوئی میری اصل سے آشنا نہ ہو سکے اور حق یہ ہے کہ بخاری صاحب کی ذات اپنے عہدے میں بہت محترم تھی۔ سرکار، دربار کے سوا اشخاص میں بھی انکو فضیلت حاصل تھی۔ انگریزی ادب کے ماہر تو تھے ہی مگر عاشق اردو، فارسی اور عربی کے شناور بھی تھے پشاور کے ہونے کے باوصف زبان شستہ، معیاری تھی۔ نفاست کے پیکر دیدہ زیب اور اشخاص کے قدردان کشادہ ذہن کشادہ دہن کشادہ جبیں۔

سید احمد شاہ بخاری پطرس کے سوا آپ کے چھوٹے بھائی سید ذوالفقار علی شاہ بخاری سے بھی میرے تعلقات خاصے تھے۔ آپ بھی کبھی ۲۸ رچتر گپتا روڈ، نئی دہلی پر بھی بغرض ملاقات، آوارہ صاحب کے ہمراہ آجاتے تھے اور علمی گفتگو کرنے کے سوا مذہبی امور پر بھی کبھی ہو جاتی۔ آپ کے والد کا نام اسداللہ شاہ بخاری تھا، بھائی کا نام احمد شاہ بخاری تھا۔ اس موضوع پر کہنے لگے باپ کا نام اسداللہ، بھائی کا نام احمد اور میرا نام سید ذوالفقار علی شاہ بخاری ہے، ان میں نسبت قریبہ کیا ہے اس سے اہل دانش واقف ہیں۔ میں اس پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں۔ مختصر یہ کہ آپ بیحد سنجیدہ اور خوش خلق فرد تھے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی میں سرحدی گاندھی کے ایک ہم نوا بخاری صاحب سے ربط ضبط قائم ہوا۔ معلوم ہوا کہ ان کا رشتہ بھی اسداللہ شاہ بخاری سے تھا ایک بار میرا جانا پشاور ہوا بخاری صاحب کے گھر پر حاضری کا موقعہ بھی ملا۔ یہ سات بھائی ہیں ان کا گھر ''ست گھرا'' کہلاتا ہے میری خصوصی طور پر

دعوت کی گئی اور اپنے بھائی سید عنایت علی شاہ بخاری کے سبب، اپنے جرگے کے کئی افراد کو مدعو کیا۔ بہت لمبا چوڑا دالان، صحن کی وسعت بھی طویل اور مکانیت کی کوئی حد نہیں۔ دالان میں جملہ افراد خاندان تقریباً ۳۰-۴۰ کی تعداد میں موجود تھے۔ کھانے میں جملہ لوازمات مرغن اور تندوری بکرے کے سوا مرغ ماہی حاضر تھے۔ ہم غیر ملکی اور غیر پشاوری، ان لوازمات کو دیکھ کر کانپ سے گئے اور بخاری صاحب کے چھوٹے بھائی مشتاق بخاری (جو صدر بنک میں عہدہ دار تھے) سے کہا۔ اس قدر لوازمات کو دیکھ کر ہی پیٹ بھر گیا۔ لہٰذا مجھ سے اصرار نہ فرمائیگا، مسکرا کر کہا۔ آپ جتنا شوق کرسکیں وہی ہمارے لیے بہت ہوگا۔

اس تفصیل بیجا کے لیے معذرت خواہی کے بعد عرض ہے کہ سید ذوالفقار علی شاہ بخاری اپنی طبع کے اعتبار سے بہت مغتنم فرد تھے۔ صاف سادہ، دلکش اور باوضع علم کے مختلف درجات طے کیے ہوئے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے مہتمم گویا آپ ہی تھے۔ پروگرام کرانے والوں سے کبھی کبھی بحث مباحثہ بھی کرتے نظر آتے۔ ایک بار چودھری صاحب سے سنجیدہ ہوکر کہا۔ دیہاتی پروگرام کے لیے پہلے دیہاتی بنئے۔ اس سے ان کی صلاحیت اور اصابت رائے کی آگاہی ہوسکتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ اپنے بھائی سید احمد شاہ بخاری کی طرح ہمہ صفت نہ تھے مگر باصلاحیت لازمی تھے۔ سیادت کے جوہر کے امین، سیادت پر یاد آیا جیسا ذکر کیا ہے کہ آپ سب کے ایک دوری تایازاد بھائی سید عنایت علی شاہ بخاری بھی دہلی میں ہوتے تھے۔ جو سرحدی گاندھی کی تحریک کے ہم نوا تھے لہٰذا ترک سکونت کرنا پڑا اور کابل قندھار کی راہ سے پردہ پوشی کرتے ہوئے عرب۔ ایران اور مصر وغیرہ کی راہ سے ہندوستان وارد ہوئے۔ یہاں آپ کو سر چھپانے بلکہ زندگی گذرانے کے واسطے زمین میسر آگئی۔ آپ کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کے سبب نظام مملکت ہند میں موقع میسر آگیا۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ بعد بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کی داستان غم واپنے گھر در سے جدائی کی تفصیل کا علم ہوا اس عرصہ میں ایک غیر ملکی وہ بھی جس کا والی وارث نہ ہو اس سے تعلق قائم ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ مگر قدرت نے یکجہتی فرمائی کچھ عرصہ بعد بخاری صاحب کو اہلی زندگی کا خیال آیا۔ ان دنوں کون تھا جو ایک غیر ملکی کو اس سعادت سے نواتا۔ لیکن نظام قدرت کے تحت اللہ نے رسول پور دھولڑی (اترپردیش) کے ایک معزز خانوادے نے ان سے رشتہ کرنے کی بات قبول کرلی۔ مگر ولایت نہیں، ولی کا سوال پیدا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا اس بوڑھی

اولاد کو باپ میں ہوں۔ اور میں ان کا رشتہ پیش کرتا ہوں اگر آپ سب قبول کرلیں تو عنایت ہوگی۔ اس طرح بخاری کا رشتہ ہوگیا۔ ان دنوں بخاری صاحب درگاہ پنجہ شریف کشمیری گیٹ دہلی کے باشی تھے۔ شادی کے بعد دفتر الجمعیت کے قریب ہی مولانا حفظ الرحمٰن کے بیٹے کی وساطت سے ایک کمرہ اور دالان کا بالائی حصہ مل گیا۔ جہاں خدا نے عنایت علی شاہ بخاری کو ایک بیٹا اور دو بیٹیاں عطا کیں۔ دونوں لڑکیاں لائق اور ہنرور ہیں۔ ایک تو سید احمد حسن زیدی صاحب (حج کمیٹی گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک ذمہ دار) کے خانودے کی بہو ہے اور دوسری بیٹی بھی علی گڑھ کی بہو ہے۔ اس کے سوا بڑی بیٹی ناہید کی ایک بیٹی ماہر فن خطاط اور غیر ممالک کے شہرت یافتہ، مسلم یونیورسٹی اسکول کے استاد جناب سید سرفراز احمد زیدی صاحب کی بہو ہے۔ اس تفصیل سے مراد صرف یہ ہے کہ ایک غیر ملکی کو ہندوستان کی سرزمین نے ہر طرح کی سعادتوں سے نواز دیا۔ سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو پنڈت جواہر لعل نہرو (وزیر اعظم ہند) معزز خیال کرتے تھے بلکہ اس دور کے ہر کانگریسی کی نظر میں بخاری صاحب کا ایک درجہ تھا۔ معاش کے لیے آپ کو کشمیر یونٹ سے ملحق کرا کے سکون خاطر بخشا گیا تھا اور تا حیات ان کی سرپرستی حکومت ہند نے کی۔

سید ذوالفقار علی شاہ بخاری سے میرے تعلقات جس طرح کے تھے اس ضمن میں موصوف کی قلمی سوانح حیات ایک یادگاری تحفہ ہے۔ جسے ۵۱ سال کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر اس قلمی سوانح حیات سے بہت سے گوشے منظر عام پر آسکیں گے۔

سوانحی قلمی حالات

نام: سید ذوالفقار علی شاہ بخاری **ولدیت:** سید اسد اللہ شاہ بخاری

تاریخ پیدائش: ۴؍ جون ۱۹۰۴ء **مولد:** پیشاور

سکونت: کراچی **وطن** پاکستان

تعلیم (تفصیل امتحانات وغیرہ):

گورنمنٹ ہائی اسکول پشاور۔ ایڈورڈ کالج پشاور۔ اورنٹیل کالج لاہور۔

دیگر کوائف: (ملازمت، پہلی غزل، افسانہ، مضمون وغیرہ وغیرہ)

ممبر بورڈ آف ایگزمنرز شملہ دہلی (جنرل اسٹاف) آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی۔

بمبئی، کلکتہ، بی بی سی لندن، ایم جی ایم نیویارک، ریڈیو پاکستان (ڈائرکٹر جنرل)

کراچی ۱۹۵۹ء میں پنشن پائی اور تمغہ پاکستان کا خطاب پایا۔ اشعار کا مجموعہ زیر طبع۔ آہنگ موسیقی اور راگ دریا طبع ہو چکی ہیں۔ غزل میں نام پایا۔ موسیقی کے علم میں سند کا درجہ حاصل کیا۔ کوئی ساڑھے چار سو خیال خوش رنگ کے نام سے تصنیف کیے جو ہندو پاکستان میں گائے جاتے ہیں۔

آپ کی نظر میں بہتر شعر:

بہتر شاعر (دور جدید)	حسرت موہانی
طنز نگار:	برادر مرحوم پطرس
مزاح نگار:	×
ناقد:	فراق گورکھپوری

میر کا اچھا شعر

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر　　　کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

غالب

رفتار عمر قطع رہ انتظار ہے　　　اس سال کے حساب کو برق آفتاب سے

مومن:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

شاہ عظیم آبادی: (یاد نہیں)

دستخط　　　ذوالفقار علی بخاری　　　شہر دہلی، مورخہ ۲/ اپریل ۶۱ء

ان سطور میں دو بھائیوں کی کہانی میں مماثلت صرف اس قدر ہے کہ دونوں کا واسطہ ریڈیو سے رہا۔ ہندوستانی ریڈیو کے بانیوں میں سید احمد شاہ بخاری کا نام نامی بس کافی ہے۔ اس طرح پاکستان ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل بھی ذوالفقار علی بخاری رہے اور تمغہ پاکستان سے سرفراز ہوئے۔ موسیقی کے ماہرین میں بھی تھے اور خیال خوشرنگ کے مصنف بھی۔ آپ کی تحریروں میں پختگی اور لطف انگریزی موجود ہے طبعاً خوش مزاج تھے اور بول چال میں بھی سند کا درجہ رکھتے تھے۔ شاعر تھے اور اچھے اشعار کے خوگر۔ غالب شناسوں میں اپنا شمار کرانا پسند کرتے تھے۔ یہ شعر ان کو بہت پسند تھا۔

رفتار عمر قطع رہ انتظار ہے　　　اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

کہتے تھے کہ غالب کو فارسی گو کہا جاتا ہے، میری دانست میں غالب کو رمز شناس ہی کہنا بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ جو شاعر برق آفتاب کا لفظ اردو شاعری میں استعمال کرے اسے اردو والے وہ تو شاعر باکمال ہی کہلانے کا مستحق ہے۔

سید ذوالفقار علی شاہ بخاری کی وفات ۱۲ر جنوری ۱۹۷۵ء کو کراچی میں مرض قلب میں ہوئی تھی ع جہاں سے اٹھے آج زیڈ اے بخاری سے تاریخ وفات مترشح ہوتی ہے۔

آپ کے بڑے بھائی سید احمد شاہ بخاری پطرس نے ۵ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو بہ عمر ۶۰ سال نیویارک میں قضا کیا تھا یعنی ذوالفقار علی شاہ بخاری سے ۱۷ر سال قبل آپ نے رحلت فرمائی تھی۔

اس تحریر سے پشاور کے دونوں بھائیوں کے مختصر حالات اور کوائف سے جہاں مماثلت ملتی ہے وہیں ان کی صلاحیت۔ قابلیت اور علمی استعداد کا علم بھی ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ پطرس کا نام اردو ادب میں وقار۔ تہذیب اور ایک کیف کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ریڈیوں کی صلاحیت یا دیگر مصارف سے قطع نظر، پطرس نے حیات میں بھی نام کمایا اور ممات کے بعد بھی ان کا نام زندہ ہے اور زندہ رہیگا۔

حاشیہ ا: تاریخ کا بیان ہے کہ جناب عیسیٰ کے بارہ حواری تھے۔ (۱) شمعون پطرس ابن یونس (۲) یعقوب بن زندی وغیرہ وغیرہ۔ شمعون کا نام انجیل لوقا میں (Simon Peter) تحریر ہے اس طرح پطرس کا نام شمعون کا لاحقہ ہے۔ اس کا ایک بھائی اندریاس بن یونس بھی تھا جس کی بابت مشہور ہے کہ وہ پیشہ۔ سے ماہی گیر تھا اور شمعون پطرس کا بھائی تھا۔ ان افراد کی بابت مشہور ہے کہ یہ لوگ ۳۷ء میں جناب عیسیٰؑ کی ولادت کے ۳۷ سال بعد وجود میں آئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس اعتبار سے اول بار پطرس کا نام (Peter) شمعون کے ساتھ استعمال میں نظر آتا ہے۔ شمعون کے نام میں ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ جناب یعقوب پیغمبر خدا کی ایک زوجہ لیہ سے تین بیٹے روبین، شمعون اور لاوی ہوئے تھے ان میں دوسرے بیٹے کا نام شمعون تھا۔ مگر یہ جناب عیسیٰؑ کے حواری نہیں تھے بلکہ آل یعقوب میں ان کا شمار ہے۔

دو بھائی (حصہ دوم)

پطرس بخاری کے سلسلے میں تاریخ اردو کے اوراق پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس ذیل میں عرض ہے کہ ۱۹۵۸ء سے میں نے اردو ادب کے شعراء و نثر نگار ادیبوں کے مختصر حالات زندگی ان کے اپنے دست وقلم سے لکھوانے شروع کیے۔ اس کشکول میں ہند و سندھ کے نامور ادبا تقریباً ڈھائی سو کی تعداد میں شریک ہیں۔ ایسے افراد میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی وغیرہ کے نام شریک ہیں۔ چونکہ میرا خانوادہ علمی ذہن وخیال کا ہے۔ لہٰذا وہ جراثیم مجھ میں ہیں۔ صفیر بلگرامی میرے نانا اور احسن مارہروی میرے اجداد میں تھے۔ صفیر کو تلمذ غالب دہلوی اور مرزا دبیر لکھنوی سے تھا۔ احسن مارہروی کو داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

درسیات میں بچوں کی تعلیم کی سمت ہمیشہ متوجہ رہا۔ جامعہ اردو کا قیام ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیزی کے سبب، آگرہ سے علی گڑھ منتقل ہوا تو سید ظہیر الدین علوی (استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی) نے اس کی باگ ڈور سنبھالی اور ملک بھر میں فروغ اردو کا جال پھیلا دیا۔ اس علمی جہاد میں پروفیسر رشید احمد صدیقی ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر عبدالعلیم کے سوا دُور دراز کے اساتذہ وہمدردان اردو نے حصہ لیا۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، مالک رام اور کیفی وتاتریہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ سب اس کی کابینہ کے حصہ دار بنے اور مفید مشوروں سے نواز کر اس کی بقا کے سبب بنے۔

اس تفصیل سے قطع نظر تقسیم ملک سے قبل اور بعد میں اردو کی شناخت کے سلسلے میں نئی پود کو انگریزی ادب کے عمیق مطالع کی سمت مائل کرنا اور پرانی نسل کو یہ سوچنے پر آمادہ کرنا کہ وہ اپنے جدی کارناموں پر تکیہ کیے ہوئے نہ بیٹھے رہیں۔ اس سلسلے میں دلی۔ لاہور، عظیم آباد، حیدرآباد۔ کے ادباء کا طرز فکر کچھ جدا تھا۔ اور لکھنؤ کے ادیبوں کا ایک گروہ جس کا خاص مقصد شہر رنگ وبو تھا یعنی لکھنؤ کے ادباء کی سوچ اودھ پنچ کی عکاسی پر مصر تھی۔ یہ سچ ہے کہ نہ معلوم کتنے اچھے لکھنے والے ادیب اودھ پنچ کے واسطے سے عوام تک پہونچے۔ اسی اخبار کے ذریعے اکبر الہ آبادی جیسی ہستی ملی، جس نے ہنسی ہنسی میں نہ جانے کتنے بیش قیمت نسخے پیش کر دیے۔ اودھ پنچ جو مزاحیہ انداز کا رسالہ تھا، اس کی ابتداء ۱۸۷۵ء میں منشی سجاد حسین نے کی تھی۔ جنہوں نے دراصل سرسید وحالی کے مغربی طرز فکر کے خلاف ایک عام فضا پیدا کرنے

کی طرح ڈالی۔ لیکن ہوا نے رخ بدلا اور مغربی تہذیب اور ادب کے نئے رخ کو نئے سانچے بنانے کی جو راہ پیدا ہوئی وہ بتدریج جوان سے جوان تر ہوتی گئی۔ مغربی علوم کے مطالعہ سے نئی بصیرت اور نئے شعور نے جنم لیا۔ ماضی کی نئی روشوں کے ساتھ حال کی اہمیت نے اپنا رخ بدلا اور مستقبل کے خاکے سے کچھ سے کچھ ہونے لگے۔ اس تناظر میں حالی کی رائے مغرب کی روشنی کی سمت بڑھنے کی تھی۔ اس کے برخلاف اکبر کا مسلک احتیاط قدم اور ماضی سے شغف رکھنے کی سمت تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ دونوں راہیں متوازی انداز میں نہیں چل سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر یہ راہیں نئے مذاق میں، نئی ادبی لطافتوں کا سرچشمہ بن گئیں۔ اور نثر و نظم دونوں نے مقصدیت کو اول ترجیح دینے کی سمت قدم اٹھانے پر ادباء کو مجبور کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ حسرت موہانی کی شاعری میں سیاسی جرأت مندی، اور جگر مرادآبادی نے ظلم و ستم کے خلاف اشارہ کرنا لازمی خیال کیا۔ جگر کا کہنا تھا:

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اس نئی طرز فکر نے جو دراصل غالب دہلوی اور سرسید کی دین تھی۔ اس لیے کہ سرسید محض ایک ادیب، مبلغ نہ تھے بلکہ وہ اعلیٰ سماجی مصلح، ماہر تعلیم اور شناور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کو اندازہ تھا کہ قوم کی بیداری اور ترقی کے واسطے موثر ذریعہ جدید علوم و فنون کے سوا وسائل ترقی سے روشناسی اصل ہے۔

یہی روشناسی آگے چلکر عقابی نگاہ، آتشیں قلم، حوصلہ مند قلب و جگر نہ مطمئن ہونے والا ذہن اور ہر ساعت جوان ہونے والی تمنا نے لے لیا شاعری میں نئے انقلابی تصورات مناظر فطرت کی عکاسی اور حقیقت نگاری در آنے لگی۔ نثر کی دنیا کو سرسید، حالی مولانا محمد حسین آزاد اور دیگر اکابر علم نے نئی جہت سے روشناس کرانے اور جگ بیتی کے بجائے اُسے: آپ بیتی بنانے پر زور دیا۔ پھر یہ جو ترقی پسند شاعری یا ترقی پسند نظریہ سامنے آیا، اس نے آگے چل کر قومی نقطہ نظر کی بنیاد ڈالی۔ غنائی نظمیں، گیت اور عاشقانہ قطعات اسی منظر نامے کے تحت آتے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد طنز و مزاح اور ناقدانہ طرز نگاری کے ذیل میں ہم کو اودھ پنچ کے ذریعہ جہاں اور طنز و مزاح نگار ملے۔ ان میں خان بہادر اکبر حسین اکبر الہ آبادی (جج) کا نام سرفہرست ملتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اکبر نے ایک اہم عہدہ (جج) پر فائز ہونے کے باوصف ایسے اشعار کہے:

کون کہتا ہے کہ علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے کہ حسرت لندن نہ کر پیدا

شاعری کے اس طنزیہ انداز نے نثر نگاروں کو بھی متاثر کیا۔ اور مغربی علوم ان کے دروازے تک آگئے تو اردو کے ادیبوں نے بھی اسے اپنا نام فرض خیال کیا۔ اور جیسے تیسے کر کے اس آہنگ کو اپنی صدا بنا لیا۔ اردو کے طنز نگاروں اور مزاح نگاروں میں سبقت کسے مل سکتی ہے، اس پر ایک محاکمہ کی حاجت ہے مگر یہ سچ ہے کہ اودھ پنچ اور فسانہ آزاد وغیرہ نے ایسے مزاح شناس ادیب پیدا کیے جنہوں نے اپنی تحریروں میں طنز اور مزاح کو شامل کر کے ایک نیا آہنگ اردو دنیا کو بخشا۔ ایسے افراد میں منشی سجاد حسین کے رفقاء کے سوا دورِ جدید میں رشید احمد صدیقی۔ سید احمد شاہ بخاری پطرس جیسے ادیب شریک و سہیم ہیں۔

طنز، ظرافت مزاح کے فرق کو ملحوظ رکھنا شرط لازم ہے۔ ویسے مجھے اعتراف ہے کہ ان الفاظ کے معانی سے ہر فرد بخوبی واقف ہے، پھر بھی لغوی معنی کیا ہیں۔ ان سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ میں لغات کشوری اور فیروز اللغات سے ان الفاظ کے معنی کو قلم بند کر رہا ہوں:

(۱) طنز = ع طعنہ۔ آوازہ تمسخر۔ رمز کے ساتھ بات کرنا ٹھٹھہ۔ ص ۸۸۰ فیروز اللغات

ظرافت = ع خوش طبعی۔ دل لگی مزاق۔ تمسخر۔ ص ۸۸۴ فیروز اللغات

مزاح = ع۔ ہنسی۔ خوش طبعی۔ مذاق ص ۱۲۳۶ فیروز اللغات

(۲) طنز = ع طعنہ۔ آواز کسنا۔ چھیڑنا۔ لغت کشوری، ص ۲۵۸

ظرافت = خوش طبعی۔ دل لگی۔ ٹھٹ۔ لغت کشوری ص ۳۵۹

مزاح = ع ہنسی ٹھٹھہ لغت کشوری، ص ۸۴۵

فیروز اللغات میں مزاح کے اوپر پیش کی علامت نمایاں طور پر درج ہے۔ جبکہ ہم مزاح کو زیر سے بولتے اور سمجھتے ہیں، بہر کیف ان الفاظ کے معانی سے قاری کو استعمال لفظ پر قدرت حاصل ہوگی۔

پرفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک گفتگو میں کہا تھا "بلگرامی صاحب طنز ہو یا ظرافت یہ آسانی سے ہاتھ آنے والے تو ہیں مگر حقیقتاً یہ بہت پر پیچ ہوتے ہیں یوں کہ ہنسنا، دل لگی کرنا کسے نہیں مرغوب ہے مگر سوال یہ ہے کہ کب ہنسنا اور کیسے ہنسا جائے۔ اس کا فیصلہ تو آسان بات نہیں۔

رشید صاحب قبلہ کا میرا ساتھ تقریباً ۳۰-۴۰ سال رہا۔ موصوف کے بہت خطوط میرے نام سے اب بھی محفوظ ہیں۔ طبع شدہ اس کے سوا، ویسے رشید صاحب کے طنز اور مزاح کی بابت قطعیت سے کوئی فیصلہ کرنا آسان بات نہیں۔ اور نہ ہی ان کے مزاح اور طنز کو الگ

دیکھنا، سمجھنا آسان بات ہے۔ وہ ٹھٹھول میں ایسے گوشے پیدا کردیتے تھے کہ قاری کو اس سے استفادہ کرنا مشکل بات ہوجاتی تھی۔ ایسے رمز شناس فرد نے اگر کسی اور ادیب کے سلسلے میں کوئی بات کہی یا لکھی ہے، تو اسے حرف آخر خیال کرنا چاہیے۔

ہاں ایک بات اور طنز کے ذیل میں لغت کے معانی کے سوا رشید صاحب نے اسے برہمی یا بیزاری سے بھی تعبیر کیا ہے۔ ظرافت کے ذیل میں ان کا خیال ہے کہ...... رشتہ نفس واقعہ سے بھی ہے اور فنکار کے ردعمل سے بھی ...... اس تشریح رشید احمد صدیقی اور فیروز اللغات ولغات کشوری کے معانی میں کس قدر تضاد ہے یا مماثلت، اہل علم فیصلہ کرلیں۔ حق یہ ہے کہ کسی اچھے ہنرور کا کمال یہی ہے کہ وہ اصل حال سے خود بھی واقف ہو اور دوسروں کو بھی واقف کرائے۔

پطرس بخاری کے سلسلے میں رشید صاحب کی رائے حرف آخر کے طور پر ان کی حیات میں بھی یہ تھی۔ ظرافت میں پطرس کا ہمسر ان کے ہمعصروں میں کوئی نہیں، بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات عام روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ رشید صاحب نے پطرس بخاری کے باب میں لکھا ہے۔

> ''بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔ ایک صحبت میں مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئیں۔ اردو ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلے کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے کہا، ہندوستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلق ہوکر رہ گئے ہیں''

پطرس کے تقرر کے محکمہ ریڈیو میں رشید صاحب ایک ممبر کی حیثیت سے شریک تھے۔ ویسے بھی دونوں میں یگانگت ومؤانست تھی۔ پروفیسر عبدالعلیم نے ایک نشست میں اظہار خیال کیا کہ اردو ادب میں جس طرح تنقید وغیرہ پر الگ سے اظہار خیال کیا جاتا ہے اور دیگر امور پر بحث کی جاتی ہے طنز ومزاح، جس میں رمقے فرق ہے۔ اس پر مباحثہ نہیں کیا جاتا۔ کیوں؟ رشید صاحب اور سرور صاحب نے کہا۔ ادیب کی شخصیت اس کی فنی اور تکنیکی عمل، اس کا لہجہ اور اس کی سوچ مل جل کر زبان کو نیا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ طنز ہو یا ظرافت یا مزاح اس کے اپنے مدارج ہوتے ہیں۔ اور قلم کار اپنے جملہ اور ادعا کے مطابق جملہ لکھ کر، طنز وظرافت اور مزاح کے الفاظ کو نوک قلم پر لاتا ہے۔ ویسے اس موضوع پر بحث ہونا چاہیے۔

اس روشنی میں پطرس کی ظرافت تفریحی موضوعات اور عام روایتی کرداروں بلکہ لفظی ہیر پھیر سے قطعاً جدا اور بے نیاز نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں انفرادیت کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ پطرس نے انگریزی ادب کے اصل خدوخال سے، اپنے قلم کو روبرو رکھا اور جس ریاضت بلکہ بصیرت سے انہوں نے انگریزی ادب کے خاکوں سے اردو کے دامن کو تہداری بخشی وہ بہت کم افراد کو نصیب ہوئی۔ انہوں نے اردو کے مقالوں، مضامین میں انگریزی کے خیال، اس کے لب ولہجہ اور اس کی فضا کو اس انداز سے پیش کیا جس سے اردو شناس اور اس کے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پطرس بخاری نے باقاعدہ نقد اور تنقید پر الگ سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ پھر بھی ان کے مضامین، کردار، اشخاص، ماحول فضا اور سماجیات کے ذکر میں جو طرز تنقید ملتی ہے وہ بہتوں کو نصیب نہ ہوسکی۔ تنقید میں جملہ اور نگارشات کو اگر دیکھا جائے تو ان کا ہر لفظ مستعملہ وسیع تر تنقید اور خاص ادبی مفہوم سے مملو ملتا ہے۔

پطرس نے صرف گیارہ مضامین اردو میں تحریر کیے ہیں۔ اس میں ہاسٹل میں پڑھنا ہے لے کر مرحوم کی یاد میں اور لاہور کا جغرافیہ...... اگر سب کو گہرے مطالعہ کی نظر سے پڑھا جائے اور فیصلے کو کہا جائے تو نمبر ا یا ۲ ہم کسی ایک کو نہیں دے سکتے ہیں یوں کہ ہر مضمون کی نوعیت جدا اور طرز کلام بلکہ تخاطب جدا ہے۔ پھر بھی اپنی کوتاہ بینی کا اعتراف کرتے ہوئے اظہار کرتے ہوئے، اظہار خیال کرونگا کہ میر پور کا پیر کے بعد انجام بخیر اپنی نوع کے الگ مضمون ہیں۔ یوں کہ انجام بخیر میں خود پطرس ایک کردار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں اور مکالمہ کے سوا تہذیبی، دینی، اخلاقی اور اصلاحی مکالمے پیش کر کے نئی دنیا، نئے خیالات اور جدید فکر سے روشناسی بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ پطرس اپنی طرز تحریر، خیالات، فکر انگیزی سے جدا حیثیت کے مالک تھے۔ ان کا شعور انگریزی ادب شناسی تھا مگر ذہن اور دل ہندوستانی ادب کا دلدادہ تھا زبان سادہ مگر مدلل، رواں، دلچسپ اور پر اثر عبارت سلاست اور روانی کے ساتھ معانی کی صحت، لہجہ کی متانت اور علمی وادبی نکات، سماجی امور کو سلجھے اور نکھرے انداز میں بیان کر کے، قاری کو مطمئن کرنا سید احمد شاہ بخاری پطرس کا کمال تھا۔ اس طرح ہم پطرس کو اردو اور جدید طنز ومزاح کا موجد اور بانی کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ہم پطرس کو بقول جلیل مانک پوری۔

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

علی گڑھ گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے یہاں علم کی شمع جلتی ہے اور اس سے فیضیاب ہونے کے لیے ایک دنیا سمٹ آتی ہے۔ علم کی پیاس دوسرے اداروں میں بھی بجھائی جاتی ہے مگر جس طرح علی گڑھ کے اس گلشن میں سیرابی ہوتی ہے وہ کسی اور ادارے کے بس کی بات نہیں۔ یہاں کے اساتذہ اپنے ماحول اور اپنے شاگردوں کی مشکلات سے آگاہ ہونا اور اُن کو رفع کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس ادارے کے ہر شعبے کے صدر کی اپنی جداگانہ شخصیت ہوتی ہے۔ وہ صدر شعبہ بھی ہے اور جلیس و مددگار بھی، ایسی ہی شخصیتوں میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی ذات ہے۔

آپ اگر کبھی ان سے ملے ہیں تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ایک نہایت ہی سیدھا، سادہ اور خاموش، متین شخص ہے جو قد کے اعتبار سے مختصر مگر جامہ زیبی اور قامت کے لحاظ سے نہایت موزوں ہے۔ بیشتر چست پاجامہ اور شیروانی میں دکھائی دیں گے۔ چہرے پر ایک ہلکی سی خوش گوار مسکراہٹ جیسے نسیم صبح نے چمن میں پھولوں سے بازی کرنے کی دل سے ٹھان لی ہو۔ چال میں متانت اور ارادے میں استقلال، کام کی نوعیت سے شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور صدر، ذات کے اعتبار سے اردو کے خادم ''ذات سے میرا مدعا نام سے ہے'' یہ حسن اتفاق ہے کہ اسلوب صاحب انگریزی کے طالب علم بلکہ اسکالر ہونے کے باوصف اردو میں اس قدر مقبول و معروف ہیں، جس قدر انگریزی میں گمنام ہوں گے یا مشہور ہوں گے۔ اسلوب صاحب کی زبان ہلکی پھلکی اور انداز نگارش دل آویز ہے۔ ان کا استدلالی طریقہ اس قدر اچھوتا ہے اور دلکش ہے کہ قاری ان کے ادائے بیان سے محسور ہو کر اور ان کی باتوں میں گھر کر پھر دوسرے جانب متوجہ نہیں ہو سکے گا۔

اسلوب صاحب نے اردو تنقید پر جس بصیرت افروز طریقے سے نظر ڈالی ہے اور اردو کے بیشتر شعراء و ادباء پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سے جہاں ان کی علمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہیں ان کی قدرت زبان اور معلومات کی وسعت اور مطالعہ کی گہرائی کا علم بھی ہوتا ہے۔ اردو میں انگریزی ادب سے روشناس ہونے والوں میں ایک خاصا فرق یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ

اردو میں انگریزی ادب سے متاثر شخص ''احساس کمتری'' کا شکار ہوگا کیوں کہ اس کے سامنے جو ادب ہے یا اس نے جس ادب کا مطالعہ کیا ہے اس کی سائنسی اور تکنیکی حالت اردو ادب کی تکنیک سے قطعاً مختلف ہے۔ انگریزی ادب آج جس عروجی حالت سے گزر رہا ہے اس سے ہمارا ادب کہاں مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس لیے لازمی ہے کہ انگریزی ادب سے واقف شخص اس ادب کے موازنے سے اپنے ادب اور ادیب کی علمی صلاحیت کا مقابلہ کرے گا اور اپنے ادب کا درجہ ظاہر ہے کہ کم تر پانے کی وجہ سے اس سے انصاف برتتے ہوئے حقارت کی نظر سے دیکھے گا جیسے کہ ہمارے محترم ادیب اور ناقد کلیم الدین صاحب کا نظریہ ادب ہے۔ اس کے برخلاف فراق گورکھ پوری نے انگریزی ادب کی مسلمہ ثبوت شخصیت ہونے کے وصف سے کبھی بھی اردو بیزاری سے کام نہیں لیا۔ تنقید کرنا اور اس کو معیار پر پرکھنا علمی کام اور ضرورت کی اہمیت کا احساس ہے مگر ادب بیزاری تو اس ادب سے بگاڑ کی بات ہے۔ اسلوب صاحب نے یہی کام اب تک نہیں کیا ہے۔

ابھی حال میں ان کا ایک مجموعہ مضامین ''ادب وتنقید'' کے نام سے شائع ہوا ہے اس مجموعہ مضامین میں انہوں نے جن دلائل وافکار سے بحث کی ہے۔ اس سے ہم اختلاف کرسکتے ہیں مگر انکار نہیں۔ وہ جس ادیب پر تنقید کرتے ہیں، اس سے انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ قصور تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جو بنیاد قائم کی ہے وہ غلط ہو، مگر ان پر یہ الزام نہیں آسکتا کہ انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں جانب داری سے کام لیا یا محض اپنی بات منوانے کے لیے انگریزی کے ادیبوں کے ''تراشے'' جمع کرکے اپنے ادیبوں کی ''سبکی'' کا کام انجام دیا۔ موازنہ، مقابلہ اور مجادلہ بہت اچھی بات ہے لیکن کسی ادب کا مطالعہ اور مقابلہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس ادیب پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس کی تاریخ اور تہذیب کو سامنے رکھا جائے کیونکہ کوئی بھی ادیب فنکار اس وقت نہیں مکمل ہوسکتا جب تک اس کو اس کے ادب کے دائرے میں رکھ کر نہ دیکھیں۔

آج غالب پر ہم محض الزام تراشی، بہتان تراشی یا ان کی قدروں کی بیجا تعریف کرکے ''عظیم شاعر'' ثابت کرنے کی کوشش کریں تو یہ کام نہ زبان کے ساتھ مناسب ہوگا نہ اس شاعر کے ساتھ، یعنی نہ فن کے لیے مناسب ہے نہ ہی فنکار کے لیے اس بات کو مدنظر رکھ کر ادب اور ادیب کا موازنہ کرنا چاہیے۔

اسلوب احمد انصاری کے لیے یہی بات کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے سچے دل سے جو بات

ہمارے تہذیبی طریقے کو سامنے رکھ کر اور تمثیلی باتوں کو مدنظر رکھ کر جیسا مناسب حال سمجھا بیان کر دیا۔ اس اختلاف یا اتفاق سے، ہم کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اسلوب صاحب پر حرف نہیں آ سکتا۔

میں ذاتی طور پر ان کی علمیت سے اس حد تک واقف نہیں ہوں، اس اعتراف کے باوجود ان کی دوسری صفاتی باتوں سے گو نہ واقف ہوں۔ مثلاً وہ اپنے طالب علموں اسٹاف اور ملازمین سے کیسا رویہ رکھتے تھے اسی طرح ان کی نجی زندگی سے متعلق میں کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ مگر جب بھی موقع ملا ہے ان کو گھریلو زندگی میں نہایت ہی سادہ پایا ہے۔ ایک مختصر سا کمرہ جس میں ایک جانب چھوٹی سی میز بچھی ہے۔ ایک کرسی اس کے مقابلے پڑی ہے۔ دوسری آرام دہ کرسی، چارپائی کے پاس پڑی ہے۔ کتابیں ادھر ادھر بکھری حالت میں قلم پنسل اور کاغذ ایک دوسرے سے پیوست۔ بعض کتابوں پر گرد بھی ملیگی۔ مگر یہ اس لیے کہ ادیب کے ذہن کے خانے لاتعداد ہوتے ہیں۔ وہ جہاں افکار و خیالات کو ان خانوں میں محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح ان یادداشتوں کو بھی انہیں خانوں کی زینت بنائے رکھتا ہے، جہاں اس نے کہیں سے آئی ہوئی کتاب رسالہ، پرچہ پرزہ اور تراشا رکھا ہے۔ اسی لیے مناسب یہی ہے کہ کوئی دوسری شخصیت ان ''کھلونوں'' کو ادھر سے ادھر نہ کرے۔ اس کے برخلاف ان کا ڈرائنگ روم کتابوں کی الماریوں سے سجا ہوا ہے۔ سامان بھی نفاست کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کو کبھی اس ڈرائنگ روم میں جانے کا موقع نہ ملا ہو۔ کیونکہ اسلوب انصاری صاحب کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ اپنی سادگی کو دوسری جانب سے دیکھنے کا کسی کو موقع ہی نہیں دیتے۔ جس طرح وہ خود مسکراتے ہوئے آپ کو دکھائی دیں گے۔ اسی طرح وہ ''عالم خفگی'' میں نظر آئیں گے۔ بس لہجہ کا فرق ان دونوں عالموں کے پہچان کی علامت ہوگی۔

اسلوب صاحب کے یہاں انسانی ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پوشیدہ ہے۔ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو ایک دوسری یونیورسٹی کا ستم زدہ تھا۔ اس کو اس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر نے زندگی سے موت کی طرف منتقل کرنے کے سارے سامان مہیا کر دیے تھے۔ اسلوب صاحب کو معلوم ہوا۔ اس کی خاطر فروری کی ایک سرد رات میں سفر کیا۔ اپنے پاس سے سارا سفر کا خرچ برداشت کیا۔ میلوں دور گئے اور اس کے لیے روزی کا سامان فراہم کرنے کی تدبیر کی یہاں تک کہ اسکوٹر کا صرفہ بھی خود برداشت کیا۔ کھانا بھی اپنے ہی جیب خاص سے کھایا۔ حتی کہ ایک پیالی چائے تک اس فرد کے صرفہ سے نہیں پی۔ کیوں؟ محض انسانی ہمدردی اور بے

روزگار کی امداد کا تصور۔

کیا یہ واقعہ انسانی ہمدردی کا یونیورسٹی کا کوئی ''پروفیسر''، ''لیکچرر'' یا ''ریڈر''، ایسی مثال پیش کرسکتا ہے۔ پھر تعلقات کی بنیاد پر انہوں نے اگر ایسا کیا ہوتا۔ تو میں اس کو ''انسانی ہمدردی'' کی مثال نہ قرار دیتا بلکہ ''ذاتی'' خانے میں ڈال کر نظر انداز کر دیتا۔ لیکن میں شہادت دیتا ہوں کہ انہوں نے اس سے محض انسانی ہمدردی کی خاطر یہ سلوک کیا۔ کسی رابطہ خاص کی وجہ سے نہیں۔ خدا ترسی اور سلوک اسی کا نام ہے۔

اسلوب صاحب کی جو بات دل سے بے حد مرغوب و پسند ہو سکتی ہے وہ ان کی علمیت اور واقفیت کے باوصف بے انتہا سادگی ہے۔ جس کا اظہار اوپر کر چکا ہوں۔ اس طرح ان کی شخصیت جاذب نظر ہے جس میں بلا کا تنگائے غزل میں یقیناً وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن فی الحال اس کی وضاحت کا موقع نہیں۔

پھر بھی جوادب کا حسن ان کے پروقار انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ بقول غالب:

وہی ایک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

آپ کہہ سکتے ہیں وہ زیادہ بلکہ بہت زیادہ قدامت پرست فرسودہ رسم ورواج اور رنگ ونسل کے ماننے والے معلوم ہوں گے مگر یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اسلوب صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں اپنے کالج میں ''ٹاپ'' کیا تھا۔ اس برتری اور تفوق کے باوجود انہوں نے سائنس کے بجائے آرٹس کی لائن اختیار کی۔ اسٹوڈینٹس یونین کے جلسوں میں ''خطاب'' کر کے ''میڈل'' بھی حاصل کیے۔ ایسے ماحول میں ان کی زندگی ابھری اور پھر وہ اپنے ادارے کے صدر شعبہ انگریزی بھی ہوئے۔ اور نقد و تبصرہ کے بانی بھی۔ ان کو ادبی اعزازات سے نوازا بھی گیا اور ان کی آفاقی صفت کا اعتراف بھی کیا گیا۔ اب وہ اپنی بصارت سے کسی حد تک معذوری کے سبب جلسوں اور جلوسوں سے ماوراہیں۔ مگر ان کی شخصیت کا اعتراف ہر شخص کو ہے اور رہے گا۔

اسلوب صاحب صبح خیزی کے عادی ہی نہیں، صبح کی سیر اور گل گشت کے عادی بھی تھے، خاموش متین انداز سے نقوی پارک صبح دم جانا اور مقررہ اوقات کے مطابق واپس آنا موصوف کا معمول تھا۔ کبھی بھولے بھٹکے، اندھیرے اجالے میں ملاقات ہو جاتی تو سلام علیک ہو جاتی، اس کے سوا قیام کبھی نہیں ہوا۔ دراصل مجھے ان کی فطرت معلوم تھی، سرراہ بات کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس کا احترام لازم تھا جو میں کرتا تھا۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں......

(عنوان مطابق شہریار)

اردو ادب کے مایہ ناز ادیب، منکسر، طرزنو کے مالک، ترقی پسند تحریک کے نباض اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد، یونیورسٹی گزٹ کے مدیر، خوش خلق، خوش اطوار، نیز سب کے دل کے طرح دار و با خلوص پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی (پیدائش ۱۹۲۷ء) سے یونیورسٹی دنیا کے افراد میں سے موصوف سے بھی یگانگت اور اخلاص بھرے تعلقات تھے۔ مجھے یاد ہے، جب میرا تقرر پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا، نئی دہلی میں ہوا اور چند دنوں کے بعد جگن ناتھ آزاد صاحب (انفارمیشن افیسر) سے خلیل صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے میرا ذکر کیا کہ "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک صاحب کا تقرر ہماری یونٹ میں ہو گیا ہے"۔ میرا نام سنتے ہی خلیل صاحب نے کہا ان کی تقرری سے آپ اور آپ کی یونٹ کو بہت فائدہ ہوگا۔ فائدہ ہو یا نہ ہو، اس سے قطع نظر آزاد صاحب نے راقم کا احترام و خیال بے حد رکھا۔ یہ محل کسی تفصیل یا واقع کے بیان کا نہیں، ورنہ تحریری طور پر ثبوت موجود ہیں کہ آزاد صاحب نے بہت سے مسائل پر مجھ سے وابستگی رکھی۔

اس وقت مجھے عرض کرنا مقصود ہے کہ میرے تعلقات خلیل صاحب سے مربیانہ تھے۔ وہ میری قدر دانی فرماتے تھے اور جو رسائل ان کو یونیورسٹی گزٹ کے تبادلے میں آیا کرتے تھے، ان کی بابت ان کا اعلان تھا کہ بلا عذر آپ لے لیا کریں۔ لہٰذا میرا آنا جانا، ملنا جلنا بے حد تھا۔ ان ہی ملاقاتوں میں دو ایک بار ایک نوجوان کو دیکھا کہ مؤدبانہ انداز میں خلیل صاحب سے محو گفتگو ہیں۔ بعد میں خلیل صاحب نے میرا تعارف کرایا کہ یہ یونیورسٹی کے طالب علم کنور اخلاق محمد خاں ہیں۔ ذہین اور طبع نازک کے فرد ہیں۔ مجھے دوسرے جملے پر ہنسی آئی تو خلیل صاحب نے کہا، بلگرامی صاحب دراصل پٹھان اور وہ بھی ماورالنہری بہت نازک مزاج ہوتا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ بلند شہر کے علاقے کی نسبت سے خلیل حاصب نے وہ لفظ

استعمال کیا تھا۔ پھر تو اخلاق محمد خاں سے ملنا جلنا ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ بے تکلف ہو گئے اور پھر شعبۂ اردو کے اساتذہ میں شریک ہو گئے۔ مگر تصنع، ظاہر داری، بناوٹ سے پاک ذہن و خیال کے مالک رہے۔ شاعری میں ابتدائی اصلاح تو غالباً خلیل صاحب سے ہی لی ہو گی مگر خود کہتے تھے، قدیم اساتذہ کے کلام کے مطالعہ اور عہد حاضر کے اہل علم کی صحبت نے میرے ذوق کو بہت مہمیز دی ہے۔ جذبی صاحب سے وہ بے تکلف تو نہ تھے مگر ان کی صحبت سے فیض بہت پایا۔ خیر بہت بعد میں شہریار کے نام سے جانے جانے لگے۔ ویسے کنور اخلاق محمد خاں کے کلام میں ابتدا سے ہی سادگی، شستگی اور لطافت کے عنصر پنہاں رہے۔ لطف کی بات یہ کہ ان کے یہاں بے لوث جذبہ بہت تھا اور سچی بات یہ ہے کہ وہ نام ہی کے اخلاق نہ تھے بلکہ عملاً با اخلاق تھے۔ جب وہ شعبۂ اردو کے رسالے کے سربراہ ہوئے اور ناموران علی گڑھ کے مدیر و مرتب قرار پائے تو یونیورسٹی کے ایک استاد اور محترم ذات مولانا سید علی نقی صاحب نقوی (صدر و ڈین تھیالوجی ڈپارٹمنٹ) کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش کی، میں نے وعدہ کر لیا مگر دفتری مصروفیت کے سبب ایفا وعدہ نہ کر پا رہا تھا۔ اس ذیل میں ملاقات کر کے تاکید بھی کرتے رہے اور تحریری طور پر بھی تقاضے فرمائے۔ دو ایک خط اس ضمن کے اب بھی موجود ملیں گے۔ یہاں تک کہ مجھے مضمون لکھ کر پیش کرنا پڑا جسے اکابرین علم و دانش نے پسند کیا۔

ابھی دو ایک سال قبل اردو کے ممتاز شاعر علی گڑھ آئے تھے اور ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ میری ان کی ملاقات اب سے دس بارہ سال قبل لاہور میں ہوئی تھی۔ پھر دو ایک بار دہلی کے جلسوں میں بھی ملنا ہوا۔ علی گڑھ میں مذکورہ سال میں جب احمد فراز صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ شہریار صاحب ان کے خدمت گزاروں میں جیسے کام انجام دے رہے ہیں۔ مجھے دونوں اہم شاعروں کی یہ بے تکلفی بے حد پسند آئی اور ہمت کر کے احمد فراز صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ غالب کو مومن خاں سے جیسی الفت، محبت اور یگانگت تھی، ویسے ہی مجھے آپ دونوں کے درمیان لگاؤ محسوس ہو رہا ہے۔ مسکرا کر احمد فراز صاحب نے کہا، بلگرامی صاحب ہم دونوں، ہم خیال اور ہم فکر ہیں۔ شہریار کو ہم نے اپنے سے الگ نہ جانا۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان سے یا کہیں سے بھی جب ہندوستان آتا ہوں تو پہلے آمد کی خبر ان کو دیتا ہوں اور علی گڑھ کے قیام میں یہ جس شفقت اور خلوص بلکہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ کسی اور سے نہیں ملتا۔ یہی دیکھیے کہ جام و سبو نہیں، چائے کے کپ پھیلے تھے۔ میرے کپڑے ادھر ادھر پڑے ہیں۔ ہوٹل کا بیرا آتا تو وہ اس کام کو کیا انجام دیتا، نہیں؟ مگر ہم آپ

گفتگو میں مصروف ہیں، شہریار صاحب نے آتے ہی سب سمیٹ لیا۔ اس پر شہریار صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بلگرامی صاحب مجھے اندازہ ہے کہ فراز صاحب کو ابھی ہوٹل چھوڑنا ہے اور دلی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اگر میں سامان کو یکجا نہ کر دیتا تو شاید شام تک بھی روانگی نہ ہو پاتی۔ شہریار صاحب کی سادگی ان کی اصل تھی اور خوبی بھی۔

میں شہریار صاحب کی مدح خوانی، شعر بانی یا امتیازات یا فنگی کا ذکر نہ کروں گا۔ نہ ہی ان کی تخلیقات پر یاوہ گوئی کرنے کا ارادہ ہے۔ وہ بولتے ہوئے شجر تھے، ان کی شاعری منفرد تھی یا نہیں، اس کا محاسبہ کون کرے؟ مگر یہ سچ ہے کہ شہریار ایک مثالی شاعر تھے۔ بین الاقوامی سطح پر الگ شناخت کے مالک، وہ استاد بھی تھے اور شاعر سہل ممتنع کے سوا اعلیٰ افکار و خیال اور اخلاص و اخلاق کا پیکر بھی، شرافت نفس ان کا طرۂ امتیاز تھا، لب و لہجہ منفرد، متین اور روایت جدید کے پیکر۔ اب یہ کہ شہریار کی جدائی سے ایک عہد ساز فرد کی کمی واقع ہوگئی یا اردو شاعری کا نقصان ہو گیا، جس کی تلافی ممکن نہیں یہ اور اس طرح کی باتیں تسلی اور تشفی کہلا سکتی ہیں، مگر کارواں چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے در و دیوار ایک اخلاقی شاعر اور غیر معمولی تخلیق فکری، نظریاتی شاعر سے یہ شہر خالی ہو گیا۔ ان کی شاعری درونِ ذات روایت اور جدیدیت کی ایک مثال تھی۔ خود مشاہدگی، خود اعتمادی اور فکری ابلاغ نے ان کو آج سنگِ میل کی حیثیت عطا کر رکھی تھی۔

شہریار صاحب کی زندگی کے دو رُخ ہیں۔ ایک ان کی ذاتی زندگی، جس پر طبع آزمائی کرنا امر فضول ہے۔ دوسری ان کی علمی، افقی اور تدریسی حیات۔ لیکن باخبر حضرات واقف ہیں کہ شہریار کی ایک اور زندگی بھی تھی، جس کی مثل کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اتنے بڑے شاعر اور بطلِ جلیل ہونے کے باوجود سادہ مزاج شخص تھے۔ لباس کے اعتبار سے بھی اور مزاج کے لحاظ سے بھی۔ ان کی پیدائش تو ۱۹۳۶ء کی تھی۔ انھوں نے اپنے مختصر ترین حالات، میری کشکول میں اپنے دست و قلم سے جنوری ۱۹۶۹ء میں تحریر کیے تھے اور اعتراف کیا ہے کہ وہ میر تقی میر وغیرہ کے سوا، سب سے زیادہ غالب اور خلیل الرحمن اعظمی کے قریب ہیں اور زیادہ اشعار ان ہی کے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے شاعر دور جدید کے ضمن میں خلیل الرحمن صاحب کا نام بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس نادر تحریر میں شہریار نے اپنے دو شعر نمونہ کلام کے بطور تحریر کیے ہیں۔ یہ اشعار بیک لمحہ خیال میں آئے اور تحریر کیے گئے۔

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

مگر دوسرا شعر جو ۱۹۶۹ء میں تحریر کیا گیا تھا وہ آج ۲۰۱۳ء کو یعنی ۴۴ سال بعد سے متعلق ہے۔ جو سوا گواری اور حقیقت بیانی پر دال ہے۔

ان کے پیچھے نہ چلو، ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

افسوس کہ حیاتی سایہ، اب سانحاتی بن گیا، اور شہریار کی یاد کے سائے کے سوا اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔

اب مجھ سے شہریار صاحب کے متعلق بروقت کچھ تحریر کرنا امکان سے باہر ہو رہا ہے۔ کیا لکھوں؟ اور کہاں تک لکھوں؟ بہر حال، آپ سب ان کی مختصر ترین سوانحی تحریری ملاحظہ کریں اور شاعر دورِ جدید کی انقلابیت، جدت طرازی، محاکماتی فکر کی داد تا عمر دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

دستی سوانحی خاکہ شہریار:

نام	:	کنور اخلاق محمد خاں شہریار
ولدیت	:	کنور ابو محمد خاں مرحوم
پیدائش	:	۱۶ر جون ۱۹۳۶ء
سکونت	:	علی گڑھ
مولد	:	آنولہ ضلع، بریلی
وطن	:	چونڈھیرہ، ضلع بلند شہر
تعلیم مع سنہ	:	۱۹۵۴ء ہائی اسکول، سیکنڈ ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
		۱۹۵۶ء بی. اے. سیکنڈ ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
		۱۹۶۱ء ایم. اے. فرسٹ ڈویژن، فرسٹ پوزیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۹۶۱ء سے ''اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' کے زیر عنوان پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی. ایچ. ڈی. کے لیے مقالہ تیار کر رہا ہوں۔ جواب تکمیل ہو چکا ہے۔

دیگر کوائف	:	(ملازمت، تصانیف، پہلی غزل، افسانہ مضمون، مجموعہ کلام)۔
سکریٹری انجمن اردوئے معلیٰ	:	۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۰ء

ایڈیٹر علی گڑھ میگزین: ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۴ء
لٹریری اسسٹنٹ : انجمن ترقی اردو ہند، مئی ۱۹۶۱ء تا جنوری ۱۹۶۴ء
ریسرچ فیلوشپ : ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۴ء
لٹریری اسسٹنٹ : یکم مارچ ۱۹۶۵ء تا ۲۰/اکتوبر ۱۹۶۶ء
لکچرر شعبۂ اردو : ۲۰/اکتوبر ۱۹۶۶ء تا حال

سب سے پہلی غزل مشرب، کراچی میں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۵۷ء سے باقاعدگی کے ساتھ نظمیں لکھنا شروع کیں اور ایک مدت غزل نہیں لکھی۔

۱۹۶۵ء میں پہلا مجموعہ: اسم اعظم، شائع ہوا۔

دوسرا مجموعہ: ساتواں در، عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
ان کے پیچھے نہ چلو، ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

آپ اردو کے کس شاعر سے متاثر ہیں اور کیوں؟

میں نے یوں تو کسی خاص کو اپنا ائیڈیل نہیں بنایا، لیکن پھر بھی میں میرؔ اور اخترؔ الایمان کی شاعری کو بطور خاص پڑھتا رہا ہوں۔ ویسے مجھے سب سے زیادہ اشعار غالب اور خلیل الرحمن اعظمی کے یاد ہیں:

آپ کی نظر میں بہتر شعر:

میر : منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

غالب : شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

مومن : اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ذوق : اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مصحفی : چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

شاد عظیم آبادی : تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

بہترین طنز نگار : رشید احمد صدیقی

بہترین مزاح نگار : مشتاق احمد یوسفی

بہترین نقاد : پروفیسر آل احمد سرور

بہترین افسانہ نگار : سعادت حسن منٹو

بہترین ناول نگار : قرۃ العین حیدر

شاعر دور جدید : اختر الایمان، فیض، مخدوم، خلیل الرحمٰن اعظمی،

دستخط : شہریار

شہر : علی گڑھ

تاریخ : ۲۶ر جنوری ۱۹۶۹ء

پس نوشت : افسوس کہ شہریار صاحب نے ۱۳ر فروری ۲۰۱۲ء کو قضا کیا اور ۱۴ر فروری ۲۰۱۲ء کو مسلم یونیوسٹی کا قبرستان آخری آرام گاہ ہوئی۔

ضروری نوٹ:- پرفیسر کنور اخلاق محمد خاں صاحب شہریار کی مختصر سوانح حیات، ان کے اپنے دست وقلم کی بطور رکارڈ رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کے رکارڈ میں محفوظ ہے۔

☆☆☆

طوطی غفران مآب

ہماری بساط اتنی نہیں کہ سید العلماء جیسے فقیہ اور عالم دین پر قلم اٹھا سکیں یا ان کے علم، دانائی وفراست، اور تدبر کا احاطہ کر سکیں اور نہ یہ اس وقت وہ الفاظ خانہ ذہن میں آ سکیں گے جن کو ہم صفحہ کاغذ پر منتقل کر سکیں۔ سوا اس امر کے کسی عالم کی موت تنہا اس کی موت نہیں ہوتی بلکہ ایک عالم کی موت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جو صفات مولانا مرحوم میں تھیں ان کے ادراک کا اہم میں شعور نہیں مگر یہ سچ ہے کہ مولانا کے اٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے اس کے پر ہو جانے کے واسطے ایک مدت درکار ہوگی۔ اور اگر وہ ساعت آ بھی جائے تو سوال یہ ہے کہ ان جیسا صاحب کمال نصیب ہو سکے گا؟

علی گڑھ سے سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب مرحوم و مغفور (آہ کل تک جن کے لیے ہم مدظلہ العالی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ آج مغفور اور طاب ثراہ کا کلمہ استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ قضا و قدر اور مشیت الٰہی اسی کا نام ہے) کا تعلق کم و بیش پچاس سال سے زائد کا ہے۔ ان کے معتقدین کا حلقہ ہر ملت و مسلک کے درمیان طرز واحد کے طور تھا۔ ان کے طرز خطابت کا ثانی نہیں اور طرز ادا معلومات، مشاہدہ ان کے علمی درجات کی بلندی، ان کے انداز فکر اور ان کی بصیرت سے زیادہ اُن کی سادگی اور شخصی احترام کی حد بندیاں ایسی تھی۔ جو خواص و عام میں ہر دل عزیزی کا موجب تھیں۔ ایسی ذوات میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف سے لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین تک کے قلوب، صدق دل سے ان کی علمی وقار اور وجاہت کے قائل تھے۔

مولانا موصوف کی ذات واحد کلام کے طور پر کہی جا سکتی ہے جن کو مسلم یونیورسٹی کے دانشوروں نے ایک خیال ہو کر لکھنؤ سے علی گڑھ لانے کی سعی کی۔ اگر چہ یہ سچ ہے کہ لکھنؤ سے ان کو جو عشق تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ اس دیار سے علیحدہ نہ ہوں (اگر چہ وہاں کے ارباب کشاد نے بعد میں ان کا گھر جلا دیا نایاب اور قلمی مخطوطات کا علمی سرمایہ خاک کر دیا پھر بھی وہ اس کی ہمہ گیری کے قائل تھے) مگر ارباب علی گڑھ نے اتنی التجائیں کیں کہ وہ اپنے فیصلہ پر

قائم نہ رہ سکے اور ہماری رہبری کے لیے یہاں تشریف لے آئے۔ پھر بظاہر (ہاں بظاہر ہی) یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مکان کی تعمیر کرالی۔ اس کا نام 'بیت المعمور' رکھا جو مسکن نقوی سے بھی مشہور ہوا۔ اور مستقل طور پر قیام فرمانے لگے مگر موعودہ جب آیا تو آپ نے اسی دیار کی راہ لی جہاں ان کا دور تعلیم علمی پھر تعلیم و تعلم گزرا تھا اور بقول پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی:

بس مرے پاؤں سے لپٹی رہی آلام کی گرد

دل کا آئینہ کچھ ایسا تھا کہ دھندلا نہ ہوا

مولانا کے علی گڑھ کی زندگی کے کئی دور ہیں واردات قلبی اور تحقیق عمل کے بہت سے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ ان کی مدت ملازمت کے خاتمہ کا ہے۔ جس سے کوئی اور شخص واقفیت نہیں۔ مگر اس واقعہ سے اُن کے دینی نظریات اور اصابت رائے۔ اسلامی قانونی نکات اور اسلام کی پاکیزہ روح بلکہ روایت کا دستوری ہم بھی ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے قاعدے کے مطابق مولانا سید علی نقی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی مدت ملازمت کے اختتام کی تاریخ جب قریب آگئی تو پروفیسر مہدی حسن (سابق شعبہ اناٹمی، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، اے ایم یو) کی معرفت وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم مرحوم (مولانا اور علیم صاحب ہم جماعت تھے اور عالم کا امتحان ایک ساتھ الہ آباد بورڈ سے دیا تھا۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی عملے میں ہم شریک تھے۔ دونوں کے آپسی روابطہ بھی خاصے وسیع تھے) کے نام سے ایک رقعہ لکھا کہ میری ملازمت ۳۰ راپریل کو تمام ہو رہی ہے مگر سید علی محمد سلمہ کے ایم اے کا امتحان ۳۰ رمئی تک تمام ہوگا۔ اس لیے اس مدت تک قیام مکان کی اجازت دی جائے۔ ورنہ ایک ہفتہ کے اندر مکان خالی کردوں گا۔ وائس چانسلر کی ڈاک میں یہ رقعہ رکھ دیا گیا دوسری صبح مجھ سے وائس چانسلر نے کہا کہ۔ مولانا کو میرا اسلام کہیے اور یہ کہ وہ جب تک مناسب خیال کریں قیام فرما سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اسٹیٹ آفیسر کو ہدایت کی اور یہ تحریر میرے حوالہ کردی۔ شام کو میں مولانا سے ملا اور وائس چانسلر کا ارشاد ان کے گوش گذار کرتے ہوئے عرض کیا۔ قاعدے کے مطابق ۴ رماہ تک اس مکان (۸-شبلی روڈ) میں قیام کر سکتے ہیں۔ مولانا نے خاموش تبسم سے جواب دیا۔ ہاں لیکن میری نماز ہوتی؟ اس مسکراہٹ اور دینی جواب نے مجھے لاجواب کردیا۔

ان ہی پروفیسر عبدالعلیم کا دور وائس چانسلری ہے۔ بمبئی سے ایک صاحب نے علیم صاحب کو لکھا کہ انہوں نے کلام پاک کی نئے سرے سے تدوین کی ہے اور قبل و مابعد کی

سورتوں، آیات کو تحقیق ورجال کی سند سے یکجا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کلام اللہ کی موجودہ ترتیب اس کی مستحق ہے اور یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس مقالہ کی خوانگی ایک بار اہل علم کے سامنے ہوجائے۔ وائس چانسلر خود علم قرآن اور رجال سے کماحقہ واقف تھے۔ موصوف آئے اور انہوں نے اپنا مقالہ پڑھا۔ جس پر بحث ہوئی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ناقل تھے کہ انہوں نے اپنے اعتراضات کیے بعض حضرات نے ان کے نظریات سے اتفاق رائے بھی کیا مگر مولانا سید علی نقی صاحب کو بہ اصرار گزارش کر کے خطاب کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

''حضرات! میں انگریزی سے نابلد ہوں مگر پڑوس سے دریافت حال کے بعد جو کچھ معلوم کرسکا۔ اس کا ماحصل شاید یہی ہے کہ مقالہ نگار نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ترتیب قرآن کا کام ازسرنو چاہیے مگر میں ملت جعفریہ کی طرف سے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ موجودہ کلام اللہ کی جو ترتیب ہے اسے من، عن ہم نے قبول کیا ہے۔ اور اب اس میں ایک نقطہ کی تبدیلی ہمیں منظور نہیں ہے۔ پھر ذرا دیر توقف کے بعد کہا۔ آپ سب واقف ہیں کہ بائبل کا کیا حشر ہوا ہے کہ اب اس کی اصل معدوم ہے۔ لہٰذا قرآن پاک کے ساتھ علمی سطح پر بھی یہ کام کیا گیا تو اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اور بسم اللہ کی ''ب'' سے الناس کی ''س'' تک ''بس'' اس کے اندر جو کچھ ہے وہی قرآن ہے۔ باقی نفی،

مولانا سید علی نقی صاحب کی اس تقریر اور واضح اعلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ صاحب اپنا مقالہ اسی طرح واپس لے گیے۔ ختم تقریر کے بعد پروفیسر عبدالعلیم نے مسکراتے ہوئے مولانا کو خطاب کیا اور داد طلب نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ آپ نے انگریزی کا علم حاصل کیا یا نہیں مگر مقالہ کی نفی جس انداز میں کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ مولانا نے اپنے اوپر قابو کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ اس کے باوجود اضافی قرآن کا الزام تو ہمارے ہی سر رہے گا نا۔؟؟؟

مولانا نے ۱۹۵۹ء سے اس دارالعلوم کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ اس سے ان کی ذات کو کوئی فائدہ ہوا یا نہ ہوا مگر یہاں کے اہل علم اور اہل بصیرت کو بے حد فائدہ ہوا۔ ہم میں دینی تعلیم کا رجحان پیدا ہونا مجالس کا قیام عزاداری امام حسین علیہ السلام کا مستقل طور سے سلسلہ قائم ہونا، اتحاد بین المسلمین کی تلقین اور اس پر اصرار شدید، عصری تقاضوں و براہین کی آگاہی اور چھوٹے چھوٹے مگر معنی خیز الفاظ میں دینی پیغام پہنچانے کا کام مولانائے موصوف کا اہم کارنامہ ہے۔ امامیہ مشن کا احیاء اور اس کے لیے فضا پیدا کرنا میری دانست میں سب سے اہم

کام تو یہی تھا جس کو زندگی کے آخری لمحات میں انہوں نے قوم کے سپرد کیا۔ امامیہ مشن کا ادارہ مولانا کا مرہون ہے۔ جس کے آپ دائمی صدر اور بانی تھے۔ افسوس کہ اب ادارے کا نام ہی رہ گیا ہے۔ اور بس۔

مولانا کا طرز خطابت منفرد تھا۔ وہ اپنے مضمون کو ہر لمحہ پیش نظر رکھتے تھے سامع کے مزاج اور مجمع کے افراد کو دیکھ کر گفتگو کی ابتدا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریر کو سننے کے لیے ہر طبقہ کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہونا فرض عین خیال کرتے تھے۔ مگر کیا مجال کہ ایک بیان دوسرے بیان سے ٹکرا جائے اور سچ یہ ہے کہ اس طرز تخاطب کی کاٹ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا اعتراف ان کے مخالفین کو بھی تھا۔ اس ذیل میں یہ واقعہ قابل تذکرہ ہے کہ اصغر آباد کے راجہ راجگان ایک زمانہ میں مخالفین میں تھے اور ان کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ مگر ایک سال جب محرم آیا تو ان دنوں پورے یوپی میں تشدد کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ علی گڑھ کرفیو زدہ تھا ۴ر محرم تک بیرونی ذاکر نہ آسکا۔ مجالس سونی گزر رہی تھیں۔ مومنین تعب کا شکار تھے ۵-۶ محرم کو یہ گفتگو درمیان میں آئی کہ راجہ محمد حسن کے یہاں جو خصوصی مجلس ۸ر محرم کو ہوتی ہے۔ وہ بھی نہ ہوگی پھر راجہ صاحب سے ہم نے مل کر بات کی۔ درمیان میں پروفیسر سید محمد حسین رضوی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، صدر شعبہ لائبریری سائنس وغیرہ نے مشترکہ طور پر کہا کہ کیا مولانا علی نقی صاحب قبلہ سے استدعا نہیں کی جاسکتی ہے؟ راجہ صاحب نے بے دلی سے کہا ''جو آپ حضرات کی رائے'' اس بات پر میں نے عرض کیا۔ صاحب خانہ آپ ہیں۔ اس لیے آپ کی رائے قطعی درجہ رکھے گی نہ کہ ہماری۔ آخر طے پایا کہ مولانا سے بات کی جائے۔ یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔ مولانا کو بہ نفس نفیس اس گھرانے کے خیالات کا بھرپور علم تھا۔ میرے لیے اس مشکل کا شافی جواب ممکن ہو سکے گا یا نہیں۔ پھر بھی ہمت کر کے ۶ر محرم کی شام ہی کو حاضر خدمت ہو کر عرض مدعا کیا۔ مولانا نے شفقت کی نظر ڈالتے ہوئے لب کھولے اور فرمایا:

''حضرت میں ذکر حسین علیہ السلام کو افضل خیال کرتا ہوں خواہ کسی مقام پر بھی ہو مگر راجہ صاحب اپنی مصلحت کو دیکھیں''۔

اس لفظ ''مصلحت'' میں کتنے معنی اور کیسی تاریخ پنہاں ہے اس کی تفصیل میں جائے بغیر میں نے سب کی موجودگی میں راجہ صاحب سے بعینہ یہی الفاظ دہرائیے۔ ایک لمحہ کے واسطے تو راجہ محمد حسن مرحوم گنگ ہو گئے مگر ان کی مدد کے لیے راجہ حامد حسن صاحب سامنے

آ گئے (اگر چہ سب سے بڑا خطرہ مجھے ان ہی کی ذات سے تھا۔ بے لاگ، صاف گو، دوٹوک بات کہنے والے، چھوٹے بڑے کا خیال، لاج کو خاطر میں لائے بغیر، گفتنی نا گفتنی کہنے سے باز نہ آتے تھے) اورانہوں نے بھائی کی مدد کی۔ معاملہ طے پا گیا۔ اعلان ہوا کہ ۸؍محرم الحرام کی شب کو سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ صدر شعبہ دینیات شیعہ، مسلم یونیورسٹی ،،محمود لاج،، میں مجلس پڑھیں گے۔ مولانا کو اس امر کی اطلاع دینے کا کام بھی مجھے تفویض کیا گیا۔ مجلس ہوئی اور ایسی مجلس کہ محمود منزل کے اندر باہر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی، راجہ محمد حسن مرحوم نے کمال دریا دلی سے مولانا کی پذیرائی کی اور عزت واحترام سے رخصت کیا۔ یہاں تک کہ اس خانوادے کا ہر شخص ان کی قدرومنزلت میں سبقت کرنے لگا۔ یہ مولانا کی وسیع القلبی اور علمی تشخص تھا، جس کی بنا پر ہر حلقہ میں ان کا احترام واجب کے طور پر کیا جاتا تھا۔ سیرت النبی کے جلسے ہوں یا مجلس غم مولانا کی تقریر سننے کے لیے شائقین دور دراز سے کشاں کشاں آتے اور اپنے ایمان کی جھولی بھر کر واپس جاتے۔

مولانا سید علی نقی صاحب طاب ثراہ کی کچھ ایسی صفات بھی ہیں جن کی تفصیل کا عام ہونا ضروری ہے مگر اس صفحہ کا دامن تنگ ہے لہٰذا پھر کبھی پر بات کو ملتوی کرتا ہوں اور محض اس بات پر ختم کلام کرتا ہوں کہ مولانا موصوف سے اب مرجع تقلید کا سلسلہ تمام ہو گیا۔ ۸۳؍سال کی عمر پا کر سب کو اپنا سوگوار بنا کر اپنے خالق اکبر سے جا ملے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا سید علی نقی صاحب ہر طبقہ اور دل کی آواز تھے۔ ہندوستان اور پاکستان بلکہ یورپ کے عوام میں بھی مقبول ومعروف تھے۔ تعصب اور نفرت سے پاک اتحاد ملی کے ہوا خواہ اور سربراہ۔ افسوس اب ہمارے درمیان ان جیسا پاک باز، باخبر، متبحر عالم نہ رہا۔ تقریباً ۲۰۰ سے زائد کتب کے مصنف اور قرآن پاک کے مفسر ومترجم۔ غفران مآب کی عالمی نسل کے آخری فرد۔ خدا مغفرت فرمائے۔

☆☆☆

مہربانان علی گڑھ

سلطنت مغلیہ کے زوال نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی تلخ تر کردی تھی۔ انگریزی اقتدار اپنے پنجے گڑا چکا تھا، آبادی میں خلفشار برپا ہو چکا تھا۔ ہر طرف بیچارگی کا احساس نمایاں تھا۔ زندہ مردہ اور مردہ بدتر از حال تھا، موت کو موت نہیں پوچھ رہی تھی۔ ''بغاوت'' میں سب ہی ہندوستانی شریک تھے۔ کیونکہ یہ دراصل بغاوت نہیں ''انقلاب'' تھا مگر تباہی اور بربادی صرف مسلمانوں کی قسمت میں مقسوم تھی، شہزادیاں بے بس، شہزادے دار پر اور ہم نوا محبوس تھے۔ دہلی لکھنو، کلکتہ، میسور، پنجاب و دکن کی سرزمین خون سے لال زار ہو رہی تھی۔ ایسے ہی حالات میں انگریزی علم کا سورج طلوع ہوا۔ منادی نے ندا دی، جس نے اس شمع سے استفادہ کیا اور اس پنجے کے نیچے آیا مقبول ہوا، باقی مقہور پائے گئے۔ مقہور کی فہرست میں مسلمانوں کی تعداد کثیر تھی۔ قسمت کے اس نظام میں کتنے گھر بے گھر اور کتنے چراغ بے نور اور کتنی مائیں بے اولاد اور کتنی اولادیں بے نسل ہوگئیں۔ اس کی داستان کتنے صفحات محفوظ کر پائے؟ مگر شاعر تو اپنے وقت کا ترجمان کہلاتا ہے۔ اس نے مختصر طور پر اس داستان کو جو قلم بند کیا تو اس عنوان سے:

جن گلیوں میں پہلے دیکھیں لوگوں کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگان بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں

(بہادر شاہ ظفر)

انگریزوں کے ظلم و استبداد اور جور و جبر، ستم رانی کا گلہ اس سے بہتر طور پر اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس میں لاشعوری طور پر شکست خوردنی، محرومی اور ترسنے اور تڑپنے کی کیفیت۔ آزادی و اقتدار کے راستے کی ہزیمت کا عنصر پوشیدہ ہے۔ نیز ہر سمت یاس، ناامیدی، ناکامی، انتشار اور تباہی کا جو ماحول تھا وہ بھی نمایاں ہے، ایسے میں نیم دروں نیم بروں حالات میں ایک شخصیت نمودار ہوئی، جو اپنے دور کا ''انقلابی بزرگ'' کہلایا۔ اس دور کا حقیقی احساس کرنے والا اور اس کو حکمت عملی سے درماں کرنے والا یعنی سر سید احمد خاں جو خود دہلی کے رہنے والے اور آشفتہ حالی کے دیدنی بھی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی محفل زبوں حالی کا رونا رو کر رہ جانا گوارانہ کیا، بلکہ عملی جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجادلہ وقت کے لیے آمادہ ہونا ضروری خیال کر کے تحریک عام پیدا کرنے کی سبیل پر غور کرنے لگے۔ پھر ایسے کام کیے گئے جس سے قوم کی حالت میں تغیر بھی پیدا ہوا اور نظام عدل و حکومت و قوم کے درمیان جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کی کمی بھی پوری ہو جائے۔ سر سید کو اگر چہ جاہ و منصب کا حصول ہوا، اور انہوں نے حکومت مغرب سے خطاب بھی پایا۔ مگر اپنی قومی حمیت کو کسی آن نقصان نہ پہونچنے دیا۔ یہی سبب تھا کہ وہ بیک وقت حاکم بھی رہے، مصلح بھی کہلائے، ماہر تعلیم بھی اچھے مصنف اور نثر نگار بھی، قومی ہمدرد اور لیڈر بھی پھر لطف یہ کہ ان اعزاز کے صلے میں کچھ قوم سے ''حاصل'' نہ کیا بلکہ زندگی کے چار دن جو لائے تھے اس کو بھی قومی وقار کے بقا کی جنگ میں صرف کر دینا پسند کیا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ ان کی زندگی عوام کی امانت ہے۔ اسی لیے وہ زندہ رہے تو قوم کے لیے اور جب مرے تو قوم کی خاطر۔ لیکن مرتے مرتے علی گڑھ کو، علی گڑھ ہی کو کیا، پوری مسلمان قوم کو ایک ایسی تحریک سے آشنا کر گئے جو عوامی تحریک بن گئی۔ اس لیے ہر طبقہ اور ہر خیال والے اس میں شریک ہو گئے۔ اسباب بغاوت ہند کے الزام کا ارتدا اور انقلابی تصور کا پیغام اسی شہر سے نشر ہوا مگر اس تحریک کو اصلیت کا رنگ دینے کے واسطے انہوں نے اکتساب علم کو ''نسخہ کیمیا'' تجویز کیا، مغربی اور مشرقی علوم ثقافت و علمی بصیرت کو ہم رنگ کرنا ضروری خیال کیا اور اس پر شدت سے زور دیا اور جب قدرت نے دیکھا کہ سید کی قوم کو پیغام پہنچانے کا کام کامل ہو گیا تو اس نے انہیں ۲۷ / مارچ ۱۸۹۸ء میں اپنے پاس بلا لیا۔ جس پر قوم کے ناموروں میں کہرام مچ گیا اور شبلی نعمانی جیسے بزرگ اور عالم نے گریاں کناں انداز میں مرثیہ کہا۔ جسے ہم قومی مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

وہ کشتہ قوم وہ فدائی
اٹھا لیے کاسۂ گدائی
صورت سے عیاں جلال شاہی
چہرہ پر فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی
چٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا

وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اک اک سے عرض حال کرتا
در در وہ پھرا سوال کرتا
گزرا وہ ہر ایک راہ گزر پر
دی اس نے صدا ہر ایک در پر
کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں
ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
لعل اس نے دیے شرار پائے
گل نذر کیے تو خار پائے
کیا تلخ ملے جواب اس کو
کیا کیا نہ دیے خطاب اس کو
منظور جو قوم کا تھا اعزاز
ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
ہمت تھی جو شمع راہ اس کی
خالی نہ گئی وہ آہ اس کی

سرسید کے اس علمی جہاد نے قوم میں کیسے کیسے دماغ پیدا کیے ان کی تفصیل طویل ہے مگر ایک دنیا ان ناموں سے آگاہ ہے جو علی گڑھ کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے۔ ان میں راس مسعود، مولانا محمد علی شوکت، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محمود، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام السیدین، خواجہ عبدالمجید، شیخ عبداللہ، کرنل سید بشیر حسین زیدی، لیاقت علی خاں، سرشاہ سلیمان، بابر مرزا، پروفیسر رشید احمد صدیقی، عبدالمجید قریشی اور نہ جانے کتنے اور حضرات جن کی شخصیت کا عکس اس درس گاہ کا مرہون منت ہے۔ اسی طرح اس درس گاہ کو اپنی شخصیت سے فیضان پہنچانے اور سید کے مشن کو آگے بڑھنے کے لیے جن لوگوں نے خدمت کو ایمان خیال کیا۔ ان کا تعارف کرانا اور ان سے متعارف ہونا بھی ہمارا علمی کارنامہ ہونا چاہیے۔ ایسے ہی اشخاص میں سرشاہ سلیمان مولانا سید علی احسن، احسن مارہروی، مولانا ابوبکر شیث، حسن عبداللہ وغیرہ کی شخصیت تھی جن میں سے چند پر آج ہم آپ کی توجہ منعطف کرانی چاہتے ہیں۔ ان حضرات کی شخصیت کا عکس یہاں کی زندگی پر پڑا اور یہاں کی زندگی کا اثر ان

کی شخصیت پر پڑا اسی دو آتشہ نے علی گڑھ کو علی گڑھ بنایا اور چار دانگ عالم میں مشہور کیا۔

۱- سر شاہ سلیمان

شاہ سلیمان کے والد کا نام محمد عثمان تھا وہ جونپور کے مشہور نامی گرامی وکلاء میں تھے۔ شاہ سلیمان نے لندن سے بیرسٹری پاس کی تھی ان کی قابلیت وصلاحیت کو دیکھتے ہوئے ان کو الہ آباد ہائی کورٹ وفیڈرل کورٹ کا چیف جسٹس بھی مقرر کر دیا گیا۔ جو اس عہد کا بہت بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ شاہ صاحب ہماری مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ آپ ریاضی کے ماہر، شعر وادب کے دلدادہ شریف النفس بزرگ تھے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب شاہ صاحب چیف جسٹس کے عہدے پر مقرر ہو گئے تب بھی دوست احباب چھوٹے بڑے سب سے اسی انداز سے ملا کرتے جیسا پہلے ملتے۔ ان میں اصابت رائے اور سوجھ بوجھ بے حد تھی اور علی گڑھ و مسلمانوں سے ان کو عشق صادق تھا جس کا اعتراف پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس طرح کیا ہے۔

"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ایک دور بڑا سخت گزرا ہے جب اس پر ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھا گیا تھا۔ کمیشن نے یونیورسٹی کی آئندہ دروبست کے لیے جو سفارشات تجویز کی تھیں ان کو مکمل ضابطہ کی شکل دے کر نافذ کرنا نازک اور مشکل کام تھا اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو قانونی نکتوں سے واقف، علی گڑھ کی دیرینہ روایات کا قدردان، اور علی گڑھ کی ناموری و نیک نامی کا دل سے خواہاں ہو۔ سر شار نے اس کے لیے عارضی طور پر مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا منظور کیا۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے، وہی جانتے ہیں کہ مرحوم نے کس قابلیت، جاں فشانی اور دل سوزی کے ساتھ اس مرحلے کو طے کیا۔ شکستہ خاطروں کی دل جوئی کی، کام کرنے کا نئے سرے سے ولولہ پیدا کیا اور بہتوں کے وزن و وقار کو دوبارہ زندگی بخشی۔ (گنجہائے گراں مایہ ص ۲۲۸)

سر شاہ سلیمان اپنے عہد کے مسلمہ ماہر قانون بھی تھے اور نہایت اعلیٰ سوجھ بوجھ کے مالک، نکتہ رس اور دور بین شخص تھے۔ وہ معمولی سے معمولی بات پر نظر رکھتے تھے۔ دید و دریافت کے جویا اور اس رمزے سے بھی آگاہ تھے کہ قوم وملل پر برا وقت اور بری گھڑی جب آجاتی ہے تو کیا قیامت ڈھاتی ہے یہی نہیں وہ قیامت اور اس کی علامتوں دونوں سے واقف تھے رشید صاحب نے ہی ان کی اس خوبی کا تجزیہ جس انداز سے فرمایا ہے وہ ملاحظہ ہو:

"علی گڑھ یونیورسٹی کا کام خصوصیت کے ساتھ نہایت ہی پیچیدہ اور مختلف النوع ہے۔اس سے عہدہ برآمد ہونا معمولی بات نہیں۔سر شاہ جب اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے آتے تو آنے کے ساتھ ہی یہاں کے کاموں میں لگ جاتے۔آفس میں قیام کرتے ڈائننگ ہال سے کھانا خرید کر کھاتے، آفس میں سوتے، یونیورسٹی کا ایک پیسہ اپنی ذات پر صرف نہ کرتے۔اس بارے میں وہ اس درجہ محتاط تھے کہ بعض پرانے زمانے کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور کسی سے کسی حال میں ملاقات سے گریز نہ کیا۔یہی نہیں انہوں نے مسلم یونیورسٹی کو دیا بہت کچھ لیا کچھ بھی نہیں۔(گنجہائے گراں مایہ۔ص ۲۲۹)

سر شاہ سلیمان کے ساتھ جس عملہ نے کام کیا تھا ان کے متعلق سید محمد احسن صاحب مارہروی، سابق ڈپٹی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بیان تھا کہ وہ اپنے عملہ کی ضروریات اور تکالیف کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ان سے متعلق اگر کوئی حرف شکایت زبان پر لاتا تو اسے بخوبی سن لیتے۔پھر اس شخص کو ان کے ہی سامنے بلا کر دریافت واقعہ کرتے وہ ان کی رنجش کی وجہ بیان کرتے جو صداقت پر مبنی ہوتی۔ایسی حالت میں شاہ صاحب، صاحب شکایت سے خود شکایت کرتے اور آخر کلام کے طور پر کہتے کہ نقصان پہنچانے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ خود کو کتنی منفعت حاصل ہوسکتی ہے۔یہی نہیں وہ اپنی فراست سے بہت سے نازک مشکلات کو اس آسانی سے رفع کرنے کی تدبیر بتاتے کہ بڑے سے بڑا مسئلہ پادر ہوا ہوجاتا پھر وہ ملنے والوں سے گریز نہ کرتے، سب کی دلجوئی کو فرض خیال کرتے خوش اخلاقی، رواداری اور التفات ان کا سرمایہ تھا۔غرض یہ کہ اس ادارہ کی بقاو سلامتی کے لیے انہوں نے اپنی حیات کے آخر تک کام کیے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد اگر چہ ان کو نظام الدین اولیا بستی نظام الدین دہلی میں دفن کیا گیا، مگر مسلم یونیورسٹی میں ان کی خدمات بے غرض کو یاد رکھنے کی خاطر ایک ہوسٹل کا نام ہی سلیمان ہال کے نام پر رکھ دیا گیا۔اسی طرح علی گڑھ والوں کے دلوں میں یہ نام ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گا اور ان کی یاد برقرار رہے گی۔

۲- مولانا سید احسن مارہروی

عہد اورنگزیب میں سادات بلگرام کی جو شاخ مارہرہ ضلع ایٹہ آئی وہ علم وفضل کے اعتبار سے اپنے خاندان کے دیگر علماء کی مثل ممتاز و مفتخر تھی۔اسی خانوادے میں الحاج شاہ سید علی احسن، مارہروی پیدا ہوئے۔ان کے والد سید مجتبیٰ حسن صاحب خود صاحب تقویٰ اور

صاحب علم و دانا بزرگ تھے۔ مذہبی خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے مولانا احسن کو قرآن و دینیات کی تعلیم کے بعد علوم مشرقیہ کی تعلیم کے لیے متوجہ کیا گیا۔ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اس لیے ابتداء ہی سے شعر و ادب میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے عہد کے منتخب شعراء و ادبا میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء تک مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ سینکڑوں طلباء میں شعر و شاعری اور ادبی قواعد اور فارسی نثر و نظم کے ساتھ عربی زبان پر قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے اور عروض و لغت پر بھر پور نظر ہونے کے باعث کسی کی بھی ادبی غلطی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ زبان و بیان اور سلامت و متانت کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ داغ دہلوی کے عزیز اور ہونہار و باشعور شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ برمحل اشعار بے حد یاد تھے خود اچھے شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں شوخی اور مزاح کا عنصر بھی تھا اس وجہ سے موقع کے اشعار خوبی سے سناتے یا نظم فرماتے تھے۔ چنانچہ جدی سید آل حسین بلگرامی نے اپنے وطن سے احسن مارہروی کو ایک خط میں خیر و عافیت نہ ملنے کی شکایت لکھتے ہوئے ان سے تصویر طلب کی۔ مولانا نے ان کی فرمائش کا پاس کیا اور اپنی تازہ تصویر کھنچوا کر یہ شعر لکھ کر بھیجوا دیا:

اپنی تصویر کی تقدیر پہ احسن ہے رشک
یہ منگائی گئی لیکن میں بلایا نہ گیا

آپ کی قادر الکلامی اور فن پر اصابت رائے کے اہل علم و دانش معترف تھے۔ یونیورسٹی کے طلباء سے موصوف کو بے حد شغف تھا۔ ان میں شعری و ادبی مذاق پیدا کرنے کی بر وقت سعی کرتے اور طلباء کے لیے اجازت تھی کہ وہ جس وقت چاہیں اپنی مشکلات کی بر آری کے لیے ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ چنانچہ احسن مارہروی سے متعلق ان کی وفات کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے تاثرات اس طرح قلم بند کیے تھے۔

> ''رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹ کے لگ بھگ رہا ہوگا، مولانا احسن مارہروی ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور اگست ۱۹۴۰ء میں کچھ دنوں علیل رہ کر انتقال فرما گئے۔ مدفن آپ کا مارہرہ شریف میں اپنے بزرگوں کا قبرستان قرار پایا۔ اگرچہ انتقال آپ کا پٹنہ میڈیکل کالج میں ہوا تھا''۔

''جسم کے بھاری بھرکم تھے، سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور شرافت خیال و مقال سے مقبول اور ادبی مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہ معلوم ہوتی وہ

دوسروں سے پوچھ لیتے۔ خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتا۔ اکثر دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آ گیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے یہ محسوس ہوتا کہ کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی تامل کے سب کو چھوڑ کر لائبریری چلے جاتے وہاں بھی کام نہ چلتا تو کئی کئی دن اس ادھیڑ بن میں رہتے۔ بالآخر بات واضح ہو جاتی تو خوش خوش آن کر اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے'' (گنجہائے گراں مایہ۔ ص ۱۶۷)

اس رخ سے ان کے یہاں تحقیقی کاوش اور علمی شغف کا جو رجحان تھا وہ ظاہر ہوتا ہے لیکن مسلم یونیورسٹی سے ان کا یہ رشتہ ازلی تھا۔ اسی لیے آپ نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس درسگاہ کو بہترین درسگاہ کا درجہ دے رکھا تھا اور کہا کرتے تھے کہ سرسید نے اپنی آن اور جان دے کر اس ادارہ کو قائم کیا تھا۔ مسلمان بچوں کے لیے محض مکتب کی قدیم تعلیم سے کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ یہاں کی مغربی تعلیم اور مذہبی تعلیم سے ان کو جس قدر فائدہ ہوگا اس سے محروم رکھنا قومی نامرادی کی بات ہوگی۔ یہی نہیں یونیورسٹی کی ہر خدمت کو وہ نہایت دلسوزی سے انجام دیتے اور ہر جگہ اس کے وقار اس کے طلباء اور اس کے رہنما اور اسکے اساتذہ کا نیک نامی کے ساتھ تذکرہ کرتے۔ ایک اچھے سخن ور اور اساتذہ ہونے کی وجہ سے بھوپال، بمبئی پٹنہ، حیدر آباد، شملہ، دہلی اور لاہور و کراچی کے ادبی اشخاص آپ کو زحمت سفر دیتے آپ وہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتے اور یونیورسٹی کی افادیت کا تذکرہ کرتے۔ اس کو ہم نوا بناتے۔ سرسید کا جب انتقال ہوا ہے اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۲۲ سال تھی۔ ان کا شعور بالغ تھا اور فکری عنصر جوان تھا ان کی نثر پایہ کی اور نظم عمدہ ہوتی۔ جب وہ اپنے شاگردوں کے بیچ ہوتے تو ان کو محض صلاح شعر نہ دیتے بلکہ عروض و قواعد کی طرف بھی متوجہ کراتے۔ یہ فخر کچھ کم نہیں کہ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں پر منتج ہے اور وہ سب اپنے کو ''احسنی'' کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ شعر میں ان کا رنگ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق ''کلاسیکی'' اور مضمون آفرینی کی نظامت بے پناہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسالیب زبان و بیان پر زیادہ زور دیا۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی جو مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے صدر بھی تھے ان کا بیان ہے کہ:

''انہوں نے جوانی کے عہد سے زندگی کے آخری لمحوں تک یعنی تقریباً نصف صدی

تک جو کام کیے ان کے لحاظ سے ان کو فنانی الاردو کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا''۔

مگر مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو ہوتے ہوئے بھی شعر اچھوتے اور شوخ رنگ کے کہا کرتے تھے جیسے:

شہر چھوٹا پاؤں ٹوٹے خانہ ویرانی ہوئی
جستجوئے یار میں کیا کیا پریشانی ہوئی
پھنس کے دام عشق میں-کیوں ان سے نادانی ہوئی
میں تو دیوانہ ہی تھا دنیا بھی دیوانی ہوئی
ٹھہر ٹھہر کے چل او جلدباز عمر رواں
روا روی میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

شعر و ادب کا یہ سلسلہ مولانا کی آخری عمر تک جاری رہا۔ آپ نے سری رام کے ساتھ ''خمخانہ'' کی تیاری اور اس کے ترتیب کے لیے لاہور میں رہ کر فرائض انجام دئے اسی طرح اپنے استاد داغ دہلوی کی صحبت کے لیے حیدر آباد (دکن) میں رہائش اختیار کی۔ چنانچہ جلوہ داغ، انشائے داغ کی ترتیب و تہذیب آپ کا گراں قدر علمی کارنامہ ہے لیکن فصیح الملک جو اگر چہ ایک رسالہ تھا مگر اس کی حیثیت علمی اعتبار سے کسی بھی کتاب کی تدوین سے کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کلیات ولی دکنی کی ترتیب اشاعت اور تاریخ نثر اردو (منشورات) کا کام ایسا نادر و یگانہ کام تھا جو مولانا احسن سے قبل کوئی دوسرا انجام نہ دے پایا تھا۔ چنانچہ اس علمی نسخہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور ذوق و شوق سے اس تصنیف کو مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ نے ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ اس تصنیف کا انتساب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع نظام حیدر آباد کے نام نامی سے کیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کو علم اور علم کے قدر دانوں سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک تصنیف کا تاریخی نام ''نمونہ منشورات'' ہے۔ جس سے ۱۳۴۸ھ نکلتا ہے۔ مولانا احسن کے ذاتی و خاندانی کتب خانہ میں بیش قیمت نوادر تھے، قلمی اور قدیم مطبوعات کی ایک بڑی تعداد جمع تھی، جس کو ان کے پس ماندگان نے مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کو تحفہ دے دیا اور جو اب مولانا آزاد لائبریری میں (احسن کلیکشن) کے نام سے موجود ہے اور جسے سید محمد حسن رضوی، لائبریرین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس تمام ذخیرے کی ایک جامع فہرست شائع کرا دی ہے جس سے احسن مارہروی کا کام اور نام تا ابد باقی رہے گا۔

۳- حسن عبداللہ

آپ علی گڑھ کی ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت تھے جو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ وہ یونیورسٹی میں اگرچہ (اسٹیوارڈ) کے عہدے پر فائز تھے جس سے تمام منسلک اشخاص ناخوش ہی رہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے اختیار کو تو سب جانتے ہیں مگر اس کی مجبوریوں اور پابندیوں سے ناواقف ہوا کرتے ہیں۔ تعلیم کے اعتبار سے ایم۔اے، ایل ایل بی تھے پی ایچ ڈی کے لیے لندن گئے مگر جنگ دوم کی ابتدا کے سبب واپس آگئے۔ مسلم یونیورسٹی کی لکچرر شپ کے لیے وہ زندگی بھر کوشاں رہے لیکن ارباب یونیورسٹی ان کو اس عہدے پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے کہ اردو لکچرر شپ کو آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی شخص ضرور مل جائے گا حسن عبداللہ یعنی منتظم نہیں مل سکے گا۔ کہا جاتا ہے کہ دیانت کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں انسان دوسروں کے لیے سب کچھ کرتا ہے، اپنے لیے کچھ نہیں، یہ اپنے لیے کچھ نہ کرنا اور دوسروں کے واسطے سب کچھ کرنا بھی دیانت کی ایک عمدہ قسم ہے مگر صرف قوم کی خاطر اپنے کو مصائب میں مبتلا کیا جائے اور ترک لذات کی جائے تو ہم اسے سچی دیانت کا نام دے سکتے ہیں جو پیغمبروں کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اس لیے کہ وہ خوش نودی خدا کے سوا اور کسی شے کا تصور نہیں کرتا۔ ہم محض انسان ہیں اس لیے ہم اپنے آپ کے سوا اور کسی کو نہیں پہچان پاتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم میں دیانت کے بجائے حصول مطلب کا جذبہ زیادہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن حسن عبداللہ کی دیانت اس دوسری قسم کی نہ تھی۔ ان کے یہاں خیر کا جذبہ اور خدمت کا تصور زیادہ تھا وہ اپنے لیے کم، دوسروں کے لیے جینا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اشخاص کی قدر کرنا اور پاس ولحاظ رکھنا ان کا شیوہ تھا دل آزاری کو وہ دل داری کو خدا واسطہ کی راہ سمجھتے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی زبان سے ایک واقعہ سنئے:

''میرے سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ دفعتاً کبھی ان کے آفس میں پہنچ جاتا اور سگریت پیتے ہوتے تو اسے مسل کر چھپایا پھینک دیتے اور سرو قد کھڑے ہو جاتے۔ بار بار کہا کہ اس تکلف میں کچھ دھرا نہیں اس سے آپ ہی کے نہیں خود اپنے آپ سے بے گانگی کا احساس ہونے لگتا اور یہ بات میرے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ کہنے لگے ان کو یہی اچھا لگتا ہے''۔ (گنجہائے گراں مایہ۔ ص ۱۶۷)

اس اقتباس سے میرا مدعا ان کی روایت پرستی کو ظاہر کرنا نہیں، بلکہ ان کے یہاں جو شرافت، احترام شخص اور عظمت علم و وقار تھا۔ اس کا بتانا مقصود ہے۔ اس طرح ان کی مذہبی اور شرعی امور کی ادائیگی کا جو جذبہ تھا، وہ دینی حدود کی پابندی اور اسلامی اقدار کا وصف خاص تھا، اور جس کو وہ ضروری خیال کرتے تھے، ان کے لیے مشہور ہے کہ وہ اسلامی اقدار کے خلاف کوئی بات سننا گوارہ نہ کرتے تھے۔ رشید صاحب نے اس خاکہ میں ان کے خدوخال اس طرح نمایاں کیے ہیں۔

''انگلستان میں ٹیوب کے اسٹیشن پر اترے۔ سامنے زینہ، زینہ کے موڑ پر تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی آنے جانے والوں کا ریلا تھا۔ نماز کا وقت یاد آگیا وہیں نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے ادھر کا مجمع ادھر، ادھر کا ادھر، گڑبڑ مچ گئی، پولیس سارجنٹ بلایا گیا۔ اس نے پہلے تو غور کیا۔ پھر کچھ کہا، یہ رکوع میں چلے گئے وہ پیچھے کھسک گیا۔ اس کے بعد یہ سجدہ میں گئے تو اس نے سیٹی بجائی۔ یہ اٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے ان کے دونوں شانوں کو جھنجھوڑا۔ یہ نیت توڑ کر اس سے گتھ گئے۔ معاملہ پولس کمشنر تک پہنچا اس نے ان کو فہمائش اور سارجنٹ سے کہا کہ غیر ملکیوں کا بہرحال احترام کرنا چاہیے''۔ (گنجہائے گراں مایہ۔ ص ۱۶۷)

بقول رشید صاحب یہ واقعہ اگر ہندوستان میں ہو جاتا تو اللہ جانتا ہے کہ کیا کچھ نہ گزر جاتا لیکن یہ بات حسن عبداللہ سے دیار مغرب میں ہوئی اور اس شان سے ہوئی کہ ان کے کردار کا ایک جزو بن گئی۔ اس کے باوجود کہنے والے سے کہتے تھے کہ وہ میری نادانی تھی۔ جو میں اس پولیس والے سے گتھ گیا۔ اس کا اثر آج تک میرے اوپر ہے۔ اس شرافت کا جواب کہیں ہے؟ یہی نہیں وہ جب تک اس ادارے سے وابستہ رہے اس کی دیکھ ریکھ اور اس کے نفع و نقصان اور سود و زیاں کا برابر خیال کرتے رہے۔ اپنے وقت کو وقت نہ جان کر یونیورسٹی کی ضروریات کو اول خیال کرنا وہ اپنا فریضہ خیال کرتے تھے۔

۴۔ مولانا ابوبکر شیث

احاطہ یونیورسٹی کو ہم گہوارہ مسلمان قوم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی عمارت کو درسگاہ۔ ان کی عمارت میں سرسید ہال کے ایک بلند دروازہ کا نام ''باب اسحاق'' ہے اگرچہ اس شہر علم کے اور بھی مختلف درو رے ہیں جیسے باب العلم جو یونین اور ماریسن کورٹ کے رخ سے داخلہ کا راستہ ہے۔ دوسرا باب رحمت ہے جو پویلین اور کرکٹ گراؤنڈ سے ملحق ہے اور مسجد جامع

کے پاس۔ تیسرا وکٹوریہ گیٹ ہے جسے ہم صدر دروازہ کہہ سکتے ہیں، مگر باب اسحاق کی خوبی یہ ہے کہ اس کے دروازے نے ایک مدت دراز تک ان اشخاص کو اپنی آغوش سے گزارا ہے جن کی حرمت ووقعت ہر قرن میں کی جائے گی۔ ان میں پروفیسر ہادی حسن، پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر ضیا بدایونی، پروفیسر سید علی احسن، احسن مارہروی، پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر سید بشیر الدین اور نہ جانے کتنے تھے، اس کی قدامت کی داستان طویل ہے اور اس کی حرمت کی کہانی بھی خوب سے خوب تر ہے۔ ایسے ہی افراد میں مولانا شیث بھی تھے۔ مولانا کی قیام گاہ باب اسحاق سے ذرا آگے چل کر این سی سی گراؤنڈ سے پہلے بلکہ این سی سی کا جو دفتر ہے اس کی پشت پر جو عمارت ہے وہ ۴ نذیر احمد روڈ کہلاتی ہے۔ یہی مکان مولانا ابوبکر شیث کی قیام گاہ تھی۔ اب یہ عمارت ''بیت الصلات'' کے نام سے مشہور ہے۔ اور ناظم شیعہ دینیات کے لیے مختص ہوگئی ہے دراصل مولانا شیث کے انتقال کے بعد مولانا عابد شبر کو رہائش کے لیے یہ مکان دیا گیا تھا انھوں نے شیعہ دینیات کے پڑھنے والے طلباء کی مشکلات کا خیال کرتے ہوئے اس کے دو ایک کمرے درس وتدریس کے لیے وقف کردیے پھر اس کے ایک حصہ میں نظامت شیعہ کا دفتر بھی قائم ہوگیا۔ نماز اور مجالس کا سلسلہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں شروع ہوا بلکہ ذاکر صاحب کی ایماومرضی سے مجالس کی ابتداو قیام عمل میں آیا۔ جس کا سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔ خیر، میں عرض کررہا تھا کہ مولانا شیث کا مسکن یہی گھر تھا اور وہ سادہ لوح یہیں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ مرحوم مسلک کے اعتبار سے فاتحہ اور پیر پرستی کے سخت مخالف تھے لوگ ان کو وہابی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اگر چہ جمیعۃ العلماء کے انتہائی اہم رکن شمار کیے جاتے۔ علی گڑھ سے وابستگی اور اس سے انسیت یہاں کھینچ لائی شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا نے جو نام یہاں کمایا وہ درجہ ان کو کہیں اور نصیب نہ ہوسکا چنانچہ یہاں والوں سے بھی انہوں نے جو بھائی چارگی، مروت، اخلاق اور مہربانی پائی تو پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ زندگی جون پور میں پائی تھی مگر موت علی گڑھ میں پائی اور اسی دیار میں مدفون ہوئے۔ خود سادہ مزاج تھے لباس بھی سادہ ہی استعمال کرتے زائرحرم تھے اور حاجی کی جملہ صفات سے متصف۔ عالم باعمل اور صاف گو تھے۔ سنی دینیات کے ناظم تھے۔ اس لیے مرنے جینے میں سب کے شریک۔ جہاں کسی گھر میں موت ہوئی اس کے وارث نے مولانا کے آستانے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ دروازے سے باہر نکلے، حال پوچھا ملال ظاہر کیا اور یونیورسٹی کے قبرستان میں تدفین کی اجازت لکھ کردے دی۔ پھر پوچھتے میاں صاحبزادے

میت کب اٹھے گی۔ مطلب یہ کہ نماز جنازہ پڑھانے کے لیے ضرورت تو نہیں ہے؟ اس مرنج طبیعت کے بعد بھی فرمایا کرتے۔

''تمہارا علی گڑھ مصالح کا شکار ہے مصلحت اندیشی اچھی چیز ہے لیکن مصلحت پرستی تنزلی کی جڑ ہے''

مولانا شیث مرحوم کی اس رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔ لیکن مولانا کے گہرے تجربے نے جو بات سوچی تھی۔ اس کا اظہار اس عبارت میں بلا خوف وخطر ملتا ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ مصلحت اندیشی کے بغیر اس دنیا کا کیا، اس دنیا کا کام بھی شاید نہ چل سکے مصلحت پرستی کی حد مقرر کرنا ہر شخص کے امکان میں کہاں ہے؟ پھر اس دور افلاطون میں جہاں مقابلہ بلکہ مجادلہ بے پناہ ہوتا ہو ''مصلحت'' کے سوا گزر کیسے ہوسکتی ہے؟ اس سے قطع نظر مولانا کی شخصیت بہت جامع صفات اور محبوب تھی۔ مذہبی اعتبار سے سخت۔ ذرا سی بھی لچک کو گوارا نہ کرتے۔ اس صفت میں انہوں نے کیا کھویا کیا پایا؟ اس کی جواب دہی تو خود مولانا کریں گے۔ ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ابوبکر شیث کی ذات ہمہ دان تھی اور وہ جس عنوان سے اپنی زندگی میں یاد کیے جاتے تھے موت کے بعد بھی یاد کیے جاتے ہیں اور یاد کیے جاتے رہیں گے۔

علی گڑھ کی دنیا میں مولانا کی علالت ایک سانحہ بلکہ حادثہ تھی حادثہ اس اعتبار سے کہ وہ پہلے شخص تھے جن کو اطباء نے کینسر تجویز کیا تھا۔ اس سے قبل کسی کو یہ مرض اس بستی میں لاحق نہ ہوا تھا۔ اس لیے بھی آپ سے سب کو ہمدردی وانسیت ہوگئی تھی۔

حق مغفرت کرے عجب پاکباز مرد تھا۔

☆☆☆

چند تسامحات بلگرام - تاریخ و تہذیبی پس منظر

قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی، صوبہ اتر پردیش کا تعلیمی گہوارہ تھا۔ جہاں سید حسین بلگرامی دلی وال، دیوان سید بیکھا بہارن، سید مبارک محدث بلگرامی، خان بہادر سید کرم حسین، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی بن خان بہادر سید زین الدین حسین بلگرامی شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی بن سید زین الدین حسین بلگرامی، حضرت سید اسمٰعیل چھیما بن سید قطب عالم بن محمد صادق بلگرامی، سید علی متقدی بلگرامی زبیدی بن سید محمد بلگرامی علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی بن سید احمد بلگرامی، سید محمد شاعر بلگرامی علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی، سید عظمت اللہ بیخبر بلگرامی سید غلام نبی رسلین بلگرامی سید نظام الدین مدھنا نک بن سید علاء الدین بلگرامی سید عبدالواحد بلگرامی، قطب الاقطاب، سید شاہ برکت اللہ عرف شاہ برکاتؒ بلگرامی بن سید اویس بلگرامی، شاہ سید صاحبؒ عالم تخلص صاحب بلگرامی ثم مارہروی اور حافظ سید عبدالجلیل بلگرامی بن سید ابن امام بلگرامی نیز حافظ سید علی احسن، احسن مارہروی بن شاہ سید مجتبیٰ حسن بلگرامی کے سوا سید خورشید علی بلگرامی، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سید نورالحسن بلگرامی مبارز الملک وضرغام جنگ اور سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے سوا خان بہادر سید اولاد حید رفوق بلگرامی بن سید حیدر رضا بلگرامی جیسی شخصیات نے سید محمد صغریٰ بلگرامی فاتح بلگرام ۶۱۴ھ مطابق ۱۲۱۷ء میں (عہد شمس الدین التمش بادشاہ) آپ ہی کی شاخ میں نواب مبارز الملک وضرغام جنگ نواب سید نورالحسن بلگرامی (۲۳ رمضان ۱۱۳۶ھ ولادت) عہدے نواب صفدر جنگ کے ہمراہ دہلی سے آرہ آئے اور سب سے اول بار بنارس کے علاقہ کی تحصیل داری سنبھالی۔ اس کے بعد انگریزی اقتدار میں آپ کی فراست اور تدبر کے باعث صوبہ بہار کے ایک بڑے علاقہ پرگنہ چین پور، سہسرام وغیرہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اور ۱۵۲ گاؤں آپ کی تحویل میں دیے گئے۔ اس کے سوا ۵۰۰ سوار ۶۰۰ پیادے اور ۱۰۰ کارندے مختلف امور کے لیے آپ کو حکومت کی طرف سے تفویض کیے گئے اس طرح نواب سید نورالحسن بلگرامی کو بکسر سے مظفر پور تک کا علاقہ تفویض ہوا۔ آرہ شہر کو جو پٹنہ سے قرب کا علاقہ ہے۔ اسے اپنی ریاست کا انتظامیہ بنایا

مگر مستقل رہائش کے واسطے آپ نے سہسرام اور آرہ کے درمیان کواتھ (Koath) کو رہائش کے لیے پسند کیا۔ اور یہیں ۱۲۰۹ھ میں ۷۳ سال کی عمر پا کر قضا کیا۔

اس تفصیل سے قطع نظر قصبہ بلگرام کی اہمیت کا ذکر اپنی جگہ آپ رکھتا ہے۔ بلگرام سے متعلق جن ناموران کا نام ابتدا میں تحریر کیا گیا ہے ان کی بابت تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ اکابر اپنی مثال آپ تھے اور ان سے متعلق اہل علم و دانش کی رائے ہر دور میں اعلیٰ و ارفع رہی ہے۔ ان افراد کی علمیت قابلیت کا شہرہ دانگ عالم میں رہا ہے۔ عرب و مصر اور عراق کے علماء بھی ان اکابر کی صلاحیت و آفاقیت کے مقرر رہے ہیں۔

رسالہ: بزم سہارا : ماہ جون ۲۰۱۲ء کا شمار لائق مبارکباد ہے جس میں پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی کے مضمون، بلگرام تاریخی وتہذیبی پس منظر میں شائع کیا۔ اہل علم و دانش کو نئی آگاہی سے روشناس کرایا۔ پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی کی محنت، لگن، تحقیق اور نگارش کو سلام کرتا ہوں کہ اس صدی میں یہ پہلا مضمون ہے جو آپ کے رسالہ میں بلگرام سے متعلق شائع ہوا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل بلگرام اپنے اکابر بلگرام سے متعلق گاہے بگاہے اس طور پر مضامین کی اشاعت کرتے رہیں۔ یہ سچ ہے کہ قلم اٹھتا ہے تو نقص ہی نہیں۔ مشاہدہ کی کمی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس سے نفس مضمون پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ مضمون کی صحت بھی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں چند امور لائق توجہ و صحت ہیں:

۱- شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی سے متعلق میری دانست میں سب سے عمدہ اور محققانہ مضمون بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ہے۔ اسے پیش نظر رکھنا تھا۔

۲- صفحہ ۱۷، کالم ۲ پر علم و ادب کے ذیل میں مرتضٰی زبیدی بلگرامی کا نام لکھا گیا ہے جب کہ اس نام کا کوئی بزرگ بلگرام میں نہیں گزرا، دراصل ان بزرگ کا نام نامی سید علی مقتدیٰ ابن سید محمد بلگرامی تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۱۴۵ھ میں بلگرام میں ہوئی تھی۔ علم کا شوق ورثہ میں پایا تھا۔ ۱۹ سال کی عمر میں حج کے لیے (۱۱۶۴ھ) تشریف لے گیے۔ بعدہٗ یمن کے قصبہ زبید میں قیام فرمایا۔ اور شیخ عبدالخالق زبیدی سے علم حدیث کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اپنی علمی صلاحیت و قابلیت کے سبب علماء زبید کے نزدیک ماہرین علم میں شمار ہونے لگے۔ یہاں تک کہ القاموس (عربی لغت) کی دس جلدوں میں شرح رقم فرمائی جس کو: تاج العروس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قصبہ زبید کے طویل ایام میں مقامی علماء نے آپ کا نام علی مقتدیٰ کے بجائے مرتضٰی حسینی بلگری زبیدی سے مشہور کر دیا۔ یہاں تک کہ بعمر ۴۰ سال سے زائد

گزرنے کے بعد آپ مصر تشرف لے گیے۔ وہاں کے اہل علم حضرات نے آپ کی علمی صلاحیت سے اور رشد ہدایت کے سبب ''ابوالفیض'' کا لقب بخش دیا۔ مشہور بات ہے کہ سلطان ترکی عبدالحمید خان اول اور محمد علی پاشہ صدر وزارت مصر نے آپ سے علم حدیث کے درس لیے یہی سبب ہے کہ شاہان مصر، یمن روم اور زنجبار کے افراد آپ کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ سید علی مقتدیٰ بلگرامی (سید مرتضیٰ حسین بلجرامی زبیدی) نے غالباً ۱۲۰۲ھ میں مصر میں رحلت کی اور مسجد کردی کے قبرستان، سیدی رقیہ میں آپ کی تدفین ہوئی۔ علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی نے ماثر الکرام میں آپ کی بابت تفصیل سے تحریر کیا ہے اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی نے بزم سہارا ماہ جون ۱۲ء کے صفحہ ۲۲ پر خان بہادر سید جان ترمذی بلگرامی کی بابت جو معلومات فراہم کی ہیں، اس ذیل میں سب سے پہلے سید جان بلگرامی کا شجرہ ملاحظہ کیا جائے:

اصلح بن غلام نبی پردل علی

میرن جان — سید جان — بسئی بی بی — نورالنسا — سمیع بی بی

یعنی ۲ لڑکے اور ۳ لڑکیاں اصلح علی کی تھیں۔

بسئی بی بی کی شادی مہدی حیدر بن علی حسین سے ہوئی۔ (بعد وفات بسئی بی بی)
نورالنساء کی نسبت علی حسن بن داوٴد علی حاتم زئی سے ہوئی۔

سید میرن جان کی نسبت سکینہ بنت دلدار حیدر سے ہوئی۔ جن سے صرف ایک بیٹی اولاد فاطمہ ہوئی۔ جس کی شادی محمد رضا سے ہوئی۔ سید جان بن اصلح کی شادی حیدری بیگم بنت دلدار حیدر بن علی حسین بن شہامت علی سے ہوئی۔ جن سے محمد رضا اور محمود رضا تولد ہوئے۔ محمد رضا کا رشتہ اولاد فاطمہ بنت سید میرن جان سے ہوا، محمود رضا کی شادی منضہ بیگم بنت ابن حیدر سے ہوئی۔ ان دونوں بھائیوں کی نسل بارآور ہوئی شجرہٴ روضة الکرام کے صفحہ ۵۲ پر سید جان کی اہلیہ کا نام صاف طور پر حیدری بیگم تحریر ہے، مگر صاحب مضمون پروفیسر جعفر رضا بلگرامی نے صفحہ ۲۲ سطر ۸ پر: صحیح: یا خورشید بی بی لکھا ہے۔ یہ خورشید بی بی کس کی بیٹی تھیں؟

اس کا حوالہ درکار ہے۔

اس تفصیل کے سوا ایک اور اہم بات لائق توجہ ہے کہ اصلح علی بن غلام یحییٰ بن پُر دل علی کے بیٹے سید جان کے دوسرے بیٹے محمود رضا کے ۴ بیٹوں میں سے محمد احمد کے یہاں بھی دو بیٹے ہوئے۔ جن کے نام میرن جان اور سید جان رکھے گئے۔ مگر نسل ان کی آگے نہ چلی۔ اس کے علاوہ ان کے جد اعلیٰ پر دل علی بن حسین علی عرف گھورا کے، تعلق صراحت کے ساتھ شجرہ روضۃ الکرام میں یہ عبارت تحریر ہے کہ۔ سید پر دل علی کی زوجہ قبیلہ سے اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی ان کی قصبہ موہان میں شیخ سراج الدین علی قاضی القضاۃ (شہر کلکتہ) سے ہوئی اور کل اولادیں انہیں بیوی سے ہیں۔ اس طرح پر دل علی بن حسین علی عرف گھورا کی اولادیں، خاندان بلگرام سے باہر کی شے ہوگئیں۔

خان بہادر سید جان سے متعلق جو معلومات پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی نے مہیا کی ہیں۔ ان کا کوئی حوالہ موصوف نے نہیں دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ سید جان نے کواتھ کا سفر کیا اور وہاں کسی بنئے بقال سے رابطہ کیا۔ کواتھ صوبہ بہار میں اس نام کا کوئی فرد (میری دانست یں) وہاں باشی نہ ہوا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پُر دل علی کی کل اولادوں کا رشتہ ازدواج بلگرام میں ہوا۔ اور آپس ہی میں رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔ یہاں تک کہ اسی دیار کی خاک کا مسکن بنے۔ جہاں تک خان بہادر جان کی شخصیت کا تعلق ہے، ان کے جو حالات روضۃ الکرام مطبوعہ ۱۹۲۰ء میں درج ہیں۔ ان کی عبارت ملاحظ ہو۔

"میر سید جان (خان بہادر) ابن اصلح علی: آپ ذی علم اور صاحب اقتدار بزرگ تھے۔ طبیب بھی تھے مگر اس طرف توجہ نہ فرمائی پہلے فورٹ ولیم کالج میں انگریز طلباء کو عربی و فارسی کی تعلیم دینے کے لیے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مسٹر ہنری میرس ایلیٹ آپ کے شاگردون میں سے تھے۔ جب مسٹر ایلیٹ کا تبادلہ یوپی کا ہوگیا تو آپ نے میر سید جان کو بریلی میں تھانیدار مقرر کر دیا۔ بعد میں آپ داروغہ نمک، تحصیلدار میرٹھ، کوتوال شہر بریلی، سرشتہ دار بورڈ مال الہ آباد مقرر ہوئے۔ اور پھر وہاں سے میر منشی نواب گورنر جنرل بہادر مقرر ہو کر کلکتہ چلے گیے۔ ۱۸۴۷ء میں خطاب "خان بہادر" ملا۔ آپ نے بہت سی تصانیف عربی، فارسی، علم طب اور تفسیر میں چھوڑیں سرکار اودھ سے آپ کو ایک ہزار سات سو روپیہ سالانہ کی معافی بھی ملی۔ جس کی آمدنی سے آپ نے درگاہ حضرت عباسؑ علمدار کے نام سے تعمیر کرائی اور اس کے مصارف کے لیے وقف کر دی۔ جس سے عزاداری امام مظلومؑ آج تک نہایت اہتمام سے

ہوتی ہے۔ آپ نے ۱۸۸۰ء میں بمقام لکھنؤ انتقال فرمایا۔ لاش بلگرام لاکر آپ کی بنا کردہ درگاہ حضرت عباسؑ میں دفن کی گئی۔ (ص ۲۳۵، روضۃ الکرام)''

اس تحریر سے صاف طور پر عیاں ہے کہ...... سرکار اودھ سے آپ کو ایک ہزار سات سو روپے سالانہ کی معافی (زمینداری پر) بھی ملی۔ جس کی آمدنی سے آپ نے درگاہ حضرت عباس علمدار کے نام سے تعمیر کرائی اور اس کے مصارف کے لیے وقف کر دی۔ اس کے برخلاف پروفیسر جعفر رضا بلگرامی نے صفحہ ۲۳ سہارا شمارہ جون ۲۰۱۲ء میں تحریر فرمایا ہے کہ ''الغرض منشی سید جان بلگرامی تیس برس مدت مقررہ کمال خیر خواہی کے ساتھ گراز کر ریٹائر ہوئے تو گورنر جنرل نے اس کی پنشن مقرر کر دی اور خان بہادر کا خطاب عطا کیا'' ان کی خیر خواہانہ اور مخلصانہ خدمات کے پیش نظر جب گورنر جنرل نے پوچھا کہ اب تم گھر پر بیٹھ کر کیا کرو گے؟ تو سید جان نے عرض کیا کہ درگاہ حضرت عباسؑ بنواؤں گا اور اس کا انتظام کروں۔ جو کچھ سرکار سے میری نوکری کے معاوضہ میں مجھے عطا ہوا ہے، سب اس عمارت پر صرف کردوں گا، گورنر جنرل نے ۱۰۰ بیگھے آراضی درگاہ عباس کی تعمیر کے لیے عنایت کی۔ (ص ۲۳، رسالہ سہارا جون ۲۰۱۲) اس بیان کا حوالہ درکار ہے۔

اس عبارت کے آخری مرحلہ پر جعفر رضا بلگرامی نے خان بہادر سید جان کی اہلیہ کا پھر ذکر کیا۔ وہ حد نگاہ میں رکھنے کے لائق ہے۔ ''خورشید بی بی اہلیہ سید جان تلک، پیشواز پہن کر نشان (جھنڈے) کے نیچے ناچتی تھی اور فرماتی تھیں کہ میں تو علی کی پتریا ہوں''۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عورت ''طوائف'' تھی ورنہ کوئی خاندانی خاتون نہ تو تلک لگا سکتی ہے اور نہ ہی سر عام: ناچ، سکتی ہے پھر ایسی عبارت سے خان بہادر سید جان کی حرمت پر حرف بھی آیا۔ اس کا خیال رکھنا لازم تھا۔ اس کے سوا ہر جگہ پروفیسر صاحب نے خورشید بی بی کو سید جان صاحب کی اہلیہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کے برعکس ان کی اصلاً اہلیہ حیدری بیگم کا تذکرہ اشارتاً بھی نہیں کیا ہے، جب کہ سید جان کے دو بیٹے محمد رضا اور محمود رضا کا ذکر کیا ہے۔ اس عبارت سے تو یہ دونوں بچے اہلیہ خورشید بی بی کی نسل سے ہوئے جو قطعاً غلط ہے ان کی ماں ہر اعتبار سے خاندان سید جان کی جان تھیں اور پردہ دار خاتون!! جو حیدری بیگم تھیں۔

سب سے آخر میں خان بہادر سید اولاد حیدر فوق بلگرامی کی بابت عرض ہے کہ موصوف نے جب رحلت کی ہے تو اس وقت میری عمر ۱۷-۱۸ سال کی تھی۔ فوق وادے سے راقم۔ نے بہت سی معلومات حاصل کی تھیں۔ موصوف کو میرے پرنانا سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

شاگرد مرزا غالب دہلوی اور مرزا دبیر لکھنوی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ اور جدی سید آل حسین بلگرامی رئیس اعظم کواتھ (بہار) سے بے حد اخلاص تھا۔ فوق بلگرامی کی علمیت اور محققانہ نظر کا کوئی فرد اُن دنوں کواتھ کے اندر نہ تھا۔ مرحوم جب ممبر پر مرثیہ خوانی کے لیے تشریف لے جاتے تو اہل علم ودانش ہمہ تن گوش ہوکر، اُن کا کلام سنتے اور داد دیا کرتے، جدی فوق بلگرامی کا انداز اور تخاطب کا جدا انداز تھا ذہن رسا مزاج سادہ اور گفتگو عالمانہ کرتے تھے۔ صاحب تصانیف فرد ہونے کے باوجود کبھی تکبر نہ کیا اور نہ ہی اپنی علمیت یا ہمہ دانی کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے مراثی کے سوا آپ کے سلام اور نوحہ جات کثیر تعداد میں تھے۔ ان سلام و نوحہ جات میں سے کم وبیش ۲۵-۳۰ معہ تاریخ و ماہ وسنہ کے راقم کی کشکول میں ہیں۔ تاریخ اور سنہ سے ان کے کلام کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مراثی موصوف کے بے شمار تھے جو اہل خاندان کے تصرف میں رہے اور پھر ضائع ہوگئے۔ چند مراثی راقم کے پاس اور کچھ مراثی پروفیسر سید حسن عباس رضوی صاحب سربراہ شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی کے کلکشن میں بھی شاید ہیں۔ راقم نے: اکابر بلگرام حصہ دوم مطبوعہ ۲۰۱۱ء میں جدی سید اولاد حیدر فوق بلگرامی پر مختصر حالات وخدمات پر تقریبا دس بارہ صفحات میں ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی وفات سے متعلق تفصیلی حالات قلم بند کردیے ہیں۔ جن کی شہادت اہل خاندان دے سکتے ہیں کہ مولانا سید رضا صاحب قبلہ امروہوی کے سوا اور بہت سے علماء کرام ہر سال مدرستہ الواعظین سے ماہ رمضان المبارک میں بر مکان سید آل حسین صاحب بلگرامی تشریف لاتے اور آپ ہی کے مکان پر مقیم ہوتے، نماز جماعت کا اہتمام بھی اسی مکان آل حسین میں ہوتا۔ عید کی نماز بر مکان نواب سید نورالحسن کے کشادہ صحن میں ہوا کرتی تھی۔ جس میں کواتھ اور کبھی کبھی سمری کے افراد بھی شریک جماعت ہوا کرتے، خود جدی فوق بلگرامی اور علی رضا وادے وغیرہ اپنے مکان جو فاصلہ پر واقع ہیں۔ نماز عید اور جمعہ میں شرکت کے لیے زحمت کرتے کہ کواتھ میں اور کوئی مکان ایسا نہ اس وقت تھا اور نہ ہی اب ہے، جس میں کسی معتبر فرد کو قیام کرایا جاسکتا۔ پروفیسر جعفر رضا بلگرامی صاحب نے کیسے یہ عبارت لکھی کہ: ''ہر سال نجم الحسن صاحب کراروی رمضان میں نماز پڑھانے کواتھ آتے تھے اور پورے ماہ فوق صاحب ہی کے یہاں قیام کرتے تھے۔ (ص ۲۵-۲۶، سہارا)'' یہ واقعہ کی سچائی کے خلاف بات ہے۔ اس لیے کہ میں نے ابتدائی درسیات فقہ مولانا نجم الحسن صاحب کراروی سے ماہ رمضان کے قیام میں اپنے مکان پر حاصل کیں اور مولانا ہر وقت میرے شغف کو دیکھ کر، شریک گفتگو

ہوتے تھے۔ اس لیے نہ مجھے کسی کے گھر جانے کی ضرورت تھی نہ مولانا کو زحمت زنی کرنی پڑتی تھی۔ بہر کیف جدی فوق بلگرامی کے وفات کی تفصیل ۲۰۱۱ء کی تحریر کردہ اور شائع شدہ نظر قارئین ہے۔ اس عبارت کے بعد محقق خود فیصلہ کرے کہ حق بیانی کس نے کی ہے۔ راقم کی تصنیف اکابر بلگرام حصہ اول کے ۳۴۳ تا ۳۴۹ ملاحظہ ہوں۔

......ذکر حیات وخدمات ملی وادبی اور تحقیقی کے بعد ذکر ممات بھی تفصیل سے بیان کرنے کی مستحق ہے۔ مگر اس سے قبل عرض کردوں کہ آپ کو خدا نے دو بیٹے سید امتیاز حیدر اور کمال حیدر بلگرامی عطا کیے تھے۔ ان کے سوا ایک بیٹا ممتاز حیدر بھی تھا ان کے علاوہ اعانت فاطمہ۔ مقبول فاطمہ، عشرت فاطمہ، وقار فاطمہ، اور تلطف فاطمہ۔ بیٹیاں بھی ہیں۔ سید کمال حیدر بلگرامی کواتھ ہائی اسکول میں، بحیثیت استاد مقرر تھے مگر تینوں بھائیوں میں سے کوئی بھی ادیب یا شاعر نہیں تھا۔ البتہ کمال حیدر صاحب اپنے والد فوق بلگرامی کی طرح تحت لفظ بے حد خوبی سے پڑھتے تھے۔ امتیاز حیدر صاحب کو اس کا شوق نہ تھا مگر ان کے بیٹے سید ریاض حیدر بلگرامی بہت عمدگی اور خوبی سے کبھی اپنے دادا اور کبھی میر انیس و مرزا دبیر اور میر وحید کے مراثی بے حد خوش اسلوبی اور فنی اعتبار سے مرثیہ خوانی کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ علمی وادبی ذوق سے اب یہ خانوادہ محروم ہو گیا ہے۔ جب کہ فوق بلگرامی مرحوم مراثی اور قصائد کے بادشاہ تھے۔ ممبر پر مرثیہ جب پڑھتے تو دو تین سو بند بہ آسانی پڑھتے تھے۔ اور مجمع ان کے کلام سے بلکہ ادائیگی سے متاثر ہوتا تھا، رجز سے کم مگر بکا کا تاثر زیادہ ہوتا تھا۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر تھا، ممات فوق بلگرامی کا۔ واقعہ یہ ہے جدی سید آل حسین بلگرامی محلہ گڑھ کواتھ (بہار) کے یہاں عرصہ سو سال سے مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے ماہ رمضان کی خاطر کوئی نہ کوئی عالم دین ضرور آتا تھا۔ ادھر دس بارہ سال سے مولانا سید نجم الحسن صاحب کراروی تشریف لایا کرتے تھے۔ مگر ۱۹۴۲ء کے ہنگامہ خیز حالات، توڑ پھوڑ اور ملکی خلفشار اور کویٹ انڈیا کے اعلانیہ کے سبب ریل کا سلسلہ قطعاً بند تھا۔ پہلی رمضان المبارک سے ۲۱ رمضان المبارک کی صبح تک کوئی عالم دین وارد کواتھ نہیں ہو سکا۔ مگر صبح شام حضرت فوق بلگرامی دریافت حال ضرور کرتے۔ اُس روز بھی حضرت نے دریافت کیا اور ان کی نفی میں جواب ملا۔ مگر تھوڑی دیر بعد مولانا نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی تشریف لے آئے۔ موصوف کے بڑے صاحبزادے امتیاز حیدر نے باپ کو مطلع کر دیا۔ امتیاز صاحب کا بیان ہے کہ ابا نے جیسے ہی سنا، پہلا جملہ اُن کے منہ سے یہی نکلا، ''شکر ہے'' اور پھر کلمہ پڑھتے

ہی روح رخصت ہوگئی۔ ہم حیرتی بن گئے اور گھر بھر پر سوگ طاری ہوگیا۔ بہرحال جیسے ہی میرے والد سید ابو محمد صاحب بلگرامی کو انتقال فوق بلگرامی کی خبر ملی، تو مولانا کو مطلع کیا گیا۔ مولانا نے کچھ لمحہ بعد والد ماجد سے کہا۔ آج روز جمعہ ہے۔ اگر قبل نماز جمعہ تدفین ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ والد نے مولانا سے کہا اس کا فیصلہ تو ان کے صاحبزادگان ہی کر سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد والد نے ایک ملازم کے ذریعہ امتیاز حیدر صاحب کو بلایا، وہ تشریف لائے۔ تعزیتی کلمات کے بعد والد نے مولانا کی رائے سے مطلع کیا۔ انہوں نے اپنے بھائی سے صلاح کرنے کی بات کہی اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا اثبات میں جواب آگیا۔ اور یہ کہ تدفین امام بارگاہ میں ہوگی۔ والد نے دو تین پیادے روانہ کرائے اور قبر کے لیے آدمیوں کو ہدایت کردی۔ اس انتظام کے بعد واقعہ یہ ہے کہ قبل جمعہ ہی تدفین عمل میں آئی۔ مگر حیرت اب بھی ہے کہ صبح ۷ بجے تک جو فرد حیات تھا وہ چند لمحہ بعد فنا کی سمت روانہ ہوگیا۔ اور شکر خداوندی کرتا ہوا ملک عدم کو سدھار گیا۔ ۲۱ رمضان المبارک کی تاریخ سے پوری امت مسلمہ آگاہ ہے۔ یہ واقعہ اگست ۱۹۴۲ء کا ہے۔ دن گزر گیا، شام کو افطار کے بعد میرے دادا سید آل حسین بلگرامی نے مولانا نجم الحسن صاحب سے دریافت کیا کہ ایسی عجلت کی ضرورت کیا تھی؟ مولانا نے جواباً عرض کیا دراصل میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ موصوف نے نماز صبح ادا کی ہوگی، اب ان پر نماز تو واجب نہ رہی مگر احتراماً اگر قبل نماز جمعہ تدفین ہو جائے تو یہ لمحہ بھی گذر جائے گا۔ اور دیکھیے قدرت نے سارا کام اس تنگی وقت کے باوجود مکمل کرادیا۔

شرعی مسائل سے متعلق نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس قدر جلد تدفین سے اہالیان کواتھ کے سوا اقربا کو کس قدر راحت ملی ہوگی۔ رمضان المبارک کے روزے اور گھر میں میت رہے تو ہوش و حواس کہاں رہیں گے۔ اس کا تصور کون کر سکتا ہے؟ بہر کیف ۲۱ رمضان المبارک کی تاریخ، جمعہ کا دن، زوال سے قبل تدفین کا عمل میں آجانا، اسے کیا کہا جائے گا؟ بقول فوق بلگرامی۔

اے فوق چلے ہم تو رہتی ہوئی دنیا سے
احباب جو مل جائیں، کہنا کہ خدا حافظ

رازؔ بلگرامی نے تاریخ وفات کہی تھی اس کا یہ شعر قابل ملاحظہ ہے۔

جعفری ملت میں جو تھا اولین اہم قلم
سو گیا وہ کہتے کہتے داستان اہلبیت

اس باب میں خود فوق بلگرامی کے مرثیہ کا اختتامیہ ملاحظہ ہو۔

اے فوق بس خموش بہت طول ہوگیا — انجام نظم تازہ کا معمول ہوگیا
میں نے کہا پسند تو مقبول ہوگیا — حسن صلہ رسول سے موصول ہوگیا
اس کے صلے میں تجھ کو خلعت پہنائیں گے — محشر میں ہم کو شافع محشر بچائیں گے

(۸؍رجب روز یکشنبہ ۱۳۵۷ھ)

فوق بلگرامی کے مراثی۔ نوحہ جات، اور قصائد کی صحیح تعداد کوئی مقرر نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ اُن تک ہی نہیں رہا۔ بلکہ اہل ذوق ان کے کلام اور مراثی کو مجالس میں پڑھنے کی خاطر مانگ لیتے مگر واپس نہیں کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خاندان میں کوئی گھر ایسا نہیں ہے، جس کے یہاں فوق بلگرامی کے مراثی، نوحہ جات نہ ہوں۔ آپ کے نوحہ جات کا طویل سلسلہ ہے جو آرا کواتھ حیدرآباد بلگرام اور دیگر مقامات کے اہل بلگرام کے گھروں میں نہ ہوں۔ اور ہر موقع محل کے نوحہ جات آپ نے منظوم کیے ہی۔ مثلاً ایک نوحہ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شمع حریم قبلتین، خیر النساء کے دل کے چین
ہائے حسینؑ، حسینؑ، حسینؑ وائے حسینؑ حسینؑ

رقت والمیہ بیانیہ الفاظ ایسے اس نوحے میں سموئے گئے ہیں جس سے ہر دل متاثر ہوتا اور بے اختیار گریہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آپ کے مراثی کی تعداد کسی عنوان سے بھی جیسا کہ اوپر بیان کیا ہے، بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ کم و بیش پچیس مراثی ضرور آپ کے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فوق بلگرامی کی تصانیف کو دوبارہ شائع کرایا جائے۔ موصوف کی تصانیف کی مختصر تفصیل پیش خدمت ہے۔

تصانیف علامہ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی اعلیٰ اللہ مقامہ

نمبر	نام کتاب	جلد	تفصیل
۱-	اسوۃ الرسولؐ	۵	حیات طیبہ رسولؐ اکرم
۲-	السیدہ	۱	حیات فاطمہ زہراؑ
۳-	سراج المبین	۲	حیات مولا علی ابن ابی طالبؑ
۴-	سرو چمن	۱	حالات امام حسن علیہ السلام

۵-	ذبح عظیم	۱	حالات امام حسن علیہ السلام
۶-	صحیفۃ العابدین	۱	حالات علی بن حسین علیہ السلام
۷-	مآثر الباقریہ	۱	حالات امام محمد باقر علیہ السلام
۸-	آثار جعفریہ	۱	حالات امام جعفر صادق علیہ السلام
۹-	علوم کاظمیہ	۱	حالات امام موسی کاظم علیہ السلام
۱۰-	تحفۃ رضویہ	۱	حالات امام موسی رضا علیہ السلام
۱۱-	تحفۃ المتقین	۱	حالات امام محمد تقی علیہ السلام
۱۲-	سیرت النقی	۱	حالات امام علی نقی علیہ السلام
۱۳-	العسکری	۱	حالات امام حسن عسکری علیہ السلام
۱۴-	در مقصود	۱	حالات امام مہدی موعود علیہ السلام

ان سوانحی تصانیف ائمہ کے سوا المحاصل و الاضداد اور تاریخ صوبہ بہار و اڑیسہ کے سوا آپ نے قرآن پاک کے بیس پارہ کے ترجمے بھی فرمائے تھے۔

سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے کہ وہ نثر کے سوا شعر کے بھی ماہرین اور مستند شعراء بہار و بلگرام میں شمار کیے جاتے تھے۔ کئی قصائد و مراثی ان کی غیر مطبوعہ افراد بلگرام کے بستوں میں موجود ہیں۔ خود ان کہ ذریات کے پاس کچھ مراثی محفوظ ہیں، جو موقع محل کے اعتبار سے ایام محرم میں خصوصی تواریخ کو مجالس میں پڑھے جاتے ہیں۔ چودہ ساغر اور گلدستہ مومنین آپ کی مقبول کتب ہیں۔

تصانیف کی ان تفصیلات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو اللہ نے قدرت کلام اور صلاحیت کس حد تک عطا کی تھی۔ میں نے چند مرثیے اپنے اعزا اور والد ماجد سید ابو محمد بلگرامی کے مراثی کے بستے میں یکجا دیکھے ہیں۔ اگر موقع ملا تو ان کی فہرست سے بھی آگاہی دی جائے گی۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید حسن عباس صاحب رضوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) کام کر رہے ہیں خدا کرے ان سے بھی مدد مل جائے۔ بہر حال فوق بلگرامی کی شخصیت عبقری تھی۔ بے حد سادہ مزاج، خوش گفتار اور صالح قلم بزرگ تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ اور جوار ائمہ میں جگہ عطا کرے۔ آمین

علامہ سید اولاد وحید فوق بلگرامی کے ان حالات کے بعد ان کے مراثی جو مختلف جگہ پھیلے ہوئے ہیں، اس وقت صرف ایک مرثیہ کے چند بند اور مقطع پیش خدمت ہے۔ اس سے

فوق بلگرامی کی شخصی اور علمی ہئیت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ویسے ان کے کلام مراثی اور قصائد ونوحہ جات اور قطعات کا ایک مجموعہ، خود فوق کے دست وقلم کا منظر عام پر آنے والا ہے، یہ اپنی نوعیت سے جدا بات ہوگی۔ اس وقت چند بند ملاحظہ ہوں۔

نئے رنگ کی پھر طبیعت ہوئی ہے
طبیعت میں جدت ودیعت ہوئی ہے
ودیعت کی ہادی مشیعت ہوئی ہے
مشیعت کی پیرو شریعت ہوئی ہے

☆☆☆

شریعت میں ہے حکم حمد خدا کا
وہ حمد خدا ذکر ہے مصطفیٰ کا

☆☆☆

خوشا عزت و رتبہ ہائے محمدؐ
کہ حمد خدا ہے ثنائے محمدؐ
ثنائے محمدؐ دلائے محمدؐ
دلائے محمدؐ رضائے محمدؐ
رضائے محمدؐ رضا کبریا کی
یہ توقیر ہے اشرف الانبیا کی

☆☆☆

جو پوچھو کہ یہ کیوں اشرف الانبیا ہے
کہ سب انبیوں میں انہیں چن لیا ہے
نبوت کو ختم ان پہ حق نے کیا ہے
لقب رحمت العالمین کا دیا ہے

☆☆☆

شفیع گنہگاران عالم یہی ہیں
کہ رحمت کی شان مجسم یہی ہیں

☆☆☆

فزوں عقل سے ہے وقار محمدؐ
خدائی میں ہے اختیار محمدؐ

☆☆☆

اذاں سنتے ہو صبح اور شام یکجا
خدا و محمدؐ کا ہے نام یکجا
گرے کنگر طاق کسرا پھٹ کر
لرزنے لگے خوف سے قصر قیصر
عجم کی ہوئی بھٹیاں سرد یکسر
اذان بت لگے دینے اللہ اکبر

☆☆☆

منادی پھری یہ زمین و زمان میں
کہ تشریف لائے محمدؐ جہاں میں

☆☆☆

کوئی مثل ان کے جہاں میں نہیں ہے
حبیب خدا اشرف المرسلینؐ ہے

شفیع امم رحمت العالمین ہے　　یہی مہبط جبرئیل امین ہے
یہ ان کے لیے حق سے سامان　　پروں پر ملک لے کر قرآن آیا

آپ کے جو مراثی ہیں ان کے تعداد کی نشاندہی کون کرسکتا ہے؟ بکھرے اوراق پریشان حال میرے نیرے گھروں میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مجالس میں ان گھروں میں ان مراثی کا ورد ہوتا ہے اور اہل ذوق مستفید ہوتے ہیں۔ مآل مجلس بھی حاصل ہوتا ہے اور یہی مقصد مرثیہ ہے۔

کاش فوق بلگرامی کے جائز ورثا اُن کے علمی، فقہی اور علمی اور عالمانہ تحریروں کا احترام کر کے اشاعت کی سمت توجہ دیں۔ اگر وہ خود اس علمی فریضہ کو ادا نہ کرسکیں، تو راقم کو وہ کتب حوالے کر دیں، اور جو رقم مقرر کریں، مناسب طور پر حاصل کر لیں۔ اس طرح ان تصانیف کی دوبارہ شائع ہونے کی سبیل پیدا ہو جائے گی اور ان کو مقبول عام کرنے کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی۔

میں اب سے دس بارہ سال قبل میرے مضمون مطبوعہ پر ایک پروفیسر نے اعتراض کیا، مدیر رسالہ کتاب نما نے مجھے مطلع کیا تو محقق، ناقد، مفسر اور واقعہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اصل حال سے اجتناب نہ کرے، کہ صداقت بیانی ہی کسی تحریر کی اصل ہوتی ہے۔ یہ طویل تحریر اسی لیے حد تحریر میں لائی کہ اہل علم اور نئی نسل کو جو علمی سرمایہ میسر آئے گا۔ وہ اسی کو ماخذ بنائے گا۔ خواہ غلط بیانی ہی کیوں نہ کی گئی ہو۔ لفاظی کو ہی نشان راہ کیوں نہ بنایا گیا ہو۔ لہٰذا صحت بیان ضروری ہے، یہ تحریر اسی خیال سے ملاحظہ کی جائے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ''کتاب نما'' دلی نے مجھے مطلع کیا۔ جواباً کہا کہ ''جب اعتراض شائع ہوگا تو دیکھوں گا'' اگلے شمارہ میں وہ اعتراض شائع ہو گیا۔ میں نے بہت نرمی سے جواب دیا۔ کہ اگر معترض براہ راست مجھ سے یا اپنے والد سے دریافت کر لیتے تو ان کو اعتراض کی نوبت نہ آتی۔ ویسے معترض کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ہی ان بزرگ کا مکان واقع ہے۔ جس سے وہ ناواقف تھے۔ مقصد یہ کہ تحقیقی امر میں صداقت بیانی کو اولیت حاصل ہونی چاہیے۔

علمی تراشے/ نامے مرے نام

خط کی بھی کیا بات ہے، دور کی سوغات ہے
نصف ملاقات ہے، بھیجیے اے یار خط!

قدر بلگرامی

غالب دہلوی کے نامور شاگرد اور لکھنؤ یونیورسٹی کے مقبول انام استاد بلگرام کے فرد فرید سید غلام حسنین قدر بلگرامی نے اپنے ایک مکتوب میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کو دَرج بالا مصرعِ تحریر کیے تھے۔ اسے ہی میں نے سرنامہ بنانا پسند کیا۔ اور آج کی صحبت میں اپنے نام ہزار ہا خطوط سے، جو مشہور اور دانا افراد نے مجھے لکھے، اُن میں سے بروقت محض چند خطوط پیش کیے جاتے ہیں۔

۱- قاضی عبدالودود صاحب جو اُردو ادب کے نامور محقق، مؤرخ اور نقاد تھے ان کی شخصیت کی تابنا کی اور ساتھ میں موصوف کی سخت گیری، پُرسش اور اُسلوب نگاری کا ہر قاری واقف و معترف تھا۔ موصوف کا خط بنام راقم ملاحظہ ہو:

خط: ۵/ اکتوبر ۱۹۶۹ء علی گڑھ

مشفق مکرم
تسلیم نیاز

آپ کی بیاض شعلہ صاحب کی بیاض نمبر ۱۰ علی پور روڈ میں سہواً چھوٹ گئی، اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ میرا پَرس بھی جس میں سب روپے تھے، چھوٹ گیا تھا۔ اس کا خیال اسٹیشن پہنچ کر آیا۔ بیاض کا حال علی گڑھ آ کر معلوم ہوا۔

آپ براہ کرم یہ خط دکھا کر (قلم زد) نورالدین احمد صاحب کے یہاں جائیں اور وہ بیاض تلاش کر کے لے لیں۔ یہ خط نورالدین صاحب کو دکھانا کافی ہوگا۔ بڑا افسوس ہے کہ یہ زحمت دینی ہوئی۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ اپنے حالات لکھ کر بھیج دوں گا۔

اس خط کی رسید عنایت ہو۔
عبدالودود

کارڈ کی پشت پر پتہ:
جناب سید مرتضیٰ حسین بلگرامی (بزبان اردو)

اردو ڈپارٹمنٹ، دلی یونیورسٹی، (دہلی)

نوٹ: بیاض سے مقصود وہ کشکول ادبی ہے، جس میں شعرا و ادبا سے ان کے حالات قلم بند کراتا تھا۔ قاضی صاحب نے اسے ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا تھا کسی ادیب سے مضمون لکھوانا آسان ہے، مگر اُس کی سوانح کی خانہ پری دشوار تر اَمر ہے۔ مگر آپ اہل بلگرام ہی ایسا علمی کام کرنے کی سوچ سکتے ہیں۔

نورالدین احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا اور میئر دہلی کارپوریشن بہت باذوق اور علمی شخصیت کے مالک تھے۔ قاضی صاحب اور نورالدین صاحب ہم جماعت لندن میں بیرسٹری کے طالب علم رہے تھے۔ اسی لیے قاضی صاحب کا دہلی میں قیام نورالدین صاحب کے یہاں رہتا تھا۔ جب کبھی اطلاع ملتی کہ قاضی صاحب ان دنوں دہلی میں ہیں تو ملاقات ہو جاتی اور بہت سے مسائل پر گفتگو ہوتی۔ نورالدین صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان جھڑپ بہت پُر لطف ہوا کرتی۔ جو تفصیل اور وقت کی طلب گار ہے۔

خط:۲- کشمیر محلّہ، لکھنؤ ۱۳ر جولائی ۱۹۵۹ء

مکرمی تسلیم- عنایت نامہ کا شکریہ۔ جو شعر آپ نے دَرج فرمایا ہے میرے نزدیک مہمل اور صوفیانہ ہے، رات کو ہاتھا پائی میں دَامن چاک ہوا، ہنگامہ سحر پاک دامنی کھانے کو تارِ دامن مریم سے سیا جانا۔ کوئی بھی تک ہے؟

والسلام نیازمند اثرؔ

(پتہ بزبان اردو) بخدمت جناب مرتضٰی حسین بیدار بلگرامی پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی۔

ڈاک خانہ لکھنؤ کی مہر: ۱۳ر جولائی ۱۹۵۹ء وقت: ساڑھے ۷ بجے صبح

تشریح: ریاض خیر آبادی کا شعر ہے:

سحر ہوتے وہ اپنا چاک دَامن لے کے بیٹھے ہیں
رفو کرنے کو تارِ دامنِ مریم نکلتا ہے!

اس شعر میں تضاد اور خلاف واقعہ بات نظر آئی تو حضرت اثر لکھنوی کو رجوع کیا۔ جس کا جواب موصوف نے ارسال کیا۔ لیکن نہ جانے کیسے حضرت اثر لکھنوی نے میرے نام کے ساتھ تخلص بیدارؔ کا اضافہ تحریر فرما دیا۔ جب کہ میں نہ شاعر ہوں نہ ہی کوئی میرا تخلص ہے۔

خط: ۳- نگار لکھنؤ   تسلیم!

مشاہدات میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن اور صاحب کے پاس ہے۔ اور وہ ۲۵ روپے فی کاپی طلب کرتے ہیں علاوہ محصول کے۔ کمیشن بھی نہیں دیں گے۔ نیاز فتح پوری

(پتہ بزبان اردو) سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، ادبی دنیا، ۴- ماریسن روڈ، علی گڑھ

مہر ڈاک خانہ لکھنؤ ۳۰ / دسمبر ۱۹۵۵ء، ساڑھے ۳ بجے سہ پہر)

خط: ۴- بارو زئی دوم، شاہجہاں پور، ۲۰ / جون ۱۹۶۳ء برادر مکرم، محبت نامہ ملا، جس دن سے آیا ہوں چارپائی نشین ہوں۔ آنے سے پہلے نزلہ ہوا تھا، رات بھر سفر کی خرابی اور تھکان اور بجلی کے پنکھے کی ہوا، گھر پہنچتے پہنچے بخار آ گیا اور اب بھی آ رہا ہے۔ نہ کہیں آ جا سکتا ہوں نہ کوئی کام کر سکتا ہوں اگر یہی عالم رہا تو آنا بھی بے کار سا ہو کر رہ جائے گا۔ علی گڑھ کی نمائش کی اصطلاح میں بس: فنگر ورک: ہرگز ر ہو گی، افسوس صد افسوس بلکہ صد ہزار افسوس۔

میری ایک حقیقی بھانجی ٹی. بی. کی مریض ہے وہ بریلی کے مشن اسپتال میں زیر علاج ہے۔ آپریشن ہونے والا ہے۔ میں اسے دیکھنے نہیں جا سکا ہوں۔ اس کا بہت قلق ہے۔ اب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واپسی میں ایک دن کے لیے بریلی اتر کر ہی دیکھ سکوں گا۔ ایک دن رام پور میں بہر طور رہنا ہے۔ یہ بھی واپسی میں ہو گا۔ اس لیے غالباً آپ کی فرمائش آم پوری نہیں ہو سکے گی۔ اور اس تفصیل کے بعد آپ تو خیر آلِ رسول ہیں مزید شیطان بھی کوئی ہو، تو معاف کر دے گا۔

تبصرہ نگار کی پسندگی کا شکریہ۔ دیکھیے یار لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں نے بہر حال تبصرے کے آداب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور صرف اعتراض نہیں کیے ہیں۔ مرتبین سے زیادہ کام بھی کیا ہے اور یہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کتاب پڑھ کر تبصرہ لکھا ہے۔

اور کیا حال ہے ظہیر صاحب آئے یا نہیں؟ پیر و مرشد کا صحیح پروگرام کیا ہے؟ علی گڑھ سے ہنوز کچھ نہیں آیا ہے آپ کے جواب کا سخت بے چینی سے منتظر ہوں۔ خصوصاً پیر و مرشد کے پروگرام کے سلسلے میں۔ یہ خط دیکھتے ہی جواب لکھ کر حوالہ ڈاک کر دیجیے۔ رشید

پتہ (بزبان اردو) جناب مرتضیٰ حسین بلگرامی، شعبۂ اردو، فیکلٹی آف آرٹس، دہلی یونیورسٹی، دہلی - ۶ - مہر کیمپس پوسٹ آفس، ۲۹ / جون ۱۹۶۳ء۔

خط: ۵ رضا لائبریری، رام پور، ۱۶ / اکتوبر ۱۹۶۲ء بلگرامی صاحب مکرم (سلام مسنون...... قلم زد) سنیوں کی رعایت سے سلام مسنون قبول ہو۔ کہیے قبول کیا۔

آپ کے فوری جہاد کا نتیجہ مجھے ۵/ اکتوبر کو بیمہ کی صورت میں مل گیا تھا۔ کس منھ سے شکریہ ادا کروں؟ پھر سوچتا ہوں کہ کے بار اَدا کروں گا؟ لہٰذا حساب دوستان دردل! برادرم! اب تو آپ لوگوں کو توبہ، توبہ! (لوگاں کو) دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ اِدھر یہ میر سوز پیر تسمہ پا بن کر گریباں گر ہو گئے ہیں خدا ہی ان سے رہائی دلائے تو ملے۔ ویسے اب خیال آتا ہے کہ اگر خواجہ صاحب یہاں ہوتے، تو خدا سے دعا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی (ہائے کس وقت میں یاد آئی ہے اور کس عنوان سے)۔

بھائی قمر صاحب کا بھی کوئی خط آیا؟ مجھے تو انھوں نے خواجہ صاحب کی تقلید میں بُھلا ہی دیا ہے۔ خیریت تو معلوم ہو جاتی۔ قِدوائی صاحب سے خدا ہی انتقام لے گا۔ آخر تک رسم پیام وسلام سے بھی شاد نہیں کیا۔ انھیں کیا بد دعا دے سکتا ہوں اس کے سوا کہ خدا کرے حمیدہ سلطان انھیں اپنا لے پا لک بنا لیں (آمین) آپ بھی کہیے (ثم آمین)۔

ہاں، جان اُردو بلکہ جانان ڈپارٹمنٹ کے متعلق کیا خبر ہے؟ مقصد یہ کہ قصیدہ، تہنیت کا انتظام کیا جائے یا قطعہ تعزیت کا اور اس امتیاز کی بھی کیا ضرورت ہے۔ جانبین میں سے ایک کے لیے تو قطعہ تعزیت کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟ ہائے رفیع احمد خاں نے کیا شعر کہا ہے:

اُبھرتا جاتا ہے جس زاویے سے ان کا حسن
اُدھڑتی جاتی ہے سیون مری (یا کسی) میانی کی

خط تاخیر سے لکھ رہا ہوں اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ خطا نموده دم چشم آفرین دارم:

رشید حسن

مکرر ظہیر صاحب کو ایک خط لکھا تھا جواب ندارد۔ ذرا میری طرف سے تقاضا تو کر دیجیے۔ نارنگ صاحب کے کئی خط البتہ مل چکے ہیں، آج ہی انھیں رجسٹرڈ خط بھیج رہا ہوں میں برابر انھیں کا کام کر کے اوراق بھیج رہا ہوں کہ کام نہ رُکے...... ظہیر صاحب سے بھی کہہ دیجیے گا۔

۲۔ فوری جہاد...... رشید صاحب کی تنخواہ ۲ ماہ سے نہیں مل سکی تھی اس کی منظوری UGC سے کوشش کر کے منگائی اور تنخواہ واگزار کرا دی۔

۳۔ پھر سوچتا ہوں کے بار اَدا کروں گا...... یعنی ہر مشکل تو مرتضٰی آسان کر دیتا ہے اس کا شکریہ ادا کرنا آسان نہیں۔ (یہ جملہ رشید حسن خاں صاحب نے خود بوقت ملاقات اَدا کیا تھا)

۴۔ میر سوز دہلوی کے کلام کی ترتیب وتہذیب کی دقتوں سے تنگ آ گئے تھے۔ لہٰذا

مقصد یہ کہ اگر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اُردو ہوتے تو کسی عنوان سے چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ دراصل خواجہ صاحب ان دنوں بیرون ہند کے سفر پر تھے۔

۵- بھائی قمر سے مراد قمر رئیس ہیں۔ جو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد اور شاہجہاں پور کے ہی رہنے والے تھے۔ قمر صاحب اُن دنوں رُوس میں فرائض استادی ادا کر رہے تھے۔ لہٰذا خط و کتابت کا سلسلہ مفقود تھا۔ اس کا شکوہ کیا ہے۔

۶- قدوائی۔ صدیق الرحمٰن قدوائی، استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے مراد ہے۔

۷- حمیدہ سلطان۔ خواتین دہلی اور اردو کی مایہ ناز رفیقہ و اَدیبہ۔ آپ صدر مملکت ہندوستان فخر الدین علی احمد صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ اور انجمن ترقی اردو ہند (دلی شاخ) کی نگراں بقیہ جملہ مزاحیہ ہے۔

۸- ہاں جانِ اردو سے مراد محترمہ نکہت جہاں ہیں۔ جو حُسن و جمال کی وجہ سے صدر شعبۂ کی منظور نظر تھیں اور بقول پروفیسر احتشام حسین (صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی) ملکۂ اردو کم، جان خواجہ پیر زیادہ۔ بروقت اس سے زیادہ کچھ بیان کرنا نامناسب بات ہوگی۔ اس لیے کہ شعبۂ اردو کی ذلت کے سامان زیادہ تھے۔ اسی لیے رشید صاحب نے قصیدہ تہنیت یا قطعہ تعزیت کی ترکیب استعمال کی ہے۔

۹- ظہیر صاحب سے مراد...... پروفیسر ظہیر احمد صدیقی سے ہے جو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سینئر اساتذہ میں تھے۔ اور سب کے نزدیک لائق احترام۔

۱۰- نارنگ صاحب...... پروفیسر گوپی چند نارنگ، جو جامعہ شبینہ دہلی یونیورسٹی کے سینئر استاد بھی تھے۔ رام پور سے مخطوطہ کے اوراق کی ترسیل کے سلسلے میں مطلع کیا ہے۔ جس کی اطلاع ظہیر صاحب کو بھی دینے کی تاکید کی ہے۔

رشید حسن خاں صاحب، تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ میرا بے حد احترام کرتے تھے۔ بلکہ میرا نام تک لینے میں پرہیز کرتے تھے۔ سید کہتے یا بلگرامی صاحب (یہی احترام جناب امتیاز علی خاں عرشی صاحب بھی فرماتے تھے جب کبھی وہ رام پور سے علی گڑھ تشریف لاتے راقم کے غریب خانہ ضرور حاضری دیتے۔ میں عرض گزار ہوتا کہ آپ خبر کرا دیا کریں، میں زیارت کے لیے حاضر ہو جایا کروں گا تو فرماتے، میں خالص پٹھان اور پکا غلزئی ہوں۔ سید کا احترام میری گھٹی میں پڑا ہے)۔ میرا تعلق جب انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی سے تمام ہوا اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستگی ہوئی تو رشید حسن خاں

صاحب کو یونیورسٹی لائبریری کی ملحقہ عمارت کے ایک کمرے میں محبوس، خاموشی سے کام کرتے ہوئے پایا۔ ان کے اردگرد کسی کو کبھی نہ دیکھا۔ کام سے کام۔ ہاتھ میں قلم، سامنے کاغذ اور نگاہیں کسی مخطوطہ پر۔ جب راہ ورسم بڑھی تو اپنی ہر ضرورت کا اظہار مجھ سے کرتے۔ میں اس کا تکملہ کرادیتا۔ ایک دو بار اُن کی تنخواہ کا بھی جھگڑا پڑا۔ دفتری سبب سے مجھے جیسے ہی اطلاع ملتی تو رجسٹرار یا F.O. سے مل کر رُو براہی کرادیتا۔ اس سلوک کا انھوں نے ہمیشہ پاس کیا اور ظہیر صدیقی صاحب سے ایک گفتگو میں کہا کہ ہم آپ ایک عرصہ سے یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ بلگرامی صاحب کو آئے ہوئے ابھی صرف ۶ ماہ کی مدت ہوئی ہے مگر سب کے دل کی آواز بن گئے ہیں۔ اور اپنی جگہ بنالی ہے۔ ظہیر صاحب نے جواباً کہا تھا یہ اُن کے خاندانی شرف کی بات ہے۔ اس بات سے قطع نظر رشید خاں صاحب میں جو واقعی خصوصیت کی بات تھی وہ یہ کہ ہر کسی سے معرکہ آرائی کے فرد نہ تھے۔ مگر جس سے ٹھن جاتی اسے معاف کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ خواجہ احمد فاروق صدر شعبۂ اردو تھے مگر ان میں انانیت کی خوبو بہت تھی۔ طلبا، اساتذہ سے بھی اُن کا رویہ دل آویزی کا نہ تھا۔ تکبرانہ ہوتا تھا۔ رشید حسن خاں صاحب خالص پٹھان، وہ بھی شاہجہاں پوری پٹھان۔ کسی کی پرواکرنا (غلط امور میں) ان کی فطرت کے خلاف بات تھی، مگر جس سے اُنسیت ہو جاتی، اسے دل کے نہاں خانے میں جگہ دینے کے عادی تھے۔ مزاح بھی تھا مگر ہر فرد سے اس کا مظاہرہ نہ کرتے۔ ہاں طنز کا مظاہرہ ضرور کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن سے ایک معاملہ میں جھک جھک ہوگئی تو ان کے منھ پر کہا۔ مرادآباد اور شاہجہاں پور کے لواحقین میں بہت فرق ہوتا ہے، ظہیر صاحب سے ایک گفتگو میں کہا: بدایوں کے ملا سے آپ کو کوئی نسبت نہیں ہے، آپ صرف شریف ہیں، سادہ مزاج۔ خلیق انجم، اُن دنوں طالب علم تھے۔ بھلا رشید صاحب ان کو کیا خاطر میں لاتے، پھر بھی ایک بار ظہیر صاحب سے کہا تھا، دہلی کے گلی کوچے اوراق دبستاں میں، مگر کچھ گلیاں اس سے مثنیٰ بھی تو ہوں گی۔ بہر حال رشید حسن خاں صاحب سے متعلق ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے جس میں دیگر افراد جو ان سے ملے اور ان کی صحبت میں بیٹھے وہ اپنی اپنی یادداشت سے متعلق آگاہی دے کر ان کی حیات کے باب کو روشن کر سکتے ہیں۔ بروقت تو میں مشفق خواجہ صاحب کے اس فرمان پر گفتگو ختم کردوں گا کہ رشید حسن خاں کا اندر باہر یکساں ہے ان کی نظر وفکر اور ان کے قلم کی روش تار نظر کی مثال ہے کاش وہ صاحب علم درسی یعنی علم ظاہری کی اسناد سے مشرف ہوتے تو کسی جامعہ کے سربراہ اعلیٰ ہوتے۔ اور پھر علمی موشگافیوں کا مظاہرہ کسی اور

نوع سے نظر آتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کسی یونیورسٹی اور جامعہ کے طالب علم نہ تھے مگر وزیر تعلیم ہندوستان میں اُن کا نام شریک ہے۔ مسکرا کر جواب دیا اور کہا تھا۔ رشید حسن خاں کے پاس پنڈت جواہر لال نہرو جیسی ذات کہاں ہے؟ جو پارس بنا دے۔ میں نے بھی مسکرا کر کہا تھا کہ حضرت آپ جیسا محقق جب ان کی مدح سرائی کرے اور ان کی خدمات علمی پر شکرانہ ادا کرے تو پنڈت جواہر لال نہرو کی اس ضمن میں کیا حیثیت ہوگی۔

خط: ۶-۷/ فروری ۱۹۷۷ء مکرمی بلگرامی صاحب تسلیم۔ اس عنایت خاص کے لیے آپ کا شکریہ ادا کروں تو رسمی سی بات ہوگی، لیکن بہر صورت اس کا یقین ہے کہ آپ اس احساس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اس وقت حال میں موجزن ہے۔ آپ کا احسان۔

نوٹ: پروفیسر احسان رشید (خلف پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب متوفی ۱۵/ جنوری ۱۹۷۷ء) وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی مقیم علی گڑھ۔ احسان صاحب اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد جب علی گڑھ آئے تو راقم نے ان سے کہا تھا کہ رشید صاحب کا سرمایہ علمی جس قدر بھی ہے اسے محتاط ہاتھوں تک پہنچا دیں۔ اس کا جواب موصوف نے جو دیا اس میں جو کرب ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

خط: ۷- کلکتہ ۱۱/ جنوری ۱۹۶۱ء قبلہ بلگرامی صاحب

خدا آپ کو خوش رکھے اور اس ایک اضافے سے آپ کی پریشانیوں میں افاقہ ہو، میں زندہ ہوں۔ بظاہر مرنے کا کوئی امکان نہیں۔ اگر تھا تو دہلی میں تھا۔ غالب کلکتے کا ذکر پھر اگر ہائے ہائے سے کرتے تھے تو غلط نہیں کرتے تھے۔ میں نے تو یہاں بہتوں کو توبہ توبہ کرتے دیکھا۔ مگر میں مزے میں ہوں۔ غالب کی طرح سر پر گھنے بال نہ ہونے کا آپ غم نہ کریں انشاءاللہ جسم کا رواں رواں گواہی دے گا۔

بس غم ہے تو تنہائی کا۔ اور یہ تو وہاں بھی تھا۔ اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ سبق سکھانے والے کی بجائے آپ میرے لیے براہ کرم 'تختۂ مشق' تلاش کریں۔ میں بھی اسی فکر میں لگا ہوا ہوں۔

سردی کی شکایت آپ کو نہیں کرنی چاہیے، آگ کے قریب ہیں۔ جھلسے جا رہے ہیں پھر بھی سردی کا رونا۔ اب کیا آگ سے کھیلنے کا بھی ارادہ ہے؟ ایسا نہ کیجیے گا سردنوں کی سردی کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ گزرتی ہی آئی ہے اور ہمیشہ کی طرح گزر جائے گی دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اب برسات کی فکر کیجیے میں بھی یہ سردیاں احساس محرومی کی بجائے اُمید فردا کے

سہارے گزار رہا ہوں۔

ساہنی صاحب کو بہت بہت سلام کہیے۔ آپ کی روک تھام کے لیے ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ آپ دعا کرتے رہیے۔ اثر ہوگا۔ دیر ہے اندھیر نہیں۔

بقیہ گفتگو دہلی پہنچنے پر ہوگی۔ نیم بسمل پہنچوں یا بے جاں۔ پہنچوں گا ضرور۔ رشید حسن خاں صاحب، قمر رئیس صاحب اور سب لوگوں کو نام بنام سلام کہیے۔ آپ کا صدیق الرحمٰن۔

پس پشت اپنی تنخواہ کی رسید روانہ ہے ماجد کے نہ آنے کا غم نہ کیجیے، کہیے تو ان کی رسید بھی بھیج دوں۔ وہ انشاءاللہ اس ماہ کی آخری تاریخوں میں آپ تک پہنچیں گے۔ ملیں تو Wenger جا کر 'مناسب بات' کہیے گا۔

خط: ۸- حیدرآباد ۲۶ رجنوری ۱۹۶۱ء

قبلہ بلگرامی صاحب۔ بہت بہت شکریہ۔ ساہنی صاحب سے بعد سلام کے کہیے کہ آپ کو اگر نہیں، تو مجھے معاف کر دیں۔ میں نے ایسی کیا بات لکھی تھی کہ ان کے دل کو ٹھیس لگی۔ آپ نے میری ملکہ کا ذکر کیا ہے، آپ کے منہ میں گھی شکر، دعا کیجیے کہ جلد میری اور آپ کی مرادیں برآئیں اور یہ ملکہ جو آئی ہیں ان سے کہیے کہ ع ہمدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا۔ شہزادی مارگریٹ کو بھی ساتھ لیے آتیں تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ نثار احمد فاروقی صاحب تو بخیرو عافیت پہنچ گئے ہوں گے۔ ان سے میں تو دہلی میں بھی کافی متاثر تھا، یہاں آکر اور زیادہ متاثر ہوگیا۔ کافی رنگ جما کر گئے ہیں۔ جو بھی ملتا ہے، اُن کو پوچھتا اور بہت احترام کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

بلگرامی صاحب کلکتہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بنگال کی مٹھائی اور نمک دونوں کی شہرت دُور دُور تک کچھ غلط نہیں پھیلی۔ مٹھائی سے کام و دہن لطف اندوز ہوئے اور نمک سے نگاہیں۔ کاش قیامت کے دن پلکوں سے اٹھوانے کے لیے یہی نمک بکھیرا جائے۔ حیدر آباد بھی اپنی قسم کا لاجواب شہر ہے۔ موسم اتنا اچھا ہوتا ہے کہ یہاں آئے بغیر اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ شہر کے اندر اور چاروں طرف خوبصورت پہاڑیاں اور جھیلیں ہیں۔ عمارتیں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اور نسوانی حسن کا تو کہنا ہی کیا؟ شہابی رنگ دیکھا تو یہیں دیکھا۔ میں نے تو کلکتہ سے ہی حیدرآباد کے حسن کا اندازہ لگالیا تھا۔ ایسا ہم سفر خدا سب کو عطا کرے۔

تین دن کا سفر خواب میں کٹ گیا۔ آپ نے دعا کی ہے کہ میں ساتھ خیریت کے واپس پہنچوں، میری دعا ہے کہ خدا آپ کی دعا قبول کرے۔

بمبئی میں شاہد علی خاں سے ضرور ملوں گا۔ میری بھی ان سے ملاقات ہے مگر زیادہ گہری نہیں۔ جب وہ دہلی میں تھے تو اکثر آتے جاتے ملاقات ہو جاتی تھی۔

ڈپارٹمنٹ میں اور سب لوگوں کے کیا حال ہیں، جو بھی ملے میرا اسلام کہیے گا۔ ماجد ضرور اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ میرے دہلی پہنچنے کی دیر ہے۔ آپ غم نہ کیجیے مگر ایک غم ہو تو کہوں۔ خدا آپ کو ہمیں اور سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آپ کا قایل صدیق الرحمٰن۔

مکرر: مستقل سفر میں ہوں، آپ کے خط کا کہاں انتظار کروں۔ رام چندر کی تلاش میں بن باس ملا۔ اور بن باس بھی بغیر کسی سیتا کی رفاقت کے کاٹ رہا ہوں۔ دوستوں اور آپ جیسے بزرگوں کے خطوط سے بھی محروم۔ خیر ملاقات پر رہے گی: صدیق الرحمٰن۔

پتہ: انگریزی میں Mr. Bilgrami.

Dept. of Urdu,

University of Delhi, Delhi-6

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قدیم طالب علم جن کا نام والدین نے صدیق الرحمٰن رکھا مگر علی گڑھ کے زعمانے 'شیخو' کے نام سے مجوز کیا۔ یوپی کے شرفا کے خاندان سے آپ کا تعلق ہے۔ تعلیم کے تکملہ کے بعد آپ نے دہلی یونیورسٹی سے 'ماسٹر رام چند' پر اپنا مقالہ لکھا۔ ترقی پسند گروپ کے ایک حلقہ سے وابستہ تھے مگر ایسے نہیں کہ بے راہ روی کو راہ دے دیں۔ جے این یونیورسٹی کے اساتذہ میں تھے مگر ہر حلقہ میں مقبول۔ سادہ مزاجی صفت اور دل آزادی سے پرہیزی آپ کا وصف تھا۔ راقم سے ایک تعلق خاص رکھتے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی بھی اوروں کے مقابلے میں صدیق الرحمٰن کو نظرِ خیر سے دیکھتے تھے۔ ان کی سادہ لوحی سے متاثر تھے یا ان کے والد اور دیگر اعزا کے درجات خصوصی کے سبب، وہ نظریہ نہ تھا جو دیگر طلبا کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ بہر حال صدیق الرحمٰن میں غرور یا تکبر نہ تھا۔ اگر کوئی بات ناگوار گزرتی تو شہد کا گھونٹ بنا کر یا خیال کر کے پی جاتے تھے۔ اختلاف رائے انسان کی سرشت میں ہے۔ قدوائی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے، مگر بدلہ کی بھاؤ نانہ تھی۔ اگرچہ میں اُن کو ناقابل ہی تسلیم کرانے پر تلا رہتا تھا۔ پھر بھی 'شیخو' کی بات ہی اور ہوتی تھی۔ البتہ ظہیر صدیقی صاحب سے ربطہ ضبط تھا۔ وہ بھی صدیق الرحمٰن صاحب سے متعلق تعریفی خیالات کے حامل تھے۔ سوا ایک فرد کے، جن کا نام زبان قلم پر آنے سے پرہیز کرنا، مناسب خیال کرتا ہوں کہ بیتے ایام کا

ذکر، اب فضول ہی سی بات ہوگی۔ بہر حال مجھے فخر ہے کہ چند سال کے قیام دہلی یونیورسٹی میں شعبہ کے اساتذہ، طلبا اور اسٹاف کے سوا دہلی یونیورسٹی کے جملہ افراد، خواہ وائس چانسلر، رجسٹرار، فائنس آفس ہو، لائبریری، سب ہی ایک تعلق خاص مجھ سے رکھتے تھے۔ اور میرا احترام فرض عین خیال کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ظہیر صاحب، قمر رئیس صاحب، شریف صاحب، شمیم نکہت اور سب ہی دل کے نہاں خانے میں، قریب سے قریب تر رکھتے تھے۔

نوٹ: (۱) ساہنی صاحب کلرک شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ (۲) نثار احمد فاروقی، طالب علم دہلی یونیورسٹی، بعدہ، استاد شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی۔ (۳) شاہد علی خاں، منیجر مکتبہ لمیٹڈ، جوان دنوں بمبئی کی شاخ مکتبہ جامعہ کے منیجر تھے، بعد میں صدر آفس مکتبہ جامعہ نگر، دہلی کے جزل منیجر ہوئے۔ کتاب نما آپ کی ہی تجویز سے شائع ہونا شروع ہوا۔ جو تا حال شائع ہو رہا ہے۔ خاموش طبع اور بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔

☆☆☆

شیر محمد خاں ابن انشا

سر سید احمد خاں کا پیغام عام تھا۔

''انسان کی سب سے بڑی عزت کا مقام وہ ہے جس میں اس کی قوم عزت و احترام کرے۔ اور جو کچھ وہ کرے اس کی تائید دوسرے کریں''

اس اقتباس کی روشنی میں اگر اردو ادب کے ادیبوں کا جائزہ لیا جائے تو رشید احمد صدیقی، احسن مارہروی۔ صفیر بلگرامی، شاہد احمد دہلوی وغیرہ کے سوا اور جدید ادباء میں مشفق خواجہ، قاضی عبدالودود، مختار الدین احمد اور ابن انشاء وغیرہ کے نام بھی سامنے آئیں گے۔ ابن انشا کی تحریریں اپنی الگ مقام کی مالک تھیں یا نہیں۔ اس کا فیصلہ اہل ادب کریں گے۔ راقم کی اولین ملاقات یا راہ و رسم (جب میرا تعلق پریس انفارمیشن بیورو (PIB) گورنمنٹ آف انڈیا نئی دلی سے تھا) کا سلسلہ سال ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا تھا۔ حسب خواہش ایک خاکہ موصوف کو روانہ کیا جس میں ان کی مختصر سوانح حیات یا شخصی کیفیت، سرگزشت لکھ کر ارسال کرنے کی گزارش کی تھی۔ ابن انشاء صاحب نے اس میری تحریر کے جواب میں جو مراسلہ بھیجا وہ ہدیہ ناظرین ہے:

کراچی ۲۸/مارچ ۱۹۵۹ء

جناب محترم آداب

آپ کا پوسٹ کارڈ ملا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میرے حالات آپ کو کس سلسلہ میں مطلوب ہیں۔ میں حالات بتانے کے معاملے میں قدرے متشکک بھی ہوں۔ قلمی نام سے لکھتا ہوں۔ لہٰذا اصل نام کے اشتہار اور ولدیت کی تفصیل کا فائدہ، ذات اور گوت کا معاملہ بھی کچھ غیر متعلق ہے۔ کسی علمی مرکز یا علمی خاندان سے میرا تعلق نہیں۔ پیدائش ۱۰/جون ۱۹۲۶ء (ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں) کو ہوئی۔

تعلیم: ایم اے اردو کراچی یونیورسٹی (۱۹۵۲ء) آخری امتحان ہے جو پاس کیا۔ انجمن سے پہلے بہت سی درگاہوں میں بھی بھٹکتا پھرا۔ جن سے آپ کو دلچسپی نہ ہوگی۔ نوکری کرتا ہوں

تحریک ترقی دیہات کے ماہنامے پاکستان میں (کزا) ایڈیٹر ہوں۔

تصانیف: زیادہ نہیں، چاند نگر مجموعہ اشعار ہے، نظمیں، غزلیں سب کچھ، یہ ۱۹۵۰ء میں چھپا، بچوں کی نظمیں، بلو کا بستہ اور دوسری نظموں کے نام سے ۱۹۸۱ء میں منتخب چینی نظموں کے منظوم تراجم کا شیرازہ، چینی نظموں: کے نام سے پریس میں ہے۔ نثر کے تراجم جو چھپے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱- اندھا کنواں Talsy Mystry Imagination (edgarallen Poet)

۲- لاکھوں کا شہر Four Million (o'Henry)

۳- شہر پناہ Moon is Down (John Steinbelk)

۴- جمہور The Prisoner (English Chirkov)

نثر میں کچھ مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کا مجموعہ: خار گندم: زیر اشاعت ہے اردو کے علاوہ انگریزی میں کبھی کبھار لکھ لیتا ہوں۔

اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ کو یہ تفصیلات کس سلسلے میں چاہئیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔

ابن انشاء

یہ مکتوب کراچی سورٹنگ آر ای ایس سے ۲۸ مارچ ۱۹۵۹ء کی مہر کے ساتھ (صبح ۸ بجے کی ڈاک سے) درج ذیل پتے پر روانہ ہوا۔

پتہ: سید مرتضی حسین بلگرامی اردو سیکشن پریس انفارمیشن بیورو پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی (انڈیا)   لفافہ پر ۲/۱= آنے کے ٹکٹ پر محکمہ ڈاک ثبت ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ ابن انشاء کی اس تحریر کے ٹھیک دو سال بعد راقم کو ان کے استقبال کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے ایک سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ہندوسند کے معزز اور معتبر ادباء شعرا اور فن کاروں کو مدعو کیا گیا۔ جن پتھ ہوٹل میں سرکاری مہمان بنا کر قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کارواں میں بمبئی سے پرتھوی راج کپور اور شاید بلراج ساہنی نے بھی شرکت کی تھی۔ ان دنوں دریا گنج گولچہ سینما میں مغل اعظم چل رہی تھی۔ تمام شرکاء کو اس فلم کے دیکھنے کا شوق ہوا۔ خصوصی طور پر پاکستانی شرکاء کو۔ لہذا۔ گولچہ سینما کے مالک سے مل کر خصوصی طور پر جگہ (سیٹیں) کو محفوظ کرایا۔ پرتھوی راج نے بھی ہمراہی کی اور شاہد احمد دہلوی و شوکت تھانوی کو بھی رفاقت نصیب ہوئی۔ انٹرول میں دیگر شرکاء

نے بھی پرتھوی راج سے ملاقات کی۔ فلم کے خاتمہ کے بعد برابر کے کمرے میں چائے کا انتظام منیجر کی طرف سے کیا گیا تھا۔ پرتھوی راج سے دوران گفتگو راقم نے کہا۔ کہ مغل اعظم کا کوئی ڈائیلاگ سنادیں۔ موصوف نے اپنے کان کی دونوں لوین پکڑ کر کہا۔ نہ بابا اب نہیں ہوسکتا وہ تو نہ جانے کیسے...... کے آصف...... نے ہم سے ایسی اہم ایکٹنگ کرالی۔ اب ممکن نہیں ہے۔

اس تفصیل کے بعد ابن انشاء صاحب سے ایک اہم گفتگو بھی کی گئی جس سے عام قاری کوئی معلومات مہیا ہوسکیں گی اور اُن کے علم میں اضافہ ہوگا۔ یہ واقعہ ۲راپریل ۱۹۶۱ء کا ہے۔ راقم کی کشکول جو سوانحی سرگزشت کا حصہ ہے اس کی خانہ پری کی درخواست کی۔ جسے بشوق قبول کیا۔ عنوان میرے قلم سے تحریر کردہ ہیں۔ بقیہ تحریر ابن انشاء کی ہے۔ الفاق سے بیشتر معلومات وہی ہیں۔ جن کو آپ ابتدائی سطور میں ملاحظہ کرچکے ہیں۔ پھر بھی تکرار کو مدنظر انداز کر کے، دوبارہ موصوف کی تحریری سرگزشت کو ملاحظہ کرلیں۔

نام : ابن انشاء ولدیت :......ندارد

تاریخ پیدائش: ۱۰ر جون ۱۹۲۶ء سکونت: کراچی

مولد : ضلع جالندھر وطن: پاکستان

تفصیل امتحانات (سنہ۔ یونیورسٹی۔ کالج وغیرہ)

ایم اے (اردو) کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۳ء

دیگر تفصیلات: ملازمت۔ تصانیف۔ سب سے پہلی غزل: مضمون/افسانہ/شعر وغیرہ۔ مدیر مطبوعات مرکزی ترقی دیہات حکومت پاکستان (قائم مقام ایکزیکٹو، سکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ)

تصانیف: چاند نگر ۱۹۵۱ء، مجموعہ کلام۔ دوسرا مجموعہ کلام اس سال (۱۹۶۱ء) میں شائع ہوگا۔ بلو کا بستہ ۱۹۵۶ء بچوں کے لیے نظمیں۔ چینی نظمیں ۱۹۶۱ء قدیم وجدید نظموں کے تراجم: دیگر تراجم: اندھا کنواں (اید گرایلن)۔ لاکھوں کا شہر (او ہیرنی) شہر پناہ (اسٹین بک) مجبور (یوجین چے خوف)۔ خارگندم (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ زیر طبع ہے)۔

آپ اردو کے کس ادیب سے متاثر ہوئے اور کیوں؟

سبھی سے متاثر ہوا مختلف اوقات میں، جو نام یاد رہے یہ ہیں۔ میر، نظیر، سودا، محمد حسین، آزاد، مولوی عبدالحق، جن لوگوں کی تحریر دل پر براہ راست اثر کرتی ہے۔ تصنع اور

لفاظی سے پاک ہو۔ اور سادگی میں بانکپن لیے ہوئے ہو۔ صرف ان میں سے مجھے رغبت ہے۔ Flok اصناف سے مجھے دل چسپی ہے۔

آپ کی نظر میں بہتر:

ناقد: عبدالحق،

بہتر شاعر (دور جدید) اختر الایمان

دستخط: ابن انشاء

شہر: دلی

مورخہ ۲/اپریل ۱۹۶۱ء

ابن انشاء کی اس تحریری سرگزشت کے بعد میں نے نرم لہجہ میں دریافت کیا کہ آپ اپنے قلمی نام کی شہرت کو ہی کیوں ضروری خیال کرتے ہیں۔ ویسے آپ کے بھی والد کا نام آپ کے دادا نے اور آپ کے والد نے کوئی نام تو ضرور رکھا ہوگا۔ قلمی نام تو آپ نے بہت بعد میں اپنایا ہوگا۔ مسکرا کر کہا۔ بلگرامی صاحب آپ نے مجھے لاچار کر دیا ہے۔ ویسے میرا اصلی گھریلو نام شیر محمد خاں ہے۔ اور قیصر تخلص۔ ولادت میری ۱۰/جون ۱۹۲۶ء کو پھلور ضلع جالندھر مشترکہ ہندوستان کی ہے ہمارا گھرانہ بس واجبی سا تھا۔ مگر اہل قصبہ ہمارے گھرانے کی تعظیم وتکریم بہت کرتے تھے۔ مدرسہ کی ابتدائی تعلیم اور گھر کی مہذب فضا کے باعث زبان کا شوق شروع ہی سے رہا۔ فارسی کی شدبُد تھی مگر اردو سے لگاؤ اور انگریزی کی قابلیت کے شعور نے لکھنے لکھانے کی سمت راغب کر دیا۔ انگریزی تو ساتھیوں کے ساتھ نے سکھا دیا۔ ترجمہ کا شوق ضروریات نے پیدا کیا۔ اس کے سوا مختلف کہانیوں کو منظوم اور تاثراتی مضمون کی شکل میں پیش کیا۔ جو منفرد اشخاص نے پسند کیا۔ اور ہمت افزائی نے دل کو مزید جوش بخشا۔

ایک سوال کا یہ جواب دیا...... آپ نے غالباً مارچ ۱۹۵۹ء کو جو اپنا سرگزشت نام ارسال کیا تھا۔ اس میں مجھے یاد آتا ہے کہ خار گندم کے لیے زیر اشاعت لکھا تھا۔ مگر آج ۲/اپریل ۱۹۶۱ء کو یعنی دو سال کی مدت گزر جانے کے باوجود، زیر طبع تحریر کر رہے ہیں، اتنی تاخیر کیوں؟

مسکرا کر کہا۔ طباعت کے لیے تو مطبع کی اپنی طبع ہوتی ہے اُس کے نذر یہ کتابچہ ہے۔ اس گفتگو کے بعد ابن انشاء نے مذکورہ صفحہ پر یہ عبارت لکھ کر، کشکول مجھے واپس کر دی۔

''......شعر گوئی ۱۹۳۷ء سے، شاعری اور مزاح نگاری کبھی کبھی، ادبی تنقید، زیادہ تر اردو میں لکھتا ہوں، گاہے گاہے انگریزی میں''

ابن انشاء...... سے گفتگو کے بعد ہم لوگ غالب کے مزار پر گئے۔ علاقہ نظام الدین اولیا کی سیر کی۔ اور ابراہیم جلیس سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھائی اگر غالب زندہ ہوتے تو ہم کو تم کو دیکھ کر کیا کہتے؟ ابراہیم جلیس نے بے ساختہ کہا۔ میری۔ وہ کیوں؟ ابن انشاء نے سوال کیا۔ اس لیے کہ ہم تم دلی میں نہیں ہیں۔ نئی دلی میں مقیم ہیں۔ میر کی طرح در بدر کے خوار: اس پر شاہد احمد دہلوی نے کہا۔ آپ دونوں غیر ملکی ہیں۔ ایک پنجاب کا باشی اور دوسرا دکن کا باشندہ بس ہم دلی والے ہیں۔ اس پر شوکت تھانوی نے جملہ وارد کیا۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ابن انشاء کی شخصیت بہت سادہ، خوش طبع اور سادگی پسند تھی، جتنے دن دلی میں بطور مہمان رہے، کوئی ایسا معاملہ یا فرمائش نہ کی، جو بار گزرتی۔ رشید حسن خاں سے ملاقات پر صرف اتنی بات فرمائی، میرا نام الف سے شروع ہو کر ہمزہ پر تمام ہو جاتا ہے۔ جب کہ آپ کا نام دو سو کے عدد سے شروع ہو کر پچاس پر ختم ہوتا ہے۔ رشید حسن خان نے جواباً کہا۔ اعداد کے اعتبار سے الف اور ہمزہ کے عدد کو: ایک: ہی تسلیم کیا گیا ہے، مگر آپ کے نام کے اعداد چار سو چھ ہوتے ہیں اور ان کو ملا دیا جائے تو صرف دس کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ابن انشاء نے کہا گویا دس نمبری۔ سب ہنس پڑے لیکن ابن انشاء نے ذہانت سے کام لیا اور کہا۔ حضور والا آپ کے نام کا مجموعہ میرے خیال سے ۶۳۲ یعنی ۱۱ ہوتا ہے، مجھ سے ایک عدد زائد۔ اس پر شاہد احمد دہلوی نے جملہ کسا ایک اور گیارہ مل کر غالب کی زبان میں: حد: کے عدد ہو جاتے ہیں اور حد کی تعداد ۱۲ ہوتی ہے۔ یعنی بس۔

اس علمی گفتگو کے بعد جب رشید حسن خاں رخصت ہونے لگے تو ابن انشاء نے کہا آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔ بہر حال ابن انشاء، ابراہیم جلیس، شوکت تھانوی اور شاہد احمد دہلوی، لائق احترام ہی نہیں تشخص اور انفرادیت کے میدان میں فال نیک تھے۔ اور کسی ادیب میں ان صفات کا ہونا فال نیک کی بات ہے۔

شیر محمد خاں یعنی ابن انشاء کی ولادت ان کی اپنی تحریر کے مطابق ۱۰/ جون ۱۹۲۶ء کو

ضلع جالندھر میں ہوئی تھی۔ راقم نے جب اپنی کشکول کو دیکھا تو ان کے والد کا نام اور جالندھر کے اس موضع یا دیہات کا نام ندارد تھا۔ جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ لہٰذا دوسری صبح ملاقات پر اس کا ذکر کیا تو بتایا کہ شیر محمد خاں (ابن انشاء) کے والد کا نام منشی خاں تھا، جو راجپوت خاندان سے وابستہ تھے اور وہ گاؤں جہاں رہتے تھے اس کا نام پھلور تھا۔ اس کے بعد راقم نے سوال کیا آپ نے ابن انشاء کے سوا کوئی اور قلمی نام کیوں نہیں تجویز کیا۔ مسکرا کر کہا بلگرامی صاحب پہلے تو اسکول کے تعلیمی دور میں قیصر رکھا مگر اس سے قبل احقر پھر مایوس، اس کے بعد قیصر رکھا، لیکن اسکول کے تعلیمی دور کے بعد، جب ابن انشاء رکھا تو اسے دوامیت بخشی۔ درمیان گفتگو دریافت کیا کہ آپ کا پہلا شعر کیا تھا؟ کہا، تاریخ پیدائش کی طرح، اس کا علم بھی نہیں ہے، اور پھر کسے یاد رہتا ہے اور کیا علم تھا کہ قصبہ بلگرام کا کوئی فرد اس طرح سوالی ہوگا۔ ویسے بھی یاد آتا ہے کہ شاید ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول امتیازی درجہ سے (غلطی سے) پاس کیا تھا۔ پھر گھر کی خستہ حالی کے سبب ملٹری کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ ہاں ایک بات اور ابتدائے عمر میں ہی اردو، فارسی، گورمکھی اور ہندی کے سوا انگریزی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور دوران ملازمت ہی انٹر اور فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ایک اہم بات بلگرامی صاحب اور کہوں میرے نام میں ایک بہادر چوپائے کا نام شریک ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا ہاں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام :شیر خدا: جو: دست یداللہ: کہے جاتے ہیں، یہ تو آپ نے نئی بات پیدا کر دی، مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اپنا نام قلمی یا تخلص ابن انشاء رکھا تو دوسروں نے مجھے خان سے سید بنا دیا، اور بہت سے لوگ سید انشاء اللہ خاں کہنے لگے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ میں :سید: تو نہ ہو سکا مگر :خان: بدستور رہا اگر چہ اسے اپنا لاحقہ نہ بنایا، نہ ہی میں نے اپنے نام کے ساتھ :خان: لکھا۔ ویسے آپ نے شعر کے سوا نظمیں بھی نظم کی ہیں۔ ان میں انفرادی شاعر کون تھا، جس کی تقلید آپ نے پسند کی۔ بلا عذر کہا میر تقی کے سوا، نظیر اکبر آبادی، میری پسند تھے۔ ان کے کلام میں جو انفرادیت، معصومیت اور رومانیت کا رچاؤ ہے، وہ میرے دل کی اپنی آواز سے میل کھاتی تھی۔ پھر نظیر کے یہاں شخصی اجتماعیت کا جو رجحان ہے وہ نعرے بازی سے الگ کی شے ہے۔ حوصلہ، عشق، قلندری اور زندگی کا جو سلیقہ ان کے یہاں ملتا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں کم میسر آئے گا۔ یعنی

میر کی شاعری محض حسن یا دکھاوا نہیں۔ آئینہ ہے۔ لیکن نظیر کے یہاں قلندرانہ اور جوگ کی درویشی کا انداز نرالہ ہی نہیں، دانشمندانہ ہے۔ جب ابن انشا ایک لمحہ کے لیے رکے تو راقم نے استدعا کی کہ نظیر کے کلام کی طرح آپ اپنا کوئی کلام سنایئے۔ انہوں نے انبساط کا اظہار کیا، میں نے قلم اور کاغذ نکال کر اس آواز کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔

اے جوگی، اے درویش کوی　　کیوں عمر گنوائے رہتا ہو
کیوں تن پر راکھ بھبھوت ملے　　تم گورکھ ناتھ کا چیلا ہو

یہ جو لوگ بنون میں پھرتے جوگی بیراگی کہلائیں
انکے ہاتھ ادب سے چومیں، ان کے آگے سیس نوائیں
انشا جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکون سے مطلب کیا، جوگی نگر میں ٹھکانا کیا

آپ نے قدیم دوہے یا سنسکرت بلکہ اودھی زبان وغیرہ کس سے سیکھی؟ مسکرا کر کہا۔ ماحول سے، ورنہ اس کا موقع زندگی نے مجھے کب دیا کہ درسیات کا علم سیکھتا، بلگرامی صاحب میں بہت غریب بلکہ مسکین گھرانے میں پیدا ہوا مگر ماحول اور دوست حضرات کی صحبت نے مجھے معیاری بنانے کی کوشش کی آج جیسا ہوں وہ سب کے سامنے ہے۔

ابراہیم جلیس کے سوا شفق خواجہ صاحب نے ذکر کیا تھا کہ آپ کا حلقہ احباب وسیع تھا بلکہ ہے۔ ہنس کر کہا، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، فکر تونسوی، ظہیر کاشمیری، فیض اور جوش ملیح آبادی کے سوا قرۃ العین حیدر، کرنل محمد خاں اور شوکت تھانوی نیز ہاجرہ مسرور، کے علاوہ قدرت اللہ شہاب، وغیرہ نے میری زندگی کو خوش رنگ بنانے کی جہد کی۔ ملازمت کے ضمن میں حکومت پاکستان نے نیشنل بک سینٹر کی زمام بخشی۔ اشاعتی سلسلے کے تحت یونسکو میں علمی وثقافتی نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ نیز مختلف ممالک کی سفارت کی نمائندگی بھی کی۔ مگر علمی خدمات سے روگردانی کبھی نہیں کی اور زندگی کے آخری لمحات تک ملک وقوم کی خدمت کرتا رہوں گا۔ تراجم کے سلسلے میں جو بات آپ نے کہی۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ چین، انگلینڈ اور روسی زبانوں کے علمی سرمائے کے مطالعہ نے جہاں متاثر کیا، ان کے اہل علم اور دانشور حضرات کی تصانیف کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مقصود اردو

دنیا کی آگہی کا اضافہ مقصود تھا۔ ابن انشاء نے واقعہ یہ ہے کہ اردو کو دیگر زبانوں کے علمی سرمائے سے مالا مال کرنے کی سعی کی۔ یہ ان کا احسان ہے۔ ابن انشاء کی اردو کی ''آخری کتاب'' اپنی نوع سے نادرو و یگانہ تصنیف ہے۔

افسوس کہ ابن انشا نے لندن کے علاقہ ستیین میں گیارہ جنوری ۱۹۷۸ء کو ۵۳ سال کی عمر پاکر داغ مفارقت دی اور اردو دنیا کو سوگواری بخشی۔ لیکن ان کی لاش لندن سے پاکستان لاکر پاپوش نگر کراچی میں تدفین کی گئی۔ ان کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا گیا اس کا تاریخی مصرعہ یہ ہے

<u>ابن انشاء قصر جنت کے مکین</u>

۱۳۹۸ھ

ابن انشا کی مختصر ترین سوانح حیات ان کے اپنے دست قلم کی پیش خدمت ہے۔ اس سے ان کے خیالات اور کس سے وہ متاثر تھے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نام: ابن انشا   ولدیت: عرف لکھنے
میں کراچی

تاریخ پیدائش: ۱۰ جون ~~۱۹۲۱~~ ۱۹۲۶   سکونت: کراچی   اردو جریدہ

مولد: ضلع جالندھر   وطن: پاکستان

تعلیمی امتیازات (سند، یونیورسٹی، کالج وغیرہ)

ایم۔ اے (اردو) کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۳

دیگر تفاصیل: ملازمت، تصانیف، سب سے پہلی غزل / مضمون / افسانہ / شعر وغیرہ

ڈائریکٹر مطبوعات مرکزی ترقی دیہات حکومت پاکستان [تا ایک (ایڈیٹر) کل پاکستان ...]

تصانیف: چاند نگر (۱۹۵۵) مجموعہ کلام

دوسرا مجموعہ کلام اس سال (۱۹۶۱) میں شائع ہوگا

بلو کا بستہ (بچوں کے لیے نظمیں) ۱۹۵۸ Nonsense rhymes

چینی نظمیں ۱۹۶۱ قدیم و جدید چینی نظموں کے تراجم

دیگر تراجم: اندھا کنواں (ایڈگر ایلن پو کی Tales of Mystery & Imagination)

لاکھوں کا شہر (او ہنری) Four Million

شہر پناہ (اسٹین بک) Moon is Down

مجبور (دلیو ...)

خمار گندم (مزاحی مضامین کا مجموعہ زیر طبع ہے)

آپ اردو کے کن ادیب سے متاثر ہوئے اور کیوں؟

سبھی سے متاثر ہوا مختلف اوقات میں۔ جو نام یاد رہے یہ ہیں

میر۔ نظیر۔ سودا ـــــ محمد حسین آزاد۔ مولوی عبدالحق۔

جن لوگوں کی تحریر دل پر براہ راست اثر کرتی ہے۔ تصنع

اور لفاظی سے پاک ہو اور سادگی میں بانکپن لیے ہوئے ہو

صرف انہی سے مجھے رغبت ہے ۔   ... انشا کے لیے دلچسپی ہو

آپ کی نظر میں:

ناقد: عبدالحق

شاعر: (دور جدید) اختر الایمان

دستخط: ابن انشا

شہر: دلی

کاؤس جی آلِ عبا آوارہ

مارہرہ ضلع ایٹہ (اتر پردیش) کا وہ قصبہ ہے جسے علماو فضلائے بلگرام نے مشہور انام کرادیا۔ حضرت شاہ سید برکت اللہ صاحب عرف شاہ برکات تخلص عشقی (زبان فارسی) اور پیمی (بزبان ہندی) ابن شاہ سید اویس (متوفی ۱۰ رمحرم ۱۱۴۴ھ) کے سبب یہ خطہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اس قصبہ کے ایک بزرگ سید آل برکات عرف ستھرے صاحب بن شاہ سید حمزہ بلگرامی (ولادت ۱۱۳۱ھ) کی اولادوں میں سید آل رسول صاحب کی بیٹی رحمت فاطمہ کی شادی سید محمد حیدر بن سید دلدار حیدر سے ہوئی تھی۔ سید دلدار حیدر کی اہلیہ کا نام جمال فاطمہ بنت سید آل برکات مارہروی تھا۔ آل رسول کی زوجہ کا نام نثار فاطمہ بنت منتخب حسین تھا، جو دلدار حیدر کی ہمشیرہ تھیں۔ سید آل رسول بن شاہ سید آل برکات کی دوسری زوجہ سے ۱۲۰۹ھ میں تولد ہوئے تھے۔ سید منتخب حسین ابن حیات النبی کی زوجہ باڑی کے غلام شاہ حسین کی بیٹی سیدانی نام کی تھیں، جن سے دلدار حیدر پیدا ہوئے۔ دلدار حیدر کے بیٹے سید محمد حیدر کے یہاں دو بیٹے حسین حیدر، ظہور حیدر تولد ہوئے۔ حسین حیدر کی شادی طفیل فاطمہ بنت محمد صادق بن اولاد رسول بن شاہ سید آل برکات عرف ستھرے صاحب مارہروی سے ہوئی۔ ان ہی حسین حیدر اور طفیل فاطمہ کے بیٹے سید آل عبا تھے جو حاتم زئی قبیلہ سے تھے، تولد ہوئے۔

اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُناث کی طرف سے آپ کا تعلق یقیناً سادات بلگرام سے تھا، لیکن باپ کی جانب سے آپ کا خاندان دوسرے لاحقہ سے تھا۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ آل عبا صاحب نے اپنی تحریر خاص میں نہ تو بلگرامی تحریر کیا اور نہ ہی مارہروی بلکہ محض زیدی تحریر کیا ہے۔ یہ تحریر ۱۶ رنومبر ۱۹۵۹ء کی رقم کردہ ہے، یعنی اب سے تقریباً ساٹھ سال قبل کی تحریر ہے۔

راقم سید مرتضی حسین بلگرامی پہلی بار دہلی ۴ رنومبر ۱۹۴۴ء کو پہنچا تھا اور سید احسن صاحب ابن شاہ سید علی احسن مارہروی (سجادہ نشین مارہرہ شریف) جو ۲۸ چتر گپتا روڈ، نئی دہلی میں مقیم تھے، اور میرے حقیقی پھوپھا تھے، ان کے پاس مقیم رہا اور ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کی دوپہر کو، حالات دہلی کے ناگفتہ بہ ہونے کے باعث علی گڑھ آگیا۔ اسی تاریخ کو دہلی پھر

مسلمانوں کے لیے قہر سامانی بن گئی۔ سید احسن صاحب کا کوارٹر لوٹ لیا گیا، اثاثہ لاوارث خیال کر کے لوگوں نے اپنا لیا۔ البتہ احسن صاحب اور ان کے اہل و عیال چوں کہ سرکار برطانیہ کے ملازم تھے، اس لیے ان کی جانیں بچ گئیں اور خدا جو مسبب ہے، قادر مطلق ہے اس نے کفالت کی اور ان سب کو بعافیت کراچی پہنچا دیا۔

اس تفصیل سے قطع نظر ۱۹۴۴ء کے آخری ایام سے ۔لے کر، ابتدائی تواریخ اگست ۱۹۴۷ء کے ایام دہلی میں بہت سکون اور آرام کے تھے۔ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے ملاقات کا سلسلہ ریڈیو اسٹیشن، اردو بازار اور دلی کالج کے سوا قرول باغ میں جامعہ ملیہ اور مکتبہ جامعہ کے متوسلین سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی خوب تھا۔راقم کا پہلا مضمون ''ایک شام'' پہلی بار اخبار انصاری دہلی نے شائع کیا تھا اور علمی حلقہ میں پسند کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۵ء کا ہے، خود سید احسن صاحب کے مضامین اخبار و رسائل کے سوا کتابی شکل میں بھی وقار فاطمہ کے نام سے برابر شائع ہوتے تھے۔ اس کے سوا اردو کے ادیب اور شاعر بھی موقع سے کوارٹر پر تشریف لایا کرتے تھے۔ ادبی ماحول میں دن رات گزرا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ہفتہ میں کم از کم ۲ بار لازمی آل عبا صاحب آیا کرتے اور گھر کی، خاندان کی باتیں ہوا کرتیں۔ آل عبا صاحب اور میرے والد سید ابو محمد بلگرامی صاحب ایم.اے.او.کالج کے طالب علم تھے، ہم راز بھی اور ہم قبیلہ یعنی بلگرام و مارہرہ کے متوطن۔ اس اعتبار سے میں آل عبا صاحب کو چچا سے مخاطب کرتا تھا۔ ہم دونوں جلد ہی بے تکلف بھی ہو گئے۔ ویسے بھی ان کی ذات تصنع اور ظاہر داری سے مبرّا تھی۔ میرا اکثر و بیشتر ریڈیو اسٹیشن جانا ہوتا تھا اور وہاں کے ارکان سے میل جول بھی ہو گیا تھا۔ خصوصی طور پر دیہاتی پروگرام کے انچارج چودھری صاحب سے جو پنجاب کے مسلمان خاندان سے تھے، مگر اپنی ذمہ داری کے سبب یا سادگی پسندی کے باعث نہایت سادہ لباس پہنا کرتے۔ کبھی کبھی دیہاتی پروگرام میں مجھے بھی شریک کرا لیتے۔ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر سرپرست بخاری صاحب نہایت شگفتہ مزاج اور لطف پرور شخص تھے۔ عملہ کے ساتھ کیسا حسن سلوک تھا اس کی بابت عرض کرنا دشوار ہے مگر آل عبا چچا سے وہ بھی بے حد اخلاص اور کبھی کبھی بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ چچا بھی اپنی کج ادائی اور لہجہ کی وارفتگی سے جب بات کرتے تھے تو غصہ ور بھی خاموش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک بار چودھری سلطان (دیہاتی پروگرام) سے کسی بات پر چخ ہو گئی۔ دو دن بعد مجھ سے کہا اب چودھری کے پاس نہ جاتا۔ میں لاعلم تھا۔ جواباً کہا، وہی تو ایک ذات سلطان کی

یہاں ہے، اس سے نہ ملوں؟ کیسے ممکن ہے۔ تھوڑی دیر بعد کہا: اچھا آؤ، میں ہمراہ ہو گیا۔ اپنے کمرے سے پہلے ڈائریکٹر بخاری کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ دورے پر تھے پھر چودھری صاحب کے کمرے تک آئے اور دروازے پر کھڑے کہا: میرے عزیز کا کہنا ہے کہ ریڈیو اسٹیشن پر یہی ایک سلطان ہے۔ اسی سے نہ ملوں؟ اس جملہ کے سنتے ہی چودھری سلطان اٹھ کر دروازے پر آئے اور بغل گیر ہو کر کہا: دو دن سے دل پریشان تھا۔ اب سکون آیا۔ ہاں بخاری صاحب نے کہا ہے کہ عبا سے کہہ دینا کل ذرا فوجی پروگرام میں وارے نیارے سا پیغام نشر کریں گے۔ بعد میں دریافت کیا یہ وارے نیارے کیا بلا ہے؟ کہا: بچو تم کیا جانو، یہ طلسماتی دنیا ہے، اس کے احکامات اسی طرح دیئے جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ فوجیوں کی دلچسپی کے مدنظر خود کلامی کی جائے۔ وہ کروں گا، کہ اسی کی تنخواہ ملتی ہے اور گزر اوقات کا وسیلہ ہے اچھا خیر۔ پرسوں اتوار ہے، دوپہر کو ارہر کی دال بگھری ہوئی لہسن سے اور بھات کھانے آؤں گا۔ یاد رکھنا عرض کیا: آپ کی آمد فراموش ہونے والی نہیں ہے۔

دراصل اس بات سے کم ہی اشخاص واقف ہوں گے کہ آل عبا چچا کو ہر روز مزاحیہ کلمے کے جملے وضع کرنے پڑتے تھے اور فوجی پروگرام میں پیش کرنا پڑتے تھے، روزانہ ایسا پروگرام وضع کرنا جو فوج کے لوگوں کو وقتی تفریح مہیا کرا سکے، آسان بات نہ تھی۔ مگر وہ اپنی طبع سے ایسے سخت مرحلہ کو آسان بنا لینے کے گُر سے واقف تھے۔ یہی سبب ہے کہ ریڈیو اسٹیشن میں کوئی دوسرا ان کی ہمسری نہ کر سکا۔

ایک گفتگو میں دریافت کیا کہ آپ اپنے کو بلگرامی کیوں نہیں لکھتے؟ چہرے کو ذرا ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا: میاں بلگرامی جیسا وصف کہاں ہے؟ عرض کیا کہ خو بو تو ہے نا؟ ایسی نوک جھونک ہم میں برابر ہوا کرتی تھی۔ افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے سانحہ نے جدا کرا دیا، مگر اس کے بعد بھی جب ملتے تو ویسی ہی مشفقانہ باتیں کرتے تھے اور قدیم تذکرے کر کے بیتے ایام کو ضرور دہراتے تھے، بلکہ عرض کروں، خاندانی باتیں کم اور دنیاوی امور پر زیادہ گفتگو ہوا کرتی تھی۔

میرا تعلق ایسے خاندان سے ہے، جس سے صفیر بلگرامی اور احسن مارہری کا سلسلہ ملتا ہے، ادب اور ادبی ماحول سے ابتدا عمر سے وارفتگی رہی۔ علی گڑھ کے قیام میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور دیگر اساتذہ کے سوا ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، دہلی کالج کے موسوی صاحب،

وغیرہ سے رابطہ خاصا رہا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی طبع سے الگ شان کے فرد تھے۔ ان کی زبان جہاں شعوری وادبی تھی، وہیں ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ دس بیس سال پرانی بات بھی ان کے حافظہ میں آج کی طرح تازہ رہتی تھی۔ بظاہر وہ خود فراموشی کا شکار نظر آتے ہوں مگر حق یہ ہے کہ ان کو کراماتی صفت اللہ نے بخشی تھی۔ معمولی سی معمولی بات بھی ان کے قلم سے جب نکلتی تو اہم تر ہو جاتی تھی۔ راقم سے وہ ایک لطف خاص اور رغبت و تعلق نیک رکھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دہلی آنا چاہتے تو مجھے مطلع فرما دیتے کہ کس تاریخ اور کس ٹرین سے تشریف لائیں گے۔ حالاں کہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے محکمہ جاتی اشخاص اور سرکاری عملہ بھی حاضر ہوتا۔ مگر دراصل ایک بار رشید صاحب کا اور میرا ساتھ علی گڑھ سے دہلی کا ہو گیا، دہلی اسٹیشن پر بھی ان کو سیڑھی کے بجائے اندرونی لفٹ سے ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر لے گیا۔ اس طرح ان کو زینہ چڑھنے اور اُترنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔ اس سہولت کے سبب وہ مجھے یاد فرماتے تھے۔ مجھے بھی اس خدمت میں لطف آتا تھا۔ چنانچہ ایک بار ذاکر صاحب (نائب صدر ہند) نے رشید صاحب سے فرمایا کہ آپ مجھے مطلع کر دیا کریں کوئی اسٹیشن جا کر ریسیو کر لے گا۔ بلگرامی صاحب کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ مسکرا کر کہا: آپ کے آدمی کو کوئی لفٹ نہ دے گا۔ اس جملہ میں جو مزاح ہے، اس کا لطف دراصل لفظ لفٹ میں ہے، جو ذو معنی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

ایک گفتگو میں ایم۔اے۔او کالج اور ہوسٹل کی زندگی کا چرچہ، پلنگ اور کرسی کی کرکٹ کا تذکرہ ہو رہا تھا، ساتھیوں کے مزاج اور پھکّو بازی کا ذکر آ گیا۔ رشید صاحب نے اپنے چہرے کے زاویے کو بدل کر کہا: ہم لوگ علی گڑھ اپنے گھر، شہر یا دیہات سے نہیں کوہ مریخ سے داخلہ کے لیے آتے تھے۔ دراصل رشید صاحب کا پرواز تخیل ہی ایسا تھا، نری لفاظی نہ ہوا کرتی تھی۔ اسی ضمن میں ایک نام 'کاؤس جی' کا لیا۔ دریافت کیا کہ یہ نام والد ماجد ابو محمد صاحب بلگرامی بھی لیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک نام 'منگو' کا بھی والد صاحب لیا کرتے ہیں۔ خیر منگو کا تو پتا چلا۔ یہ صاحب بعد میں دہلی کالج اسکول کے ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل بن گئے تھے، مگر 'کاؤس جی' تو پارسی جیسا نام ہے۔ زہر خند کرتے ہوئے بتایا۔ بلگرامی صاحب علی گڑھ میں نام دینے کے لیے کبھی بھی لغت، ڈکشنری یا کلام پاک کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وقت خود نیک نام دے اور بروقت جسے جو نام دے دیا وہ اس کی کنیت بن جاتا تھا۔ اب سالانہ عہدی داری اور نام کی تجویز کا سلسلہ ختم سا ہو گیا، مگر یہ تھی بہت کام کی شے، بڑی کاوش کر کے صحیح اور

بار آور نام اس کی ہیت، شخصیت، مزاجی کیفیت اور اثر رسوخ کو دیکھ کر، بلکہ نظر میں رکھ کر، نام مجوز کیا جاتا تھا اور وہ ایسا فٹ بیٹھتا کہ شخص مذکور بھی مطمئن ہوتا کہ اس سے بہتر نام تو والدین کو بھی میسر نہ آتا۔ لہٰذا کاؤس جی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سید آل عبا قادری جو مارہرہ کے متوطن تھے مگر انگریزی لب ولہجہ میں بولتے۔ اتفاق کی بات یہ بھی تھی کہ ہمارے ماحول میں اردو کے علم بردار اقبال سہیل اور انگریزی کے غازی ذاکر صاحب تھے، لیکن آل عبا کا لہجہ انگریزی بلکہ پارسی صیقل شدہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ان کا نام جو تجویز کیا گیا۔ وہ مصدقہ 'کاؤس جی' تھا اور اس نام پر کبھی آل عبا نے نہ شک کیا، نہ ہی اعتراض۔ بُرا ماننے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔

عم ذی قدر سید آل عبا صاحب کا خاندانی سلسلہ ابتدائی سطور میں نظر سے گزر چکا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن کے مختصر کوائف میں ایک اہم بات یہ بیان کرنے سے رہ گئی کہ چچا آل عبا صاحب کو روزانہ ہی 'فوجی پروگرام' میں نئے نئے اسلوب، نئی نئی باتوں، نئے اذکار جدید واقعات، جس میں سماجی، فلاحی، لطف آمیز طور پر بیان کرنا، لازم تھا تا کہ تھکی ماندی فوجی نگری، کچھ تو تبدیلی محسوس کرے اور زندگی کی تلخی کو فراموش کر کے، مصائب سے مقابلہ کر سکے۔ لہٰذا اس پروگرام کو تفریح کے طور پر پیش کرنے کے لیے صدابندی، لہجہ اور اس کے اتار چڑھاؤ کے لیے موزوں شخصیت ان دنوں آل عبا صاحب کی تھی۔ اور وہ اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی مزاحیہ فیچر لکھا کرتے اور انگریزی اعتبار سے ان کی اہمیت بے حد تسلیم کی جاتی تھی۔ باتوں باتوں میں اور مذاق ہی مذاق میں وہ ایسے جملے ادا کر جاتے جو کتابی بھی ہوا کرتے اور ہوا میں اڑا دینے کے لائق بھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کی آواز کے زیرو بم سے ہی ان کے فیچر پسند عام ہوتے تھے۔ ان فیچر اور پروگراموں میں جہاں انسانی حیات کے مختلف مناظر سموئے ہوتے تھے، وہیں ادبی چاشنی اور حلاوت بھی شریک رہتی تھی۔ رنگارنگی اور شعوری دلچسپی بھی، روایت پرستی، تہذیب اور کلچر کی نمائندگی کی زندہ علامت ہوا کرتے تھے اور فوجی مزاج کے مطابق اسے ڈھالنا، آل عبا صاحب کا معجزانہ کارنامہ ہوتا تھا۔

سید آل عبا (کاؤس جی) ولد سید حیدر حسین حاتم زئی طالب علم بن کر جب ایم۔اے۔او کالج آئے تو ان دنوں رشید صاحب، ذاکر صاحب، اقبال سہیل، آغا حیدر حسن، فجی یعنی فضل الرحمٰن قدوائی وغیرہ یہ محفل کالج تھے۔ جب رسم وراہ بڑھی اور بے تکلفی تو ہونا ہی تھی، یوں کہ طبعاً رشید صاحب اور آل عبا یکساں طبع کے فرد تھے۔ یہی سبب ہے کہ رشید صاحب نے اپنی تحریروں میں آل عبا کو بھی اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ چنانچہ مشہور زمانہ تالیف

رشید احمد صدیقی 'آشفتہ بیانی' میں آپ سے متعلق تحریر کیا تھا:

"......سید آل عبا قادری مارہروی یہ کالج میں عجوبۂ روزگار تھے۔ طاقت لسانی اور علم مجلس میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑوں کی کور دبتی تھی۔ کالج ڈرامیٹک سوسائٹی کے بے نظیر اداکاروں میں شمار ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ حضرات لکھنؤ ان کے اس کمال کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ سارے اوصاف ان پر اس درجہ غالب آگئے تھے کہ اکثر یہ اندازہ لگانا دشوار ہو جاتا تھا کہ سنجیدہ گفتگو کر رہے ہیں یا تفریحاً ایکٹنگ......"

سطور بالا میں عرض کیا ہے کہ فوجی پروگرام میں آپ کی مزاح ہی دراصل معرکہ کی شے ہوتی تھی۔ اس دور میں ریڈیو کی محض صدابندی ہی ہوا کرتی تھی۔ آنکھوں دیکھی بات کا تصور بھی نہ تھا۔ مگر اس ان دیکھی میں ہی فوجی اور غیر فوجی سب محض لہجہ کے اتار چڑھاؤ سے مقصد و مطلب برآری کر لیتے تھے۔ ایکٹنگ کا کمال یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ نقل اصل کے مماثل ہو جائے اور چچا آل عبا صاحب میں یہ صفت بہ درجہ اتم موجود تھی۔ ریڈیو اسٹیشن کے افراد ان کے نام سے کم، آوارہ کی شہرت سے زیادہ آشنا تھے۔ البتہ جب اپنا تعارف کراتے تو پورے سیاق و سباق سے سید آل عبا قادری اس وقت آوارہ کا لاحقہ نہ لگاتے تھے۔

غالباً ستمبر ۱۹۴۶ء کی دوپہر کا واقعہ ہے۔ کھانے میں ارہر کی دال ساگ اور کباب کے تلے قتلے تھے۔ خاندان کا ذکر آگیا۔ شاہ سید جان عالم صیامی مارہروی ان دنوں دہلی میں مقیم تھے۔ رات کا کھانا جامعہ موٹل جو جامع مسجد اور چاوڑی بازار کے نکڑ پر واقع تھا، بلکہ اب بھی موجود ہے، اس میں طلبی تھی۔ اس دعوت صیامی کا ذکر کیا تو کہا: برخوردار ضرور شرکت کرتا مگر وہ وقت تو میرے ناؤ نوش یعنی فوجی پروگرام کے نشریہ کا ہے اور میری موجودگی لازمی ہے، لہٰذا پھر کبھی۔ لیکن موضوع پر ہم دونوں قائم رہے اور دریافت کیا کہ جو لوگ اپنے آپ کو قادری سے منسوب کرتے ہیں ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ حضرت عبدالقادر جیلانی تو اسلام کی آمد اور حضور اکرمؐ کی وفات کے چھ سو سال بعد وجود میں آئے تھے۔ اس عرصہ میں تابعین اور تبع تابعین کی ایک کثیر تعداد گزری ہے۔ ان سے رابطہ کیوں نہ قائم کیا گیا؟ پھر آپ تو زیدی الواسطی کی شاخ سے ہوتے ہیں۔ ذرا تامل کر کے فرمایا: میاں تم خاندان کے شخص ہو اس لیے ایسی بات کر رہے ہو مگر سچ یہ ہے کہ میرے پاس بھی دلیل کے طور پر کچھ نہیں ہے، سوا اس کے یہی سنتے، دیکھتے، پڑھتے آئے ہیں۔ لہٰذا لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے ایک جد نجات بخش فقیر گزرے ہیں ان سے بھی نسبت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ آل عبا چچا نے

اس گفتگو کو سنجیدگی سے لیا اور ۱۹۴۶ء کے بعد جب نومبر ۱۹۵۹ء میں موصوف نے اپنا زائچہ نسبی تحریر کیا تو قادری کے بجائے زیدی تحریر فرمایا اور کہا تمہاری بات جواب سے چودہ سال قبل کہی تھی اس کا جواب نہیں، سد باب ہے۔ میں نے تشکر کے الفاظ ادا کر کے اظہار احسان مندی کیا، کیوں کہ چچا موصوف نے اپنے والد ماجد کے نام گرامی کے ساتھ بھی 'زیدی' کا لاحقہ تحریر فرمایا تھا۔ ممکن ہے کوئی اور اسے معیوب خیال کرے، مگر سچی بات یہ ہے کہ سادات زیدی میں جو فخر ہے اس میں حضرت سیدنا زین العابدینؓ بن سیدنا امام حسینؓ سے نسبت خاص ہے۔ اس کا لطف اور برکت ہی کچھ اور ہے، یوں کہ ہم براہ راست رسول اکرم محمد مصطفیٰؐ کی ذات سے نسبت فاخرہ حاصل کرنے کا شرف حاصل کر پاتے ہیں۔ دوسرے تو پھر ان ہی سے اپنا وسیلہ و واسطہ اور رابطہ قائم کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ خیر یہ چچا بھتیجے کی گفتگو تھی۔ اسے اسی دائرے میں رکھا جائے۔ تحریر اس لیے کر دیا کہ ہمارے درمیان سنجیدہ گفتگو بھی ہوتی تھی۔

اب مختصر حالات قلمی سید آل عبا صاحب ابن سید حسین حیدر کے ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے ان کے تعلیمی اور روزگار سے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ موصوف کی تصانیف بھی جائزہ میں شریک ملے گی کسی حد تک:

نام	:	حیات النبی آل عبا بشیر حیدر زیدی
ولدیت	:	سید حسین حیدر زیدی
تاریخ پیدائش	:	۱۹؍ربیع الاول ۱۳۰۸ھ
مولد	:	سیتاپور (اودھ)
سکونت	:	محلہ رودگران، دہلی
وطن	:	مارہرہ (ایٹہ)
تعلیم	:	(تفصیل امتحانات، سن یونیورسٹی وغیرہ)
میٹریکولیشن	:	گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور، کیننگ کالج لکھنؤ، ایم او کالج علی گڑھ، عثمانیہ کالج، حیدرآباد دکن۔
دیگر کوائف	:	(تصانیف، ملازمت، پہلی غزل یا شعر وغیرہ)

اسرار ہند (ترجمہ)، سفاک وطن (ترجمہ)، بے پرکی، اپنی موج میں، میرا فرمایا ہوا (زیر طبع) سپروائزر محکمہ آب رسانی گلبرگہ دکن، مترجم عدالت ضلع رانچور دکن، صیغہ دار محکمہ نظامت پٹہ سرکار عالی (حیدرآباد دکن)، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

اس قلمی تحریر کے مطابق جو معلومات فراہم ہوتی ہیں، وہ آپ نے ملاحظہ کرلیا۔

اس تحریر کی روشنی میں ہم کو نام کے سلسلہ میں وضاحت کرنی ہے کہ سید دلدار حسین حیدر کے دادا کا نام حیات النبی تھا اور محمد حیدر کے بیٹے حسین حیدر تھے۔ اس طرح حیات النبی کے بیٹے منتخب حسین تھے جن سے دلدار حیدر تولد ہوئے تھے، یعنی چوتھی پشت میں آل عبا آتے تھے، مگر یہ 'بشیر' کا لاحقہ یا اضافی لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ یہ ایک اہم سوال بنتا ہے۔

عموی آل عبا صاحب سے ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد گاہے بگاہے دید وادید ہوتی رہی۔ وہی انداز تمسخرانہ اور تکلم کا قطعیت کے ساتھ ادا ہونا۔ بڑھاپے کے باوصف لہجے میں روانی بلکہ بانکپن۔ حلاوت، شوخی، مگر شائستگی، مترادفات کا استعمال، کبھی اودھی، کبھی دہلوی اور کبھی بیگماتی زبان کی ادائیگی، ان کا خاصہ تھا۔ روانی اور ہلکے پھلکے انداز و الفاظ ان کی شناخت اور علامت تھے جو میں عرصہ چالیس سال سے دیکھ بلکہ برت رہا تھا ابھی موجود تھا۔

اس بات سے کم ہی لوگ آگاہ ہوں گے کہ آل عبا صاحب نے آوارہ اپنا خطاب، لقب یا قلمی نام کیوں رکھا؟ دراصل جن دنوں وہ تعلیمی عمل سے گزر رہے تھے اور اپنے اردگرد ماحول سے طور طریقہ سے بہ طیب خاطر یا بادلِ ناخواستہ نبرد آزما تھے، اپنی انا کو بچانے اور مارہرہ کے نام بلکہ افراد کی منصب داری کو محفوظ رکھنے کی خاطر، قلمی نام آوارہ رکھ لیا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ اس عہد میں اور اس حلقہ میں شائستگی ایک سند کا درجہ رکھتی تھی۔ اس لیے کہ زبان کی غلطی، یا بدذوق الفاظ کے استعمال پر فوراً قدغن لگانا، دستور عام تھا۔ ایسے ماحول میں اگر آل عبا (یا اس دور کا کوئی طالب علم جو معتبر حلقہ کا فرد ہو) استہزائی یا پستی کے الفاظ، جملے استعمال کرے تو ان کے اصل نام پر حرف آتا۔ لہٰذا یہ امر بہتر جانا کہ ایسا قلمی نام تجویز کیا جائے جو ذہانت سے قریب ہو۔ لہٰذا آوارہ پسند کیا۔ اب اگر کوئی تفریحاً بھی آوارہ کہے گا تو وہ خود معتوب کہلانے کا حق دار ہوگا، نہ کہ مخاطب یا شخص خاص! اس کی ایک وجہ خاص اور تھی جو دوران گفتگو دہلی میں خود فرمائی تھی:

عزیزم! آوارہ تخلص یا قلمی نام ہی نہیں ہے۔ یہ وطن، ماحول، خاندان، تعلیم، تہذیب اور معتقدات کے سوا رہن سہن، مشرقیت، دیہاتی پن، غیر شہری جبلت اور ہمارے نقطہ نظر سے اجتناب کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ ورنہ میاں بتاؤ تمہارے اور ہمارے بھی جد اعلیٰ نے کسی سے عشق کیا تھا۔ جس کے فراق میں وہ 'عشقی' ہو گئے یا کسی سے پریم کیا تھا، جس کی جدائی یا الفت میں 'پیمی' بن گئے تھے۔ سوا عشق الٰہی کے ان کے کردار میں کیا تھا؟

اور یہ حقیقت ہے کہ عموی آل عبا صاحب دہلی کی عام زندگی صاف ستھری اور بے بب تھی۔ ریڈیو اسٹیشن اور رود گران میں کہیں بھی ان کی زندگی کی بابت کوئی تنقیص کی بات سامنے نہ آئی، نہ ہی سننے کو ملی۔ دراصل رواداری، نرم مزاجی اور خوش گفتاری ان کی اصل تھی۔ آشوب حالات میں بھی موصوف اپنے آپ کو مطعون کرانے سے باز رکھنے کے گر سے آشنا تھے۔ اور یہی وصف ان کا امتیازی تھا، جو ہر موقع مجلس اور محفل میں کام آیا۔

باتیں بہت سی ہیں مگر تکرار یا تفصیل سے گریز کرتے ہوئے موصوف کے متعلق پروفیسر رشید احمد صاحب کے اس خیال کے بعد مزید کسی بات کا اعادہ کرنا نامناسب ہوگا اور نہ ہی ممکن کہ دونوں طالب علمی کے عہد کے آشنا تھے اور قریب تھے۔

''...... مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جس زمانہ میں منٹو سرکل کالج بورڈنگ ہاؤس تھا، ہم لوگ نظاہر باہر گھنٹے کے انتظار میں اسٹریچی ہال کے سامنے مولسری کے درخت کے نیچے کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سید آل عبا صاحب قادری (کاؤس جی) بھی اپنے خاص انداز میں ہیملٹ کا تصور کر رہے تھے۔ اتنے میں چند اصحاب اور آگئے۔ چہرے پر پریشانی، جوتوں پر گرد، ہاتھ میں کاپیاں، آنے کے ساتھ ہی پوچھنے لگے، کون سا گھنٹہ ہے؟ پھر سوالی ہوئے۔ پروفیسر آئے؟ گھنٹے میں کتنی دیر ہے؟ آل عبا یکلخت چونک پڑے اور ان کا چونک پڑنا بھی عجیب لطف کا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ نووارد کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر فرمایا۔ کیا جناب اجازت دے سکتے ہیں کہ دریافت کروں۔

آپ کا دولت خانہ منٹو سرکل تو نہیں ہے؟' اس پر سب ہنس پڑے۔ آل عبا صاحب اب بھی کافی سیریس تھے، لیکن لہجہ کسی قدر نرم کر کے بولے۔ کیوں حضرت علی گڑھ کوئی پاٹ شالہ ہے جو آپ یہاں پڑھنے کی نیت سے آئے ہیں۔ آپ کے غریب والدین کو کیا خبر صاحبزادے ان کی دولت یوں لٹا رہے ہیں۔ میاں تم کو بکی بارک کے غسل خانے میں بھی جگہ نہ ملی کہ رخ اور پاپوش مبارک صاف کر لینے کی توفیق ہوتی۔''

سید آل عبا صاحب آوارہ تخلص کو میرے والد نے کبھی آوارہ نہ کہا۔ دہلی اسکول کے پرنسپل کو ہمیشہ 'منگو' سے مخاطب کیا، مگر آل عبا صاحب کا نہ کبھی نام لیا نہ ہی تخلص کا لاحقہ استعمال کیا۔ بلکہ 'کاؤس جی' ہی کہا، اور جب کبھی میں نے ابا کا سلام موصوف سے کہا تو یہی فرماتے۔ ان کو کاؤس جی کا سلام آخر کہہ دینا۔ میں نے کبھی موصوف سے اس خطاب کی بابت سوال کرنے کی جرأت نہ کی۔ جب کہ والد ماجد کا انتقال ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ میں ہوا اور یونیورسٹی

قبرستان، ایم۔اے۔او کالج منٹو سرکلر کے پاس 'منٹواسی' آخری آرام گاہ پائی۔ والد ماجد کے انتقال کے گیارہ سال بعد ۱۹۸۷ء میں عم ذی قدر آل عبا صاحب نے مارہرہ ضلع ایٹہ میں رحلت کی اور اسی بستی کو اپنا مدفن بنایا۔ البتہ والد ماجد کے انتقال کے بعد جب خبر سنی تو علی گڑھ آئے اور تعزیتی کلمات کے سوایا علاوہ یہ بھی فرمایا: میاں تم کیا جانو ابو محمد کیا تھے؟ وہ ہم عصر، دوست، ہم نوا کے سوا، عزیز بھی تھے۔ اور یہی عزیز داری ہماری اصل تھی دوست تو بہت سے تھے مگر عزیز تو عنقا تھے۔

سید آل عبا زیدی الواسطی کی تصانیف کی بات رہی جاتی ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست میں بے پر کی، میرا فرمایا ہوا، اپنی موج میں کے سوا وہ مضامین بھی شریک حال ہونا ضروری ہیں جن کو موصوف نے اپنی تالیفات کے ذیل میں خود رقم کیا ہے۔ اپنی موج میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بہت عمدہ اور نرالے انداز کا دیباچہ یا مقدمہ تحریر کیا تھا، جو خود ایک تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ افسوس کہ ایسا صاحب طرز اور نوع دگر فرد ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا، مگر اس کی یاد تا قیامت باقی رہے گی۔

☆☆☆

پروفیسر تلوک چند محروم کی نادر تحریر

''اردو دنیا'' جو قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ ہے۔ اس کے شمارے لایق اعتبار و لایق حفاظت ہیں۔ اس سلسلہ میں عرض کر دوں کہ جب میرا تعلق Tub یعنی ترقی اردو بورڈ (وزارت تعلیم حکومت ہند) سے ہوا اور پروفیسر عبدالعلیم صاحب جو مشیر وزارت تعلیم اور چیئرمین ترقی اردو بورڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ اس دور میں دو اہم تجاویز چیئرمین کے زیر نظر تھیں۔ پہلی تجویز اردو کے مایہ ناز نقاد۔ محقق، رشید حسن خاں کی تقرری کا مسئلہ تھا۔ دوسری تجویز علیم صاحب کی یہ بھی تھی کہ اردو کا ایسا رسالہ جو یادگاری اور معیاری ہو، اس پر غور کر کے اردو خواں کے لیے پیش کیا جائے۔ اول بات تو یہ کہ علیم صاحب کی مدت حیات کم رہی۔ دوسرا سبب یہ کہ ان دنوں ''لغت سازی'' پر زیادہ زور دیا جانا لازم تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ علیم صاحب کی توجہ بلکہ شدت کے سبب نئی اردو لغت کی تاسیس ہی نہیں بلکہ تکملہ بھی ممکن ہو سکا۔ وہ ہر مقام پر اس اسکیم کے افراد کے ہمراہ گھنٹوں بیٹھ کر صلاح و بحث میں شرکت کرتے۔ ایک بار جامعہ ملیہ میں شرکاء لغت سازی نے چیئرمین سے بحث کرتے ہوئے اعتراض کیا، آپ زبان کو فعل و مصدر کے احاطہ میں رکھ کر بنانے کی فکر نہ کریں۔ علیم صاحب نے خوش طبعی سے کہا۔ آپ لوگ اپنی رائے سے الفاظ اور اس کے معانی کو تحریر کریں۔ اس پر تمام شرکاء نے کہا۔ مگر تعاون ضرور ملے۔ خیر اس بات سے قطع نظر، میں اس وقت رسالہ کا ذکر کروں کہ اگر علیم صاحب کی حیات ہوتی، تب بھی شاید اتنا خوبصورت اور جامع رسالہ کی اشاعت اردو میں نہیں ہوتی۔ جو موجودہ صورت حال میں ہے۔ مثلاً مجھے اتفاق ہے کہ اول تو پہلے اس رسالہ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، جو موازنہ کروں، مگر جو بھی چند رسالہ اب نظر سے گزرے ہیں، وہ لایق تعریف و توصیف ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے بھی اور افادیت کے طور سے بھی۔ مثلاً شمارہ نمبر ۱۴ جولائی ۲۰۱۲ء کا ہے، اس میں ابن صفی پر صفحہ ۲۵ سے ۳۶ تک طویل معلوماتی مضامین اور ان کے کلام کا انتخاب مندرج ہے۔ میری نظر میں پہلی بار یہ منظر نامہ آیا ہے۔ ورنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے بلکہ اس زمانہ کے کسی مضمون میں میں نے لکھا بھی تھا

’’قاضی عبدالودود صاحب نے ابن صفی کے ناول کو تضیع اوقات اور سفر میں اسے بس سطحی طور پر پڑھنے کا خیال ظاہر کیا تھا، اور یہ بھی فرمایا تھا اسے ادب کے کسی صنف میں، خصوصی طور پر ناول کی صنف میں رکھنا، غیر ادبی بات ہوگی۔ ہم قاضی صاحب کی اس بات سے اتفاق کریں یا نہ کریں، مگر آپ نے ابن صفی کو اس شمارہ کے واسطہ سے دوامی کرادیا ہے۔

یہ تو ذیلی اور ضمنی بات درمیان میں آگئی۔ دراصل مجھے اردو کے بزرگ اور صاحب فکروفن جناب تلوک چند محروم سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ میں نے ۱۹۵۸ء سے اب تک اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات ان کے اپنے دست و قلم سے تحریر کرانے کی طرح ڈال رکھی ہے۔ اس خاکہ میں جہاں رشید احمد صدیقی، ذاکر صاحب، فراق گورکھ پوری، غلام احمد فرقت کاکوروی، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، کرشن چندر، آل احمد سرور اور مسعود حسین خاں کے علاوہ ابن انشاء، میرزا ادیب، ساحر لدھیانوی، حفیظ جالندھری، قاضی عبدالستار، مالک رام، فنا نظامی کان پوری، سید حامد، وارث علوی، مہذب لکھنوی اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ شریک ہیں۔ نیز پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی (ولادت ۱۳/ جولائی ۱۹۲۶ء) بھی شریک ہیں۔ ان کے سوا پاکستان و ہندوستان کے نام ور صحافی اور اردو کے محسن بلکہ شیدائی، قابل احترام محمد طفیل (ابن نقوش) کی سوانح بھی شریک ہے۔ اس تفصیل سے مدعا صرف اس قدر ہے کہ اس کشکول کے ذریعہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے قلمی نمونے بہم ہوسکتے ہیں۔

اس طول کلامی کی معذرت کے بعد، تلوک چند محروم کے حالات ان کے اپنے دست و قلم کے ہدیہ ناظرین ہیں۔ یہ نادر تحریر ۱۴/ مارچ ۵۹ء کی ہے۔ ان دنوں میں انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ (PIB) سے متعلق تھا اور جگن ناتھ آزاد صاحب انفارمیشن آفیسر کے والد محروم صاحب سے بھی ملنا جلنا ہوتا تھا۔ جو لوگ موصوف سے ملے ہیں وہ ان کی طبع سے واقف ہیں۔ میرا واسطہ دفتری کے سوا آزاد صاحب سے صفاتی بھی تھا۔ محروم صاحب سے کئی بار گفتگو میں غالب اور صفیر بلگرامی سے متعلق گفتگو آئی۔ میری دانست میں اتفاقی طور پر بھی اور واقفیت کے اعتبار سے بھی ایک نشست میں آزاد صاحب نے اپنے والد سے کہا تھا۔ بابا۔ آپ بلگرامی صاحب کا امتحان نہ لیں۔ یہ اس خانوادہ سے ہیں جہاں سے علم و آگہی کی خیرات بٹا کرتی تھی۔ ان کے خزانۂ یاد میں بہت سے واقعات، راز پنہاں کے بطور، پوشیدہ ہیں۔ محروم صاحب نے اپنے اختتامی لہجہ میں کہا تھا ’’آزاد ہم تم اس سید سے گفتگو بغرض

امتحان نہیں کرتے، بلکہ معلومات میں اضافہ کی خاطر ہی کرتے ہیں''۔میں نے موصوف سے عرض کیا۔حضرت والا آپ استاد مکرم ہیں۔ہم جیسے نااہل، آپ کی سرپرستی میں، شفقت میں، کچھ حاصل کرنے کے امیدواروں میں ہیں۔پٹھانی ہنسی میں فرمایا بلگرامی صاحب میرا ایک شعر ہے۔

خلش نے دل کو مرے کچھ مزا دیا ایسا
کہ جمع کرتا ہوں میں خار آشیاں کے لیے

مگر آپ کی ذات اس شعر سے مستثنیٰ ہے۔ہاں آپ کے موقر رسالہ میں محروم صاحب کے مطبوعہ مضامین کی تفصیلات شامل نہیں ہیں۔میرے کشکول میں موصوف کے دست وقلم سے ان کی وہ تصانیف جو اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں تحریر ہیں۔یہ اردو دنیا کے لیے نئی یافت بھی ہو سکتی ہے۔

اس کے سوا تلوک چند محروم کے متعلق مالک رام بوبچہ نے تذکرہ ماہ وسال کے صفحہ ۲۳۵ پر جو حالات قلم بند کیے ہیں وہ بھی لائق مطالعہ ہیں۔

محروم : تلوک چند (پروفیسر)

ولادت: گاجرانوالہ (ضلع میاں والی) یکم جولائی ۱۸۸۷ء

وفات : نئی دلی (ولنگڈن ہسپتال) جمعرات صبح ۵ بج کر ۴۰ منٹ ۶رمئی ۱۹۶۶ء۔(اسی شام کے ۴ بجے نگم بودھ گھاٹ پر لاش سپرد آتش کی گئی)

تاریخی مصرعہ وفات:

طوطی خوش لہجہ ہے خاموش آج وائے (نور) ۱۹۶۶ء
آہ آب گل ہوا چراغ سخن (قمر سنبھلی) ۱۹۶۶ء

سب سے آخر میں محروم صاحب کی ''سوانحی مختصر تحریر'' ان کے دست وقلم کی ملاحظہ کریں۔

پروفیسر تلوک چند محروم کی نادر تحریر

[ولادت: یکم جولائی ۱۸۸۷ء
وفات: ۶ جنوری ۱۹۶۶ء]

نام :- تلوک چند - تخلص :- محروم

ولدیت :- بھگت رام دیال

تاریخ پیدائش :- ۱۸۸۷ء (یکم جولائی ۱۸۸۷ء)

ساکن :- عیسیٰ خیل ضلع میانوالی - مغربی پنجاب (پاکستان)

تعلیم :- بی - اے (پنجاب یونیورسٹی) - سینیئر انگلو ورنیکولر (ڈیپارٹمنٹل)

مختصر حالات مع تصانیف :-

ملازمت :- پچاس سال (۱۹۰۸ء تا ۱۹۵۸ء)

۳۵ سال مختلف مدرسوں میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر، سیکنڈ ماسٹر و ہیڈ ماسٹر رہے۔
قریباً ۱ سال بطور لیکچرر ڈسٹرکٹ آرمی سنٹر راولپنڈی + ۴ سال بطور لیکچرر گارڈن کالج راولپنڈی
۱۰ سال پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج دہلی + سکولوں کی ملازمت کے آخری ۱۰ یا ۱۲ سال ناگوار اور
ناخوشگوار حالات کا سامنا رہا - چنانچہ ۱۹۴۲ء میں سبکدوش ہونے پر یہ قطعہ کہا پڑا ہے

سی و پنج سال عمرم بہ ملازمت بسر شد — سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم
شرفم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی — بہ سگانِ ادب محروم بہ خواری سلام کردم

کالج کی ملازمت کا زمانہ بہ آرام و اطمینان گزرا - "انت عملا بسو عملا"

شاعری :- طبیعت بچپن سے موزوں تھی - ابتدائی کلاسوں میں شعر کہنا شروع ہو گیا - ابھی میٹرک میں
تھا کہ تخلیقی رسالہ زمانہ کانپور اور مخزن لاہور میں شائع ہونے لگیں -

تصنیفات :- کلام محروم حصہ اوّل - حصہ دوم - حصہ سوم - گنجِ معانی - رباعیاتِ محروم - نیرنگِ معانی
گنجِ معانی اور رباعیات کا دوسرا ایڈیشن دہلی میں تقسیم کے بعد شائع ہوا -

[illegible]

تاریخ :- ۱۴ مارچ ۱۹۵۹ء
دستخط :- تلوک چند محروم
نئی دہلی

آہ نواب رحمت اللہ خاں صاحب شروانی

رحمت اللعالمین رحمت نازل فرمائے، نواب رحمت اللہ خاں صاحب شروانی پر، جواَب ہمارے درمیان نہیں رہے، گو وہ عمر میں مجھ سے کچھ چھوٹے تھے (۱۹۲۹ء پیدائش) مگر علم و فیض رسانی میں بہت بڑے تھے۔ اخلاق ان کا وسیع اور ملنساری میں یکتا فرد تھے۔ راقم سے مزاج اور مذاق زیادہ ہوتا تھا۔ دراصل وہ علم شناس اور روشن ضمیر فطرت کے مالک تھے۔ مجھے یاد ہے جب جامعہ اردو کی توسیع ہوئی اور سید ظہیر الدین علوی صاحب (استاد شعبۂ اردو و انچارج میگزین شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی) نے نواب صاحب سے تنگی داماں کا ذکر کیا، تو بلا غل وغش آپ نے جانسن کمپاؤنڈ کی عمارت پیش کردی اور جامعہ اردو کا دفتر علوی صاحب کے پلنگ (۳ نذیر احمد روڈ) سے اٹھ کر شعبہ اُردو کے ایک تاریک کمرے سے اٹھ، جانسن کمپاؤنڈ کی عمارت پہنچ گیا۔ جہاں وہ کم و بیش ۱۵-۲۰ سال رہا اور جب وزیر اعلیٰ کشمیر بخشی غلام محمد صاحب کی توجہ و عطیہ سے جامعہ اردو کی اپنی عمارت وجود میں آئی۔ تب نواب صاحب کے عمارت کی گلو خلاصی ہوئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عمارت سے ملحقہ مکان بھی جامعہ اردو کی تحویل میں رہا۔ جہاں اسسٹنٹ رجسٹرار سید حامد حسین جیلانی معہ اہل وعیال کے مقیم رہے۔ نواب صاحب نے ایک پیسہ بھی کرایہ کی مد میں قبول نہیں کیا۔ داد و دہش کا حال نواب رحمت اللہ صاحب کا یہ تھا کہ ضرورت مند طلباء اور حاجت مندوں کی امداد کو اپنا فریضہ خیال کرتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی بقا اور ترقی کے لیے اپنے والد نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی مثل فکر مند رہتے تھے، عہدہ ان کے لیے کوئی اعزاز کی بات نہیں تھی بلکہ عہدہ کو ان کی ذات سے اعزاز حاصل تھا۔ کتب بینی کا شوق بہت تھا۔ رسائل و کتب کی خریداری پر صرف کثیر فرماتے تھے، جن دنوں میں مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کا مینیجر تھا تو نواب صاحب کے فرمان کے مطابق ہر نئی کتاب کی تفصیل ان کو روانہ کرا دیتا تھا۔ اگر کبھی کسی نئی کتاب کا علم ان کو کسی اور طرح ہوا تو وہ شکائت کناں ہوتے تھے۔ اور کہتے تھے ایک روٹی کم کھاؤ مگر مطالعہ کتاب ضرور کرو۔ ایک بار میں نے حضرت مولانا تقی امینی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ سے موصوف کا جھگڑا کرا دیا تھا۔ اس عملیہ میں نواب صاحب نے میرا ساتھ دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ میں مولانا کو ''تقیہ'' کرنے والا

کہا کرتا تھا (تقی امینی صاحب کی مناسبت سے) نواب صاحب نے مزاح المومنین کے بطور کہا، ہاں بلگرامی کا یہ کہنا کسی حد تک درست اور واقعی نظر آتا ہے۔ میں نے کہا مولانا نے اجتہاد پر ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی ہے۔ پھر مزاحاً کہا، جبکہ اہل تسنن میں اجتہاد سرے سے ہے ہی نہیں۔ نواب صاحب نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ جہاد تو ہے مگر اجتہاد کہاں ہے؟ افسوس کہ ایسا مفکر اور بالغ نظر، محترم، معززاور تکریم کے لائق عالم دین نے، نماز کی ادائیگی کے لیے وضو کیا اور کچھ لمحہ بعد باوضو رحلت فرمائی۔ گویا وضو اس مادی دنیا کے پانی سے کیا مگر نماز کی ادائیگی، رب اکبر کے حضور حاضر ہوکر، ادا کرنے کی طرح ڈالی۔

اس اور اس طرح کے بہت سے واقعات ایسے ہیں، جس سے نواب صاحب کے مزاج کا علم ہوسکتا ہے۔ افسوس کہ لطائف اور ظرائف اور خوش گپیوں کا فردِ فرید ہمارے درمیان سے ۱۰ر جنوری ۲۰۱۲ء کو اٹھ گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نواب صاحب شعر وسخن اور اہل علم سے مراسم کو پسند خاطر فرماتے تھے۔ اور اپنی آن بان وخوش طالعی، عزت نفس کو مقدم خیال کرتے تھے۔ مراتب شخصی کے سواذی علم افراد کی حرمت کا بیحد خیال کرتے تھے۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے کسی فرد کی عظمت، پاسداری یا عزت پر کوئی کلمہ یا حرف نواب صاحب کے منہ سے نکلا ہو۔ اس کے برخلاف نواب صاحب طبعاً کسی کے زمرے میں خلافِ واقعہ بات سننے کے حق میں نہیں تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب حبیب منزل کے لان میں گزشتہ سال وہ ایک تقریب میں تشریف لائے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اشارہ کیا مجھے بھی ان کو دیکھ کر مسرت ہوئی تھی۔ اور جیسے ہی پاس گیا تو فرمایا "کوئی ایسی ویسی بات مت کہنا" عرض کیا یہی تو موقعہ ہے، جہاں اپنائیت کا اظہار کروں۔ مسکرا کر فرمایا۔ اس کے لیے تخلیہ ضروری ہے۔ بہت کم اشخاص کو اس بات کا علم ہے کہ مزمل منزل سے راقم کا مکان چند منٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں کبھی کبھی حد اعتدال سے بڑھ جاتا تھا۔ مثلاً جب انھوں نے ذاکر موڈرن اسکول کو مزمل منزل کا ایک طویل حصہ عطیہ کیا تو جو لوگ اس کے کرتا دھرتا تھے، ان سے متعلق مجھے آ گاہی تھی کہ وہ لوگ زمینی کاروبار کے ذہن والے ہیں۔ لہٰذا آ گاہی کی کہ سودا عمدہ کیا ہے مگر ہاتھ غلط ہے، تبسم زیر لب سے فرمایا تھا، میں نے تو "علم گاہ" خیال کرکے دیا ہے، اب حشر جو بھی۔ خدا کا شکر کہ وہ اسکول ہنوز باقی ہے۔

ایسے مرد مومن کے لیے دعا ہے کہ خالق جن وانس ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے ورثا کو صبر کی تلقین عطا فرمائے۔ بحق محمد وآلہ۔

بیاد الحاج محمد شریف خاں

نہ جانے کس کا شعر ہے مگر ہے خوب:

کیوں گریزاں ہیں وہ نگاہوں سے
کر لیا دل نے انتخاب جنہیں

میں اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود چپراسی مصداق کے کہنے پر کہ آپ کا فون ہے، کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر ٹیلیفون تک آیا۔ فون اس وقت عام نہ تھے۔ پوچھا کون؟ جواب ملا، میں شریف خاں پرنسل اسکول ہوں۔ عجلت سے جواب دیا، فرمایئے۔ کہا- وائس چانسلر صاحب سے ضروری ملاقات کرنی ہے۔ جواباً کہا۔ شام کو آجایئے گا۔ وقت مل جائے گا اور رابطہ ختم کر دیا۔

شام کی نشست عموماً مغرب کے وقت سے شروع ہوتی۔ ایک صاحب قبل مغرب ہی آ گئے۔ اس عرصے میں حبیب چپراسی نے کہا: پرنسپل صاحب آئے ہیں۔ کہا: ان کو انتظاریہ میں بٹھادو۔ اور ہاں پانی کو دریافت کر لینا۔ پندرہ بیس منٹ بعد درمیانی عرصہ میں باہر آیا تو تین چار نفر بغرض ملاقات وائس چانسلر بیٹھے نظر آئے۔ اندازہ سے دریافت کیا۔ آپ شریف خاں صاحب ہیں! جواب ملا۔ مجھے شریف کہتے ہیں۔ یہ میری اولین ملاقات تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد V.C. سے ملاقات کا موقع مہیا کرادیا۔ یوں کہ وقت کا ملنا دشواری ہی نہیں ناممکن تھا۔ ایک کے بعد ایک کا سلسلہ قائم تھا۔ مگر ہم جیسے فرد موقع نکال کر تکملہ کرانا چاہیں تو کرادیتے ہیں۔ چند لمحہ بعد ہی پرنسل صاحب واپس آ گئے اور کہا۔ کل کوئی وقت دے دیں۔ V.C. نے کہا ہے۔ نظام الاوقات (پروگرام کی لسٹ) دیکھا۔ موصوف پر نظر کی اور ایک منٹ کا وقفہ مانگ کر V.C. کے پاس گیا اور بتایا کہ کل سلکشن کمیٹی ہے۔ کل کسی سے بھی ملاقات کا وقت ممکن نہیں ہے۔ شام کو بھی مصروفیت ہے۔ البتہ ساڑھے پانچ بجے شام کو صرف دس منٹ کا وقت دیا جاسکتا ہے۔ پوچھا: پرسوں کیا کیفیت ہے؟ عرض کیا صبح ساڑھے دس بجے کا وقت دیا جاسکتا ہے۔ تعین وقت کر کے باہر آیا اور صورت حال بتادی۔ جیسے ہی پرسوں کا لفظ سنا قدرے ناراضگی مگر شرافت آمیز لہجے میں کہا۔ ملاقات بے کار ہوگی۔ لہٰذا حالات اور

پرنسپل کی ذمہ داری کو مدنظر رکھ کر صبح 10 بجے کا وقت صرف پانچ منٹ کے لیے طے کر دیا۔ موصوف نے یہ موقع غنیمت جانا۔ اور دوسری صبح ساڑھے نو بجے ہی آ گئے۔ سفید شرٹ اور ڈھیلی پینٹ میں ملبوس تھے۔ جیسے ہی V.C. باہر آئے۔ پرنسپل صاحب کا ذکر کر کے اندر بلالیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ۵-۷ منٹ کے اندر ہی بات ختم کر کے انھوں نے گلو خلاصی کر لی۔

چند ماہ بعد اسکول کے ایک استاد سے متعلق فائل بھیجی گئی۔ اس پر فوری توجہ کا لیبل لگا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق معائنہ کیا اور اسی لمحہ V.C. کے سامنے پیش کر کے آڈر لیا اور اسکول کے چپراسی کو دیا کہ اسے V.C. کے دفتر لیجا کر اندراج کرالو۔ ساتھ ہی دفتر کو فون کر دیا کہ بعد اندراج اس چپراسی کے دستخط یا نشانی انگوٹھا لگوا کر فائل پرنسپل صاحب کو بھیج دی جائے۔ دراصل اسکول کے ایک استاد کو ایک امتحان میں شرکت کی اجازت درکار تھی اور وقت صرف ایک روز کا رہ گیا تھا۔ اس لیے فوری اجازت درکار تھی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ پرنسپل (یا متعلقہ افسر) چاہے تو اپنے اسکول کے اساتذہ کی مدد ان کی بہبود اور فلاح کا سامان بہ آسانی کرا سکتا ہے۔ بس شرط احساس کا ہے۔ اس سلسلے کا ایک ذیلی واقعہ کا تذکرہ کروں کہ سٹی ہائی اسکول کے پرنسپل نے اپنی جانب سے ایک استاد کو ایک کورس میں داخلہ کی اجازت دے دی مگر P.V.C. نے اس فائل کو روک دیا۔ آخری تاریخ داخلہ سے دو روز قبل انکار کی اجازت لکھ کر واپس اسکول کو دی کہ یہ استاد پہلے سے ہی ایک سبجیکٹ میں ایم۔اے۔ ہیں۔ دوسرے کی کیا ضرورت ہے؟ استاد کا مستقبل اس اجازت پر تھا۔ یہ شام کو V.C. لاج آئے۔ دیگر تفاصیل سے قطع نظر۔ لہٰذا دوسری صبح مع درخواست کے بلالیا۔ موصوف پریشان حال تھے۔ سویرے ہی پہنچ گئے۔ ایک گھنٹہ بعد V.C. کے سامنے پیش کر دیا۔ چند منٹ بعد V.C. نے داخلہ کی اجازت تحریری دے دی۔ اب سوال یہ تھا کہ درخواست کو پرنسپل کی معرفت آنا تھا۔ اس کا حل یہ نکالا کہ پرنسپل اسکول کو فون کر دیا کہ اس درخواست پر صرف Forward لکھ کر اپنے اسکول کے استاد عثمانی صاحب کے حوالہ کر دیں۔ V.C. کا اجازت نامہ موجود ہے۔ اور آج ہی رجسٹرار کو پیش کر کے ایم۔اے۔ انگریزی میں داخلہ مکمل کرالیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بعد میں موصوف سٹی اسکول سے شعبہ انگریزی مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ اس معمولی سی خدمت کے صلے میں عثمانی صاحب برابر اظہار تشکر کرتے رہے۔ ایک میٹنگ میں شریف صاحب نے بھی اس کا تذکرہ کیا اگرچہ اس وقت وہ سٹی اسکول کے پرنسپل نہ تھے مگر باخبر تھے۔

شریف صاحب اسکول در اسکول کے بعد ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی کے سربراہ بھی ہوئے۔ تعلیم کے کئی زُمرے سے متعلق بھی رہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی کمیٹیوں سے وابستہ بھی رہے اور ہر جگہ اعزاز پایا۔ N.C.E.R.T. والے بھی آپ کی خدمات سے مستفیض ہونا پسند کرتے تھے اور جس کی آپ سفارش کرتے اسے بھی خدمت پر مامور کردیا جاتا۔

یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران تو ملاقاتوں کا سلسلہ قائم رہا۔ باتیں بھی ہوئیں اور صلواتیں بھی، خوش بیانی، خوش دلی اور خوش گفتاری کے سوا ایک اہم صفت جو میں نے محسوس کی تھی وہ یہ کہ تعلیم سے زیادہ تربیت اور تربیت سے زیادہ اخلاق حمیدہ کو درجہ دینے کے قائل تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ مگر رشتہ داروں اور قرابت داروں کے بچوں کو اپنا بچہ تسلیم کرتے تھے۔ اُن کی بہبود کے لیے کوشاں رہتے۔ تعلیم سے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ ایک بڑا بنیادی مقصد ہے، لیکن اجتماعی، انفرادی، روحانی اور معاشرتی، تمدنی و تہذیبی تعلیم کا حصول اصل مرکز ہونا چاہیے۔ وہ موجودہ طریقہ تعلیم سے بہت زیادہ خوش نہ تھے مگر آج کی مجبوری سے واقف تھے۔ لہٰذا قبول کیے ہوئے تھے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہی قدیم ڈگر سے ضرور آشنا کرادیتے، لیکن سنتا اور مانتا کون؟

ادھر کئی سال سے وہ یوپی رابطہ کمیٹی سے وابستہ تھے۔ مسلمانوں کی اصلاح معاشرتی، تعلیمی حد بندی، صحت و عافیت، سوسائٹی کے نظام اور سیاسی ماحول سے ناخوش تھے۔ اکثر کہتے تھے کہ ہمارا معاشرہ کیوں زوال پذیر ہے؟ یوں کہ اسلام تو محدودیت کا قائل نہیں ہے۔ وہ اس کے بھی مخالف تھے کہ مذہب کو سائنس سے الگ ہونا چاہیے۔ ان کو یقین تھا کہ مذہب خود سائنس ہے۔ ورنہ قرآن پاک میں اب سے چودہ سو سال قبل یہ کیوں اعلان کیا گیا کہ ''مشرقوں کا پیدا کرنے والا، مغربوں کا پیدا کرنے والا یا پہاڑوں کی میخ نے زمین کو باندھ رکھا ہے''۔ یہ مثالیں خود سائنس کی نشاندہی کررہی ہیں۔ لہٰذا ہمارا نظر یہ محدود حلقہ میں بند رہ کر ترقی نہیں کرسکتا۔ وہ اکثر کہتے اور لکھتے تھے کہ تعلیم و تربیت کا توازن بنیادی اصولوں پر منتج ہے۔ اسے برادری یا حلقہ تک محدود کرنا خدا کا انکار ہے، رسول اور ان کے اصولوں سے انحراف کے مرادف ہے۔ اس موضوع کے کئی صفحات پر ان کے خیالات کو پھیلایا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی بھر انھوں نے تعلیم و تعلم اور اس کے نصب العین پر کام کیا اور قلم اٹھایا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے پیش کردہ تعلیمی رجحانات کو یکجا کرکے عام کیا جائے، اور مل

جل کر، اکیڈمی قائم کر کے ان پر توجہ دی جائے۔

افسوس کہ ہمارے درمیان سے ایک مفکر و مصلح و تعلیم کا شیدائی ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا۔ ملت ان سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔ رابطہ کمیٹی ایک بالغ نظر، مدبر، دانشور اور صلح کن مردِ مومن، نمازی، پرہیزگار اور مخلص سے تا اَبد کے واسطے محروم ہوگئی۔ ہر جلسہ، ہر میٹنگ اور ہر سفر کا رہبر ہمارے درمیان سے رخصت ہوگیا۔ شریف صاحب سے متعلق ایک بات اور عرض کردوں کہ وہ محض خیالی نظریات کے قائل نہ تھے، وہ قدیم اور پرانی روایات کے ساتھ حال و مستقبل بلکہ جدید رجحانات کے بھی قائل و حامل تھے۔ مذاق لطیف اُن کا طرۂ امتیاز تھا، ملکی اور بین الاقوامی حالات سے بھرپور واقف تھے۔ اس پر بھرپور نظر رکھتے تھے۔ مختلف ممالک کے سفر کرنے کی وجہ سے وہ ہر برادری اور انسان کی ترجیحات سے آگاہ تھے۔ رسم و رواج اور مسائل سے واقف تھے۔ لوگوں کی نفسیات سے بخوبی باخبر تھے۔ طریقہ عبادات اور ان کے ذہنی ابلاغ پر نظر رکھتے اور ذکر کرنا واجب خیال کرتے تھے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں بقول شاعر:

نظر کو پھیرنے کے بعد تجھ سے
نظر کی جس طرف کو تو ہی تو تھا

مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں بتاریخ ۱۰ر اپریل ۲۰۰۴ء کی صبح بعد نماز فجر سینکڑوں افراد کی موجودگی میں ہر ملت، فرقہ اور طبقہ نے جب ان کو سپردِ خاک کیا تو بیشتر لوگوں کی زبان پر یہی جملہ تھا کہ کل شام کو شریف صاحب جس کار حادثہ کا شکار ہوئے اور لقمۂ اجل ہوئے وہ دراصل ان کی شہادت کی شام تھی۔ آج کی صبح ان کی حیاتی ہے۔ اس لیے کہ ہر نظر ان کی متلاشی رہے گی اور وہ ہر تعلیم یافتہ کے دل کی دھڑکن بن کر زندہ تابندہ رہیں گے۔ خدا مغفرت کرے الحاج محمد شریف خاں صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کو ان کے علمی کارناموں اور خدماتِ ملی کو!

☆☆☆

مسز اندرا گاندھی..........تاریخ ساز شخصیت

صبح نے اُوڑھا کالا آنچل
چھایا ہوا ہے غم کا بادل
سورج کی کرنیں ہیں روشن
پھر بھی سونا، دیس کا آنگن

مسز اندرا گاندھی کی کہانی چاند بی بی اور رانی جھانسی کی ہمت، دلیری، بہادری، سوجھ بوجھ، وَلولہ، جرأت اور جوش سے جا کر ملتی ہے یا نہیں؟ یہ محل اس سوال کے حل کا نہیں ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ اپنے ملک کے لئے عظمت وجلال، عزت وحرمت کا پیکر تھیں۔ انہوں نے ملک کو پس ماندگی سے نکال کر، اندھیروں سے اجالے کی سمت لانے کی کوشش، آخری لمحات تک کی۔ مگر سولہ سال تک مسلسل ملک کی خدمت کا صلہ ان کے جسم میں گولیاں اُتار کر دیا گیا۔ وہ منحوس صبح، جس میں اُن کا جسم چھلنی کیا گیا، وہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کی خون آشام صبح تھی۔ جس نے مسلسل اور جنگی طرز پر زندگی گزارنے والی خاتون کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔

مسز اندرا گاندھی کی پیدائش ۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوئی تھی۔ وہ ایک برہمن گھرانہ کی چشم وچراغ تھیں۔ اور اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ مگر ذہن رَسا پایا تھا۔ دماغ عالی اور فکر بلند، نظر بالغ اور ہمت اَرفع۔ اُن کی مختصر داستان حیات یوں مرتب کی جا سکتی ہے۔

نام	:	اندرا نہرو یا اندرو
پیدائش	:	۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء شہر الہ آباد
خاندان	:	کشمیری برہمن
والد	:	پنڈت جواہر لال نہرو (پہلے وزیر اعظم ہند)
ماں	:	کملا نہرو
دادا	:	پنڈت موتی لال نہرو (نام وَر وکیل اور قومی رہنما)

تعلیم : شوبھارتی شانتی نکیتن۔ پیپلز اُون اسکول پونا سمرویل
کالج اکسفورڈ، بیڈمنٹن اسکول، برسٹل اور سوئزرلینڈ

شادی : ۲۶؍مارچ ۱۹۴۲ء کو شادی ہوئی

شوہر : فیروز گاندھی (پارسی خاندان کے فرد تھے)

اولاد : راجیو گاندھی۔ سنجے گاندھی

ملکی خدمات: دادا اور باپ کے ساتھ چھوٹی سی عمر میں ہی ملکی خدمات میں حصہ لینے لگی تھی۔ بال چرخا سنگھ کی بانی تھیں۔ تحریک عدم تعاون کے دوران کانگریس کی مدد کی۔ اپنی عمر کے ۱۳ ویں سال میں دانر سینا (فوج) کی تنظیم کی۔ ستمبر ۱۹۴۲ء میں شادی کی ۶ ماہ گزرنے کے بعد انگریزی حکومت نے جبر واستبداد سے کام لیا اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں گھر گھر جا کر بحالی اور امدادی کام سرانجام دیئے۔ ۱۹۵۵ء میں پہلی بار کانگریس ورکنگ کمیٹی اور سنٹرل الیکشن کمیٹی کی رکن مقرر کی۔ ۱۹۵۷ء میں کانگریس کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کی رکن مقرر ہوئیں۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدر رہیں۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک وزیر اطلاعات ونشریات رہیں۔ اس کے سوا اگست ۱۹۶۴ء سے فروری ۱۹۶۷ء تک راجیہ سبھا کی ممبر اور ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۱ تک چوتھی سبھا، پھر پانچوں اور چھٹی لوک سبھا کی یعنی ۱۹۷۱ سے جنوری ۱۹۸۰ء تک ممبر رہیں۔ ساتویں لوک سبھا کے لیے رائے بریلی اور میڈک سے انتخاب میں کامیابی حاصل کی مگر عوام کی خواہش کے احترام میں میڈک کی نشست کو برقرار رکھا اور رائے بریلی کی نشست چھوڑ دی۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۷ء تک کانگریس پالیمنٹری پارٹی اور جنوری ۱۹۸۰ء سے کانگریس (آئی) پالیمنٹری پارٹی کے سربراہ کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ جنوری ۱۹۶۶ء سے مارچ ۱۹۷۷ء تک، پھر ۱۴؍جنوری ۱۹۸۰ء سے ۳۱؍اکتوبر ۱۹۸۴ء کی صبح تک، وزیراعظم ہند کی حیثیت سے ملک وقوم کی خدمت کی، اور اپنی جان قوم پر نچھاور کردی۔ اس کے علاوہ دوسال تک فرانسیسی خواتین کی انجمن سے ''مقبول ترین خاتون'' کا خطاب پایا۔ ۱۹۷۱ء میں امریکہ میں ایک خصوصی جائزہ کمیٹی نے ''پسندیدہ حسین خاتون'' کا خطاب دیا۔ اسی سال ارجنٹائن سوسائٹی نے تحفظ جانوران کا اعزازی ڈپلوما دیا۔ ۱۹۸۶ء میں جنگلی جانوروں سے متعلق عالمی فنڈ کمیٹی نے ''گولڈن آرک'' کا خطاب دیا۔ شمالی اور مشرقی مفاہمت کے لئے ۱۹۸۲ء میں ''یوتھانٹ ایورڈ'' امریکہ کی آبادی سے متعلق کونسل کی ممتاز پارلیمانی امور کی ماہر کا ایوارڈ بھی پایا۔ اس

کے سوا اور بے شمار خطابات اور ایوارڈ حاصل کئے، جن کی تفصیل بہت طویل ہے۔

سفر: ہندوستان تو اُن کا اپنا ملک تھا جہاں کے بڑے بڑے شہروں کے سفر کیے مگر دنیا بھر کے اور بہت سے ممالک کا بھی سفر کیا تھا اور اعزاز حاصل کیے تھے۔ ان ممالک کی فہرست تو طویل ہے مگر ان میں چند ممالک کے نام یہ ہیں:

برطانیہ، امریکہ، ارجنٹائنا، آسٹریلیا، طرابلس، بلغاریہ، کینیڈا، برما، چین، جاپان، ڈنمارک، چیکوسلواکیہ، مصر، فجی، فن لینڈ، فرانس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، گھانا، ہنگری، گوئنا، ایران، انڈونیشیا، ائرلینڈ، عراق، کینیا، کویت، لاؤس، لبنان، مالدیپ، ماریشس، منگولیا، میکسیکو، موزنبیق لینڈ، پاکستان، فلپائن، پولینڈ، رومانیہ، اسپین، سعودی عرب، شام تنزانیہ، متحدہ عرب امارات، عمان، نائجیریا، ٹونگا، سنگاپور، سری لنکا، تھائی لینڈ، ٹوباکو، یورا گوئے رُوس، ویتنام نیز اقوام متحدہ کے سرکاری دورے بھی کئے۔ بیل جیم اور اٹلی وغیرہ کے دورے ان کے علاوہ ہیں۔

اعزازی ڈگریاں: ملک اور بیرون ملک کے تعلیمی اداروں نے مسز اندرا گاندھی کی لیاقت وصلاحیت کو مدنظر رکھ کر جو خطابات و اعزازات پیش کئے، ان میں چند کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

جامعہ اردو علی گڑھ، آندھرا پردیش، آگرہ یونیورسٹی، وکرم یونیورسٹی، بنگلور، پنجاب، گوروکل، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، پونا، ٹوکیو، آکسفورڈ، پراگ، ماریشس بغداد، فجی، ساؤتھ پیسفک، بلغاریہ، سوربون وغیرہ جیسی اہم یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

دیگر اہم خدمات: وشو بھارتی شانتی نکیتن کی ۲ بار چانسلر مقرر کی گئیں۔ ۱۹۶۰ء تک یونسکو کی بھارتی وفاعی فنڈ کی اگزیکیوٹو کمیٹی کی رکن مقرر کی گئی تھیں۔ ۱۹۶۲ء تک سنگیت ناٹک اکاڈمی کی چیئر مین بھی رہیں۔ قومی یک جہتی کی ممبر، ہمالین ماؤنٹینیرنگ انسٹی ٹیوٹ، بھارت پرچارنی سبھا، نہرو میموریل میوزیم ولائبریری سوسائٹی اور جواہر لال نہرو میموریل کمیٹی کی صدر بھی رہیں۔ بین الاقوامی قانون سے متعلق بھارتی سوسائٹی کی سرپرست بھی تھیں۔

خطابات: ۱۹۵۳ء میں امریکہ کے دو ایوارڈ اور غیر معمولی تدبر کے لئے اٹلی کا ''ایزابیلا ایوارڈ'' حاصل کیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں ''بھارت رتن'' کا قومی اعزاز ملک کی طرف سے دیا گیا۔ بنگلہ دیش بن جانے پر ''میکسیکن اکاڈمی ایوارڈ'' پایا۔ ۱۹۷۳ء میں غذائی اور زرعی تنظیم کا دوسرا سالانہ تمغہ دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں ناگری پرچارنی سبھا سے خطاب پایا۔ اس کے

سوا پیل یونیورسٹی کا ہائینڈ میموریل انعام بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۸ء تک مسلسل دو سال ''مقبول ترین خاتون'' کا خاتون انجمن خواتین فرانسیسی سے حاصل کر چکی تھیں۔

تصانیف: مسز اندرا گاندھی کو لکھنے پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ مصروفیت اور ملکی ذمہ داریوں کے باوجود وہ وقت نکال کر مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں کتابوں کی تعداد ہزاروں تک تھی۔ خود ان کے مختلف موضوعات پر نامکمل مسودے بہت سے ہیں۔ پھر بھی جو تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان کی مشہور و مقبول تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔

اورس آف چیلنج: اورس آف اینڈیورنس، انڈیا ان ڈے، اٹرنل انڈیا، مائی ٹرتھ، پیوپلس، اینڈ پرابلمس وغیرہ قابل ذکر مطبوعات ہیں۔

تہذیب اور اخلاق اُن کو گھرانے سے جو ملا تھا اس کی بہت سی مثالوں میں دو واقعہ سن لیں۔ پروفیسر عبدالعلیم جو جامعہ کے ٹریز ز تھے، مگر جب دلی یونیورسٹی میں جامعہ اردو علی گڑھ کا ایک اہم جلسہ منعقد ہوا، تو اس کی سربراہی مسز اندا گاندھی نے کی تھی، اختتام جلسہ کے بعد پروفیسر عبدالعلیم اور راقم کو ڈائس سے اُتر آئے اور باہر جانے لگے۔ اتنی دیر میں مسز گاندھی اپنے حفاظتی دستے کے ہمراہ بھی تشریف لے آئیں، حفاظتی دستے نے علیم صاحب کو راہ سے ہٹانے کا جیسے ہی عمل کرنا چاہے، مسز گاندہی نے ان کو منع کیا اور خود آگے آکر پروفیسر علیم سے ملاقات کی، علیم صاحب نے کہا بھی آپ تشریف لے جائیں مگر مسز گاندھی نے خوش دلی سے کہا، یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے بڑوں سے آگے جاسکوں۔ یہاں تک کہ باہری دروازہ آگیا اور علیم صاحب ایک اور بزرگ سے ملاقی ہو گئے، اس طرح مسز گاندھی نے ان سے رخصت لے لی۔

اسی طرح سید حامد صاحب (سابق سکریٹری ہوم حکومت ہند) وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے عہد میں یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو پولس کی گولی نے ہلاک کر دیا تو سید حامد صاحب نے وی سی شپ سے استعفیٰ دینا طے کر لیا۔ مسز اندر گاندھی ان دنوں ابوظہبی (عرب امارات) کے سفر پر تھیں، موصوفہ کو جب خبر استعفیٰ کی ملی تو آپ نے سید حامد کو فون کیا اور کہا کہ آپ استعفیٰ واپس لے لیں، میں جب ملک واپس آؤں گی تو بات کروں گی۔ یہ مسز گاندھی کی صائب رائے تھی اور ان کو سید حامد صاب کی کارگزاری و خدمتِ ملی کی آگاہی تھی۔ اس کا تقاضہ تھا جس کا اعادہ موصوفہ نے کیا اور سید حامد صاحب کی بحالی بہ دستور وی سی کے

حیثیت سے برقرار رہی۔

وفات: ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۴ء کی صبح کی نمبر ۱، اکبر روڈ نئی دہلی پر، ان کو اپنی رہائش گاہ میں، اُن کے حفاظتی عملہ کے دو افراد نے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور ہندوستان کی مقبول رہنما کا سینا داغ داغ کر کے ابدی نیند سلا دیا۔ مگر ان کی خدمت ملکی و ملّی اُثاثہ تھیں جو باقی رہیں گی۔ آج کا ہندوستان ان کی یاد کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔

☆☆☆

ایک نادر دستاویز

ایک مدت سے اس بات کی آگہی درکار تھی کہ عہد ذاکر حسین (شیخ الجامعہ مسلم یونیورسٹی) میں مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم ہند) کب تشریف لائے تھے؟ چند حضرات سے دریافت حال کیا، حال میں پروفیسر شافع قدوائی صاحب سے بھی تذکرہ آیا۔ جواب شافی نہ پایا، مگر جستجو بدستور قائم رہی۔

ماہ مارچ ۲۰۱۱ء کی ۲۶ تاریخ کو عمرہ کے سفر پر روانہ ہوگیا، مکہ مکرمہ میں حاجی ابرار احمد صاحب نے خصوصی دعوت پر ۸/اپریل کی شب میں اپنے آستانہ پر مدعو کیا۔ مسجد تنعیم (مسجد عائشہؓ) میں نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد موصوف کے ہمراہ ان کے دولت کدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمراہی میں حاجی شمیم صدیقی صاحب (نواسہ اے، ٹی، ایم نقوی سابق ضلع کلکٹر علی گڑھ) بھی تھے۔ موصوف مسلم یونیورسٹی کے قدیم طالب علم بھی ہیں، لہٰذا اپنے دور کی بہت سی یادیں دوہرانے لگے۔ اسی میں فرمایا ''ذاکر صاحب کے گلے میں جوتے کا ہار ڈالا تھا'' میں نے تصحیح کی اور موصوف کو یاد دلایا۔ یہ واقعہ مکروہ ذاکر صاحب کے ساتھ نہیں بلکہ مولانا آزاد کے ساتھ ہوا تھا۔ دراصل وہ دور دوسرا تھا، آشوبی ہی نہیں تو سراسیمگی اور دور کلفت ضرور تھا۔ مجھے یاد ہے جن دنوں مولانا آزاد کلکتہ کی ناخدا مسجد کے امام تھے، اس دور میں ایک بزرگ جو حکومت برطانیہ کے اہم عہدہ پر فائز تھے، انھوں نے بذریعہ تار مولانا کو یہ شعر بھیجا تھا۔

جو تھا امام الہند کبھی، آج امام الہندو ہے
جو تھا اک آزاد مسلماں، آج غلام الہندو ہے

وہ دور ایک لاوے کے مثل تھا۔ مغل سلطنت کی تباہی، برطانوی حکومت کے مظالم، سب مسلمان اور کسی حد تک باشندگان ہند بھی اس سزا کو بھگت رہے تھے۔ ہم اسے نفرت کہیں مگر دراصل دِل کے جلے پھپھولے تھے۔ جو ذراسی دھمک کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان دنوں پوری قوم مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آنے کے لیے بیقرار تھی۔ یہ بے قراری عہد کی خانہ سازبھی۔ شعوری ہو یا نہ ہو۔ مگر تھی اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ خاموش ہندوستان آگاہ تھا کہ

تقریباً بیس ہزار سے زائد مسلمان تقسیم ہند سے قبل اپنی حیات سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ بھی ایک ذات کی ایما پر۔ مگر نام لیے بغیر، خاموش آگ پھیلتی گئی۔ ایسے حالات ناگفتہ میں مولانا آزاد کی ذات بحیثیت عالم، محقق، دانشور کے ایسی تھی، جوان حالات ومصائب کو دور کرنے کی خاطر، مسلمانوں کی اس تنظیم میں شریک ہو جاتی (خواہش یہی تھی) مگر مولانا کی ذات کسی اور نہج پر سوچ رہی تھی۔ وہ دراصل آگاہ تھے کہ اس ملی تنظیم سے وابستگی مسلمانوں کی واقعی اور حقیقی مسائل کا سدباب نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت کوئی مسلمان اس لائق نہ تھا جو صدر کانگریس کے عہدے پر فائز ہو سکے۔ کیا کوئی اور مسلمان اس وقت تھا جو گاندھی جی، نہرو اور پٹیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے؟ ہندی مسلمانوں کی بپتا سنا سکے؟ مداوا کرا سکے؟ اگر تھا تو نام لیں؟ جنگ آزادی ہند کی تاریخ میں مولانا آزاد کا جو حصہ ہے اور انگریزی اقتدار کے خلاف جو مجاہدانہ رویہ اپنایا۔ اس کی مثال ناممکن ہے۔ ان کی حیات کے اوراق پر نظر ڈالیے گا تو ان کی زندگی کا شائد نصب العین ہی ملک کی آزادی کا تصور ملے گا۔ ان کے الہلال اور البلاغ جہاں فکری، علمی، دانشوری، تحقیقاتی اور اسلامی احکام کی تبلیغ کرتے ملیں گے وہیں ان کی سیاسی بصیرت کے بے شمار نمونے دستیاب ہونگے۔ مولانا آزاد سن رسیدہ ہونے کے باوصف، ملک کی جہاد میں سرگرم رہنا اپنا شعار خیال کرتے تھے۔ ان کی حیات کے دو ورق اہم ہیں۔ ایک تو علمی جہاد اور دوسرا ملکی جہاد، دونوں میں مولانا کو امتیازی درجہ حاصل تھا۔ یہی سبب ہے کہ ملک اور قوم نے ان کی پذیرائی کی اور آزادئ ہند کے بعد پہلا وزیر تعلیم مرکزی آپ کو مقرر کیا گیا۔

راقم کا عہد شباب تھا۔ ہمارے خاندان میں بھی دو طرح کے خیالات کے افراد تھے۔ مگر وہ جو محض نیشنلسٹ کہلا سکے، ان کی تعداد کم تھی۔ والد ماجد سید ابو محمد صاحب بلگرامی، اگر چہ بڑے زمین داروں میں ایک تھے، مگر ذہنی طور پر وہ نیشنلسٹ خیالات کے مالک تھے، یہاں تک تقسیم ملک کے بعد جب گاندھی جی کا قتل ناروا ہوا، ریڈیو سے خبر عام ہوئی تو فرمایا۔ مسلمانوں نے برا کام کیا۔ اور اس روز کوئی غذا نہیں لی۔ البتہ جب گوڈسے کا نام مشتہر ہوا تو سکون کی سانس لی۔ مقصد یہ کہ مسلمانوں میں کم ہی سہی مگر ذہنی طور پر، ہندوستان اور اس کی بقا کے بہتر مقسوم کے حق میں ضرور تھے۔ یہی سبب ہے کہ پورے ہندوستان کے مسلمان ترک سکونت پر آمادہ نہیں ہوئے (اگرچہ منصوبہ بند فسادات کا مقصد اصل یہی تھا) علاقائی

طور پر چند محلہ اور افراد نے ترک وطن کیا۔ بقیہ مسلمان اپنے ملک کی سرزمین کا محافظ بنا رہا۔ اور مہاجر نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے وفاداری ملک کو خیرآباد کہا، وہ آج ساٹھ سال بعد بھی: مہاجر: یعنی غیر ملکی بنے ہوئے ہیں۔ یہ ہے ہندوستان اور اس غیر ملکی سیاسی ذہنی اور فکری سوچ کا فرق۔ ورنہ ان کے ملک سے جو بھی یہاں آیا وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے ملک کا حصہ ہو گیا۔ اس باب پر اب بھی غور کرنا واجب ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہی نظریہ وطن تھا جس پر وہ قائم رہے اور آج ہم ان کے نظریے کے قائل و متشکر ہیں۔ ابتدائی سطور میں جناب شمیم صدیقی صاحب (ساکن امریکہ) کا ذکر آیا ہے کہ انہوں نے ایک قضیہ کا ذکر کیا۔ اس کی تصحیح تو میں نے کرادی مگر جب بات آگے بڑھی تو خیال آیا کہ مولانا آزاد کی آمد علی گڑھ پر جو تقریر کی گئی تھی وہ نہ تو حیات ذاکر میں ہے اور نہ ہی تذکرہ آزاد میں۔ اسے منظر عام پر آنا چاہیے، چنانچہ واپسی حجاز (مکہ مکرمہ) پر طبیعت ناساز ہوگئی اور آگرہ جا کر آپریشن کرانا پڑا۔ اب بھی سکونی حالت نہیں ہے مگر بے کاری جب کھانے لگی تو قلم اٹھالینا ہی بہتر خیال کیا اور وہ ''نسخہ کیمیا'' جو راقم کی تحویل میں ہے، اسے منظر عام پر لانا فرض خیال کیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں چند اور علیگ حضرات سے ملاقات ہوئی، مگر سب ہی نابلد نکلے۔

اتفاق وقت میرے دادا سید ابن مرتضی بلگرامی عہد سرسید میں تحصیل علم کے لیے اس مدرسہ میں داخل ہوئے تھے، پھر میرے چچا اور والد کی تعلیم بھی اسی ادارے کی دین ہے۔ میں اور میرے بچے بھی اسی درسگاہ علمی سے وابستہ رہے۔ مجھ سے یونیورسٹی کے قدیم افراد کے سوا، نئی پود کے افراد بھی واقف ہیں۔ اور نگاہ خیر سے دیکھتے ہیں۔ عمرہ سے واپسی پر ڈاک کے مجموعے میں رسالہ کانفرنس گزٹ شمارہ ۳ جلد ۱۰ نظر نواز ہوا۔ اس کے صفحہ ۳۶ کی عبارت پر نظر رک گئی۔

(۱) ......مولانا آزاد کو ستمبر ۱۹۴۷ء میں قوم نے دشمن اور ملت ناشناس تک کہہ دیا۔ صفحہ ۸

(۲) جب مولانا آزاد فروری ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن کو خطاب کرنے کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تھے اس وقت وائس چانسلر ذاکر حسین نے ان کا استقبال کرتے ہوئے جو تحریری تقریر کی تھی غالباً وہ کہیں محفوظ نہیں ہے۔ صفحہ ۳۶

راقم کے خزانہ علمی میں جہاں اور بہت سے نوادرات ہیں، وہیں مذکورہ تقریر (تقریب) بھی محفوظ ہے۔

یہی نہیں ذاکر صاحب کے حالات مختصران کے اپنے دست وقلم کے اور مکتوب بنام راقم محفوظ ہیں۔ جسے ہم ادب پارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے الگ سے، کسی نادر موقع پر، یونیورسٹی اسے شائع کرے، بہرکیف مذکورہ تقریر سے (تقریر نہیں، بعنوان تقریب) تقریباً ۶۲ سال بعد آپ روشناسی حاصل کر سکیں گے۔اس تقریر کی نقل فل اسکیپ سائز کے دوصفحات پر جو ۲۹ سطری ہے، رقم کردہ ہے۔گمان ہے کہ اسے اشاعت کے لیے نقل کیا گیا ہوگا، یوں کہ اس پر 13.3.49 کی تاریخ (بزبان انگریزی) تحریر ہے نقل کرنے والے کے دستخط بھی انگریزی میں (مختصر) رقم ہیں۔اس تقریر میں ذاکر صاحب نے اپنی جانب سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔وہی تعریف، توصیف کے کلمات استعمال کیے گئے ہیں اور جو حقیقت (اس وقت تھی) وہی ذاکر صاحب نے بیان کردی ہے۔مسلمانوں میں عام ذہنی بیداری پیدا کرنے، حوصلہ اور ولولہ خود ہمارے تعلیمی کاموں کی بعض تنکیوں پر جو مخلصانہ تنقید میں شائع کی گئی ہے۔ان کے ذکر کے بعد آخری سطر میں............ترجمان القرآن ہی مہتم بالشان تصنیف......ایک نادر شاہکار ہے اور یہ کہ...... یہ یونیورسٹی مولانا کی خدمت میں: دکتور فی اصول الدین: کی اعزازی سند پیش کر کے اپنی عزت بڑھا رہی ہے۔

اور واقعہ یہ ہے سند یا تقریر (تقریب) سے مولانا کی ذات یا منصب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ مسلم یونیورسٹی کو یہ افتخار ملا کہ اس نے ایک ہمہ گیر عالم، دانشور، مفکر، مصلح اور صاحب قلم مدیر اور بحر علوم کے فرد کو سند پیش کر کے، اپنا اعزاز دوبالا کیا۔یہی وجہ ہے کہ بقیہ واقعات خرافات کی نذر ہوگئے۔ کہ وقت آتا ہے جانے کے لیے اور وہ چلا گیا۔مگر علمی قدر افزائی کی بات تادیر رہتی ہے۔مولانا آزاد کی نابغہ کیفیت کی تفصیل کیا ممکن ہے؟ مجھے یاد ہے دلی کے ایک اجلاس میں یہ بات کہی گئی تھی، جس میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی بھی شریک تھے کہ............ بڑا مظلمہ ہے کہ کانگریس نے ہم سے ایک نابغہ اور صاحب طرز مفکر اور عالم چھین لیا۔اور مسلمانوں کو ان کی علمی نگارشات وواقعات کے علم سے محروم ہو جانا پڑا۔پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اس کا احاطہ یوں کیا تھا۔''آزاد کا قلم ان کے ہاتھ سے چھین کر ہمیں بے دست و پا کر دیا گیا'' اس واقع پر ملال تو آتا ہے۔دل کی آواز تھی جو زبان قلم پر آگئی۔دراصل مولانا کے علمی جہاد کے رک جانے اور ملکی سیاست نے ان کو ہم سے دور کر دیا۔ورنہ مولانا شبلی نعمانیؒ ۔مولانا ابوالاعلی مودودیؒ۔مولانا عبدالماجد دریابادی سے کہیں زیادہ اہم ذات مولانا آزاد کی تھی۔

اصابت رائے، ثبات قدم کی شخصیت جیسا کوئی اور نہیں ہوا، اس ذیل میں ایک اہم واقعہ لائق تذکرہ ہے۔ جس سے مولانا کی علمی اور علامہ شبلی کے تفکر ذہنی کا فرق سامنے آسکتا ہے۔

واقع یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے سیرۃ النبی جلد اول میں حضرت علیؓ کو شراب پلا کر، نماز پڑھوادی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس پر احتجاج کیا۔ اس واقعہ کو خود مولانا سلیمان ندوی مرحوم نے راقم سے بیان کیا اور بتایا کہ استاد مکرم علامہ شبلیؒ نے فرمایا تھا کہ...... یہ روایت ضعیف ہے...... چنانچہ اس دور میں بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ رسالہ نگار نے ''ملک خطا کے شہزادے'' کے عنوان سے مضمون شائع کیا۔ اس واقعہ پر مولانا آزاد کے عملہ کے جناب اجمل صاحب کی روایت ہے کہ چند علماء نے مولانا آزاد سے اس واقعہ پر احتجاج کیا اور جواب شائع کرنے کی بابت کہا۔ تو مولانا نے فرمایا: آپ جواب تیار کریں میں اس پر صاد کردوں گا۔ جب جواب تیار ہوگیا اور مولانا کے سامنے آیا تو مولانا نے فرمایا کہ: اب اس جواب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ سید اولاد حید رفوق بلگرامی نے اسوۃ الرسول میں مدلل بحث کرکے جواب دے دیا ہے۔

اس واقعہ سے مولانا آزاد کی علمی بصیرت، آگہی اور نگاہ واقفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ مولانا کے یہاں شدت نہ تھی، وہ عالم باخبر تھے۔ مطالعہ ان کا وسیع اور وجدان ان کا ماورئی اور طبع ان کی لاثانی تھی۔

آخری کلمات میں عرض کردوں کہ مولانا آزاد کا ورود علی گڑھ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو ہوا تھا۔ تفصیل سطور بالا میں درج ہے۔ اسی تاریخ کو ذاکر صاحب نے اپنی تقریر (تقریب) میں مولانا کو مخاطب کیا تھا۔ اتفاق سے اس جلسہ کے ٹھیک ۸ دن بعد ۲۸ فروری ۱۹۴۹ء کو ۴ ماریسن روڈ مسلم یونیورسٹی پر میری تقریب شادی مولانا احسن مارہروی کی پوتی سے منعقد ہوئی تھی۔ جس میں ذاکر صاحب نے بھی شرکت فرمائی اور دوران گفتگو مزاحاً دریافت کیا کہ ......شادی کے بعد کیا مشغلہ رہے گا؟...... میں نے خاموش نگاہی سے عرض کیا، جو خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا۔ اس جواب کو موصوف نے بے حد پسند کیا تھا اس کے سوا اور بہت سے واقعات ہیں جو بعد میں پیش آئے۔ ان کی تفصیل بہت طویل ہے، مختصر یہ کہ ذاکر صاحب سے روابط کی جہاں وجہ تھی، وہیں ان کا خاندان بلگرام سے اظہار عقیدت بھی تھا۔ ذاکر صاحب کا دل، نظر، حمیت اور سوز درون کے لیے جس دل بینا کی ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے لائیں؟ اگر

تفصیل میں جاؤں تو لوگ باگ یقین نہ کریں گے۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب وہ صدر مملکت تھے یا نائب صدر یا گورنر، ہر حال میں ذاکر صاحب نے مجھ سے ربط خاص رکھا۔

اس تراشے میں ذاکر صاحب جب نائب صدر مملکت تھے اور آپ حج پر ۱۹۶۹ء میں تشریف لے گئے تو اس وقت کی ''بحالت احرام'' تصویر بھی نوادرات میں ہے۔ اس کے سوا شاہ ایران اور اندرا گاندھی کے ہمراہ کی تصویر پھر اپنے نواسے اور نواسیوں کے ہمراہ بھی آپ مصروف نظر آرہے ہیں۔ یہ سب یادگاری مناظر ہیں اور اسے اکائی کا حصہ دینا بہتر امر ہوگا۔

سب سے آخر میں وہ تقریر (تقریب) مطالعہ کریں جس کی بابت یہ طویل گفتگو عمل میں لائی گئی ہے۔

تقریب

(۲۰ر فروری کو جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں ڈاکٹر آف تھیالوجی کی اعزازی سند پیش کی تو وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے پرو چانسلر نواب صاحب رام پور کو مخاطب کر کے تقریب کے طور پر یہ مختصر اور مرصع تقریر کی)

جناب محترم خدمت عالی میں حضرۃ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو پیش کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں۔

علم، ادب، سیاست، دین سب میدانوں میں فکر اور عمل کا کوئی گوشہ نہیں جو اس ذات گرامی کا احسانمند نہ ہو۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آن
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

اردو زبان کو اس پر فخر ہے کہ وہ آپ کے قلم سے لکھی اور آپ کی زبان سے بولی گئی۔ آپ نے ایک نئے طرز نگارش کی بنیاد رکھی۔ ایک پرتاثیر اور ولولہ خیز بیان کی جس میں عربی کا کس، فارسی کا رس، اور ہندوستانی کا لوچ سب یکجا ہو گئے ہیں۔ آپ نے اس موثر آلہ سے فکر کے نکھار اور عمل کے سدھارنے کا کام لیا ہے۔ اس نے سوتوں کو جگایا ہے، غفلت کے ماتوں کو ہوشیار کیا ہے، بے عملوں کو راہ عمل دکھائی ہے۔ الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ملک اور خصوصاً مسلمانوں کے اندر عام ذہنی بیداری اور رجعت پسندی سے بیداری پیدا کرنے میں ایک عہد آفریں خدمت انجام دی ہے۔ انھیں للکارا بھی ہے اور ان میں حوصلہ اور ولولہ بھی پیدا

کیا ہے۔ خود ہمارے تعلیمی کاموں کی بعض تکنیکیوں پر جو مخلصانہ تنقیدیں ان رسائل میں شائع ہوئیں ان کو علی گڑھ ہمیشہ احسان مندی کے ساتھ یاد رکھے گا۔

پھر خود نوشت سوانح حیات کی صف میں مولانا کی کتاب ''تذکرہ'' ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس میں علمی خاندانوں، مشائخ کے مسالک اور سیاسی تحریکوں پر تنقید و تبصرہ کے عجب دلنشیں نمونے اور خود مولانا کی شخصیت کے بوقلموں مرقع ملتے ہیں یہ دلکش اسلوب ''غبار خاطر'' میں اور بھی نکھر گئی ہے۔ حسن ذوق، بلندی فکر، جرأت اخلاق اور قوت ایمانی، فلسفیانہ بصیرت اور سیاسی نظر کے اس گلدستہ میں ایک ایسی جامع متوازن، اور ہم آہنگ شخصیت کا پھول سامنے آتا ہے جس کی ایک ایک پنکھڑی ہمارے قومی چمن کا سرمایہ رونق ہے۔

علم و ادب کی یہ گرانقدر خدمتیں ایک ایسی ذات گرامی نے انجام دی ہیں جسے عمل کے مطالبوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ قید فرنگ میں گذارنے پر مجبور کیا۔ جس نے ملک کی آزادی کے جہاد میں سپاہی، افسر اور سپہ سالار کے فرائض انجام دیئے جس کے کارناموں کا نقش ہماری سیاسی تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ثبت رہیگا۔ اصابت رائے، ثبات قدم اور سعی پیہم کی ایسی مثالیں ہماری قومی تاریخ میں کم ملتی ہیں سیاست کی فی الجملہ انتشاری نفسا نفسی میں آپ کی عارفانہ یکسوئی اور آپ کے کریمانہ اخلاق نے اس زندگی کے معیاروں کو بلند کر دیا ہے۔

پھر اپنی تصنیف، اپنی خطابت، اپنی سیاست، اور اپنی زندگی سب سے موصوف نے ذہنی اور عملی دونوں میدانوں میں دینی احساس کا دامن تنگ دلی اور تنگ نظری سے چھڑا کر، دین کے تصور کی پوری وسعتوں کو آشکار فرمایا۔ بتایا بھی اور دکھایا بھی کہ دین ساری زندگی کا جامع ہے۔ اس دو بظاہر بے جوڑ ٹکڑوں میں ربط پیدا کرتا ہے اور اس کے بے معنیٰ سے اجزاء سے ایک بامعنیٰ کل بنانے کی راہ کھولتا ہے، اور اس کے آنی (کذا) مظاہر کو دیدیت سے آشنا کر دیتا ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی مہتم بالشان تصنیف سے جو علمی تبحر، حسن بیان اور خلوص فکر کا ایک نادر شاہکار ہے۔ مولانا نے دین کی ایک گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ یہ یونیورسٹی مولانا کی خدمت میں دکتور فی اصول دین کی اعزازی سند پیش کر کے اپنی عزت بڑھا رہی ہے۔

ترے جواہر طرفہ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

مشاہیر کے چند اہم غیر مطبوعہ خطوط

خط ۲ / دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ''دل پُر خوں'' سے دیدہ و دل کے لئے لکھے جائیں اور جن میں قلب وجگر کی وَارفتگی اور دَاستان حیات بیان کی جائے۔ دوسرے وہ جن میں علم بصیرت اور علمی تحقیق کی کار فرمائی ہو۔ مگر خط خواہ کسی قسم کا ہو، تصنع اور آورد سے مبرا ہونا چاہئے، لگاوٹ ہو بَناوٹ نہ ہو۔ دِل آویزی ہو، دِل فِگاری نہ ہو۔

اُردو میں غالب نے ''مشکل پسند'' ہونے کے باوجود سادہ اور سہل انداز نگارش کو ایجاد کیا۔ اس میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ بعض اہل علم خواجہ بے خبر کو فضیلت دیتے ہیں۔ مگر شاید خواجہ صاحب کے خطوط میں غالب کے خطوط کی جھلک نمایاں ہے۔ ویسے دُنیا کے بیشتر اَدب کا اگر جائزہ لیا جائے یا کسی ادیب کی شخصیت کا تجزیہ مطلوب ہو تو اسے خطوط کے آئینے میں دیکھئے۔ اس بزم میں وہ تنہا ہوتا ہے۔ وہ اپنا عِلم اور اپنا دِل، بصیرت کے قلم اور خونِ دل کے موقلم سے، صفحۂ قرطاس کے حوالے کرتا ہے۔ غالب کے یہاں مکالمہ کا انداز ظاہر کرتا ہے کہ وہ غمِ جَاناں اور غمِ دَوراں دونوں محفلوں میں ایک ہی انداز نگارش کے قائل تھے۔ اپنے یوسف کی جدائی کا حال یا زمانہ کی بے وفائی کا تذکرہ علمی مباحث کے جوابات، یا اپنی نجی باتوں کو انہوں نے جس طرِح نے پیش کیا ہے، وہ ایک فن ہے۔ اور آج ان خطوط یا تحریروں کے ذریعے نہ صرف غالب کی شخصیت کا اندازہ کر سکتے ہیں بلکہ ان کے دَور کی پوری تاریخ، سماجی حالات اور علمی وادبی اشخاص کا تذکرہ مرتب کر سکتے ہیں۔ اسی رجحان نے آگے چل کر محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خاں کو آسان اور عام فہم طریقہ نگارش کے اسلوب کو رواج دینے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے پر مجبور کیا۔ مولانا آزاد کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے نثر کے ساتھ نظم میں بھی سادگی اور حقیقت کی روایت قائم کی، چراغ سے چراغ جلتا ہے کے مصداق حالی، اکبر اور شبلی نے بھی اپنے افکار کے لئے اسی چراغ سے جُوت جلائی۔

حالی ہمارے ادب کے ان معماروں میں ہیں جن کا مرتبہ متعین کرنا آسان نہیں، ان کا ذہن تنقیدی تھا، دل شاعرانہ اور دماغ بہترین نثر کا نمونہ۔ نذیر احمد طوطی بیان تھے۔ ان

کے چہچہوں کے بغیر محفل سونی معلوم ہوتی تھی ۔ یہ سچ ہے کہ ان کے ناولوں نے سماجی رجحانات کی تبدیلی میں بڑا حصہ لیا، بلکہ اردو میں با قاعدہ ناول نگاری کے موجد ہوئے۔شبلی کی عالمانہ اور محققانہ شخصیت کا معترف نہ ہونا علم ودانائی سے اِنحراف ہے۔ان کے یہاں ''دل گداختہ'' اور ''تبحر علمی'' دونوں رنگ بیک وقت جلوہ گر ہیں۔دراصل وہ کسی یونانی مصور کا ایسا شاہکار ہیں جس نے اپنی تصویر کو صد رنگ بنانے کے لئے ایک ایسا رنگ ایجاد کیا ہو،جس پر امتداد زمانہ کا اثر نہ ہو۔ چک بست اپنی عظیم شخصیت کی وجہ سے اُردو ادب کی مایۂ ناز ہستی ہیں۔ان کے یہاں رَوانی،سلاست،سادگی اور خیالات کا اعلیٰ معیار وطنی اور سماجی شاعری کا اَچھوتا اَنداز اس بلند درجے پر موجود ہے جو اُن کو قدر اول کے شعراء میں شمار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اس شعر سے اردو ادب کا مبتدی بھی واقف ہوگا۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اَجزا کا پَریشاں ہونا

انسانی تخلیق کی ساری جزئیات کا الگ الگ ہوجانا،مَوت ہے، یکجار ہنا زندگی ہے۔اس حقیقت سے کون انکار کرے گا؟ لیکن چک بست نے جس خوبی سے اس حقیقت کو قلم بند کیا ہے،اس کے متعلق شاہد ان علم کا بیان ہے کہ ''چک بست محض اس شعر کی بدولت اُردو ادب میں زندہ رہیں گے'' آج ان ہی متذکرہ بالا شخصیتوں کی تحریر اور سلسلہ کی ایک کڑی ہدیہ قارئین کررہا ہوں۔

پانی پت۔۲۱ر دسمبر ۱۹۰۹ء

جناب من-آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔میں اول تو ایک عرصہ سے بیمار ہوں۔کسی قسم کا دماغی محنت کا کام نہیں کرسکتا۔دوسرے میرے پاس کتابیں جو آپ کے سوالات کا جواب لکھنے کے لئے درکار ہیں،موجود نہیں،لیکن چوں کہ آپ کے سوالات مندرجہ خط 'بہت اہم' تھے، اس لئے میں نے مولوی سید سلیمان صاحب کو جو رسالہ الندوہ میں اکثر مضامین لکھتے ہیں اور شمس العلماء مولانا شبلی کے شاگرد رشید ہیں،لکھا تھا کہ اگر آپ تکلیف گوارا کریں تو اس تحریر کو آپ کے پاس بھیج دوں مگر باوجود آٹھ روز گذر جانے کے انہوں نے مجھے کچھ جواب نہیں دیا۔لاچار آپ کی تحریر واپس آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔میرے نزدیک مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ تحریر بجنسہٖ مولانا شبلی صاحب کی خدمت میں مقام لکھنؤ دفتر ندوۃ العلماء بھیج دیجئے اور اپنے سوالات کے جواب لکھنے کی درخواست کیجئے۔اگر ان کو فرصت نہ ہوگی تو امید

ہے کہ وہ سید سلیمان صاحب یا اپنے کسی شاگرد سے اس کا جواب لکھوادیں۔ ان کے سوا اب کوئی آدمی ایسا نظر نہیں آتا جو آپ کے سوالات کا کافی وشافی جواب لکھ سکے یا لکھوا سکے۔

والسلام خیرانام۔

خاکسار الطاف حسین حالی

یہ خط لائن دار، ہلکے رنگ کے موٹے کاغذ پر تحریر ہے۔ مگر یہ خط کس کے نام ہے، اصل خط سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ نہ شہر کا نام معلوم ہوتا ہے نہ قصبہ کا۔ لیکن اسی خط کے ساتھ ایک ''رجسٹری کی جوابی رسید'' موجود ہے۔ جس پر حالی کے دستخط اور ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۹ء تحریر ہے، رجسٹری کا نمبر ۹۷ درج ہے، یہ رجسٹری کوانتھ ضلع آرہ صوبہ بہار سے سید آل حسین صاحب بلگرامی نے بھیجی تھی، حالی کے خط اور اس رسید سے یقین ہوتا ہے کہ ''رسید'' اسی تحریر سے متعلق ہے جو حالی نے سید سلیمان کو بھیجنا چاہی تھی اور بعد میں صاحب خط کو واپس بھیج دی۔ یہ یقین شبلی نعمانی کا خط پڑھنے کے بعد اور پختہ ہو جاتا ہے۔

مکرمی! السلام علیکم

ایم اے (ہسٹری) کا بند سوال پہنچا۔ آج کل کثرت کار سے اتنی تو فرصت نہیں کہ سب سوالوں کا جواب لکھ سکوں، مختصراً کچھ لکھتا ہوں:

تنکہ ایک چھوٹا سا میسی سکہ تھا جو آدھ آنہ کے قریب ہوگا ہندوؤں کے زمانہ سے چلا آتا تھا۔ لیکن مسکوک نہیں ہوتا تھا، جہاں گیر تزک جہاں گیری صفحہ ۲۰۷ میں لکھتا ہے۔ ''در ہیچ عہدے تنکہ غیر از من سکہ نہ شدہ و تنکہ طلا و نقرہ اختراع من است'' اسی موقع پر جہانگیر نے لکھا ہے کہ میں نے ۱۲ جلوس مین چاندی اور سونے کے تنکہ مسکوک کرائے۔ اور اس پر یہ مصرع کندہ کرایا۔

بہ زر ایں سکہ زد شاہ جہاں گیر ظفر پر تو

جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے (صفحہ) کہ جو اشرفی، ایک تولہ کی چوتھائی وزن کی ہوتی تھی، اس کا میں نے رِواجی نام رکھا۔ رائج گانی جو آپ نے پوچھا ہے غالباً اسی لفظ سے بدل کر بنا ہے۔

والسلام شبلی ۱۵ر دسمبر ۱۹۰۹ء

یہ خط نہایت عمدہ، نفیس اور چکنے سفید کاغذ پر مرقوم ہے۔ شبلی کا جمالیاتی ذوق جس قدر بلند تھا اسی قدر وہ پختہ اور حسین خط کے مالک بھی تھے۔ اس خط کے لفافے پر یہ پتہ درج ہے۔

جناب سید آل حسین صاحب بلگرامی دام مجدکم

قصبہ کواتھ ضلع آرہ، شاہ آباد
بذریعہ ریلوے اسٹیشن ڈمراؤن

شبلی نعمانی نے یہ خط بذریعہ رجسٹری بھیجا۔ اس پر ڈھائی آنے کا ٹکٹ چسپاں ہیں اور امین آباد لکھنؤ رجسٹری ۱۱۸ کا لیبل بھی چسپاں ہے۔ یہ خط ۱۵ر دسمبر کو رجسٹری ہوا اور ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء کو کواتھ پہنچا۔ اس میں مولانا سے دو غلطیاں ہوئی ہیں۔ پہلی یہ کہ سید آل حسین کے بجائے انہوں نے سید آل حسن اور ڈمراؤن کے بجائے ڈوڈوان تحریر کر دیا ہے۔ لفافے پر انگریزی خط اچھا نہ تھا۔ اس خط کے علاوہ ایک رجسٹری کی جوابی رسید بھی ہے، جس پر "شبلی نعمانی۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۹ء" تحریر ہے۔ اس کا نمبر ۶۸ ہے جس پر لکھنؤ کی مہر ۱۰ر دسمبر اور ڈمراؤن کے ڈاک خانہ کی مہر ۱۲ر دسمبر ہے۔ اسی روز کواتھ کے ڈاک خانہ کی مہر ہے۔

اس ذیل میں ایک اور خط جو سارے مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے اور اصل سوالنامہ (جو افسوس کہ بصد تلاش نہیں مل سکا) کے خط و خال کو بھی سامنے لاتا ہے، ملاحظہ ہو۔

۷۸۶

جناب من تسلیم۔ علیل رہا و عدیم الفرصت اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیے گا۔

۱- لفظ تنکہ بکاف عربی معنی قرص (سکہ) رائج کے ہیں۔ خواہ طلا یا نقرہ یا مس سے بنایا جائے۔ یہ لفظ مفرّس (ٹنکہ) کا ہے۔ اس لئے بکاف فارسی بھی مستعمل ہے۔

۲- سکہ کا رواج بموجب کتب تواریخ جمشید کے وقت سے ہے اور ہندوستان میں اس کا رواج اس وقت سے ہے جب کہ راجہ کشن حکمران تھا۔ اَوزان اور دَھاتوں کے اختلاف کو آئین اکبری جلد دوم ص ۳۳ مطبوعہ مطبع منشی نولکشور میں ملاحظہ فرمائیے۔

۳- تنکہ سے مراد سکہ ہے۔ جو کہ ہر بادشاہ کے وقت میں رہا، مگر اَوزان مختلف رہے۔ سلطنت مغلیہ کے بعد لفظ تنکہ کا استعمال محاورہ میں نہیں، بلکہ روپیہ کا لفظ عموماً مستعمل ہو گیا۔ جو سابق سے کم و بیش زبان پر و نیز تحریرات میں جاری ہو چکا تھا۔

۴- سلاطین مغلیہ میں اکبر شاہ کے زمانہ میں جو سکہ رائج تھا اس کے اَوزان آئین اکبری میں موجود ہیں۔ اس سے اندازہ و مقابلہ برٹش گورنمنٹ کے سکہ سے ہو سکتا ہے جو آپ خود فرمالیں گے۔

۵- اس سوال کے متعلق بہت سے امر ایسے دریافت فرمائے ہیں جن کی تحقیق کتب

تواریخ سے نہیں ہوسکی۔ سکہ طلائی کا نرخ اور وزن ہمیشہ اسلامی سلطنتوں کے زمانہ میں گھٹتا بڑھتا رہا۔ ہر بادشاہ نے اپنا سکہ اپنی عملداری میں رائج کیا۔ زرِ سُرخ سلاطنی سے مُراد غالباً سکہ شاہ جہانی ہے جس کا نرخ اس وقت بمقابلہ سکہ گورنمنٹ انگریزی معین کرنا طلا کے نرخ پر مبنی ہے کہ سکہ رائج الوقت کا لزوم روپے پر ہونا چاہیے، تاکہ وقت اَدائے مہر کچھ دقت نہ ہو۔ پس اِن الفاظ کی تعبیر مسلمہ طور پر سکہ رائج الوقت سے کرنا چاہیے۔

جب یہ امر مسلم ہے کہ 'ادائے مہر لازم ہے' اور تعین اس کا سکہ رائج الوقت پر ہوتا ہے، خواہ دِرھم یا دِینار' اور سلطانی دِینار سے مراد وہی دِینار ہے جو وقت نکاح بادشاہ وقت کی عملداری میں رائج ہو تو اب کچھ دقت اِن الفاظ کے مفہوم و اثر میں نہیں رہ سکتی' جو حسب دستور وقت نکاح مستعمل ہے۔ میری رائے میں تعین الفاظ کا اسی عنوان پر وقت نکاح ہوگا، کہ تعداد مہر کے ساتھ صراحت دِرہم و دِینار یا روپیہ اشرفی سکہ رائج الوقت ہونا مناسب ہے، جیسا کہ عموماً لکھنؤ میں رائج ہے، اور یہ تعین ان الفاظ کے ساتھ ضرورت متعلقہ کو حسن منشاء شرع اَنور پورا کرسکتا ہے۔ فقط زیادہ نیاز۔

لکھنؤ، حسین بازار — خاکسار دارین

۲۱ رفروری ۱۹۱۰ء — حامد علی

یہ خط ایک مٹیالے لائن دار کاغذ پر مرقوم ہے۔ اس کا لفافہ بھی اسی طرح کا ہے۔ جس پر ساڑھے تین آنے کے ٹکٹ اور رجسٹری نمبر ۳۰ کے لیبل چسپاں ہیں۔ یہ رجسٹری لکھنؤ سے ۲۱ رفروری کو روانہ ہوکر ۲۴ رفروری کو کواتھ پہنچی۔ پتہ انگریزی و اُردو میں تحریر ہے۔

سید آل حسین صاحب بلگرامی (بخط انگریزی)

قصبہ کواتھ ضلع آرہ، شاہ آباد، بذریعہ ریلوے اسٹیشن دوواؤن

حامد علی خاں، بارایٹ لا، لکھنؤ

اِس خط سے اَندازہ ہوتا ہے کہ حالؔی، شبلؔی کے علاوہ حامد علی خاں بارایٹ لا کو بھی خط بھیجا گیا۔ حالؔی نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ: ''آپ یہ تحریر بجنسہ مولانا شبلی صاحب کی خدمت میں بمقام لکھنؤ ندوۃ العلماء بھیج دیجئے ....''

یہ وہی خط ہے جس کا جواب شبلؔی نے ۱۵ ردسمبر کے مکتوب گرامی میں دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حالؔی اور شبلؔی دونوں کو یہ خط بھیجے گئے تھے لیکن کسی کا جواب شافی نہ تھا۔ اس لئے تحقیق کا کارواں آگے بڑھتا رہا اور اب قانونی طور پر اس کی تحقیقات کے لئے حامد علی

صاحب کو خط لکھا گیا۔ یہ تمام خط و کتابت میرے حقیقی جد سید آل حسین صاحب بلگرامی مرحوم ومغفور سے ہوئی۔ موصوف کی علمیت اور انسانیت اس معیار پر تھی جہاں فرشتے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ انسانیت کا عالم یہ تھا کہ راستے میں اگر اینٹ پتھر پڑا پاتے تو ہٹا دیتے اور ہم بچوں کو تلقین کرتے کہ ممکن ہے کہ کسی شخص کو اس سے ٹھوکر لگے اور اسے تکلیف پہنچے'' اسی طرح فارسی اور عربی کے تبحر کا یہ عالم تھا کہ موقع ومحل کے ہزاروں اشعار اور محاورے، کہاوتیں، امثال حفظ تھی۔ ایک ایک لفظ کی تحقیق وتدقیق کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرتے، علماء سے استفسارات کرتے اور ہر اس شخص سے دریافت حال کرتے جس سے ان کی تشنگی دور ہو سکتی تھی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرحوم ۱۲۴۹ھ تا ۱۳۰۷ھ نے سرسید احمد خاں کے نام ۱۸۸۳ء میں ایک خط لکھا تھا، جس میں سکہ ٹنکہ کی اصلیت دریافت کی تھی۔ اس خط کا جواب سرسید نے دیا اور اس سلسلے میں حالی کو لکھا کہ وہ تفصیلی جواب دے دیں۔ یہ خط عرصہ ہوا، اپنے عزیز ساتھی سید فرخ علی جلالی کے توسط سے دیکھا تھا۔ اب یہ یاد نہیں کہ کہاں دیکھا تھا، صفیر بلگرامی کا اصل خط میں نے نقوش کے ''مکاتب نمبر'' مین شائع کرا دیا تھا۔ یہاں مسئلہ کی حقیقت حال کے لئے دونوں مشاہیر کے خطوط ملاحظہ ہوں۔

''محقق زبان ومدقق دوراں جناب نجم الہند سید احمد خان صاحب سی ایس آئی دام مجدہ، بعد اہدائے تسلیم کے عرض کرنا ہے کہ میں ایک سوال حضور سے پوچھنا چاہتا ہوں اور تھوڑے وقت کو حضور کے اس کام میں حسبۃ اللہ صَرف میں لانا چاہتا ہوں۔ حضور از راہ عنایت بزرگانہ اس کی تحقیق میں مدد فرمائیں۔ آج کل ایک ضرورت سے کتاب آئین اکبری آپ کی صحیح کی ہوئی، دیکھ رہا ہوں اور وہ ضرورت تحقیق لفظ تنگہ ہے کہ نقود اور سکوں کے مدارج میں سے ایک نقد کا نام ہے مگر میری نظر سے سوائے ایک مقام کے دوسری جگہ اس لفظ کا پتہ نہ ملا یعنی (آئین سود بازگراں در طلا ونقرہ جز آں) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ (واز....... اخلاص دوم تولچہ ویازدہ ماشہ وچہار سرخ طلا ویازدہ تولچہ...... ویازدہ ونیم ماشہ ونیم سرخ نقرہ بدست افتد...... ہر دوسی وپنج دام الخ) حالانکہ عہدِ اکبر میں رواج دَام کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ تنگہ کس درجہ کا نقد ہے اور حال کے زمانے کے حساب سے تنگہ کا کس قدر روپیہ یا پیسہ ہوتا ہے، اور عنوان تحریر سے یہ تنگہ دَام سے بڑھا ہوا اور روپیہ سے گھٹا ہوا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ تمام دَام کا حساب لکھا ہے مگر ایسے مقام پر تنگہ کا حساب لکھا ہے اور روپیہ سے کم اس لئے ہے کہ اگر روپیہ کو تنگہ کہتے ہوتے تو اسّی روپیہ میں ملا دیتے نہ کہ روپیہ کے بعد درجہ، جو رکھا گیا

ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روپیہ سے کم ہے اور دَام سے کہ ایک پیسہ کو کہتے زیادہ کو نہیں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں نقود کے اَسما میں سے یہ لفظ داخل نہیں کیا ہے، اور نہ کسی حساب میں یہ لفظ دیکھا گیا، سوائے اس جگہ کے جو اوپر لکھی گئی۔ اور حضور نے بھی اس کا حاشیہ نہ چڑھایا۔ شاید یہ لفظ عام نہ ہو اور اس ملک کے مزاولت میں نہ ہو، اس لحاظ سے حاشیہ کی ضرورت نہ ہو سکی۔ بہر حال مجھے اس وقت اشد ضرورت اس کی لاحق ہے اور وہ یہ کہ اہل بلگرام کا ''مہر معین'' ایک فقرہ ہے جو سلف سے چلا آتا ہے یعنی بست وَ پنجم ہزار تنگہ راجگا نے یا رائج گانے، اور ایک دینار زرِ سُرخ سلطانی یعنی اشرفی اکبری۔ اکبری اشرفی تنگہ کا حساب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اسی کی تحقیق کے لئے حضور کو تکلیف دیتا ہوں کہ از راہ بزرگانہ بہت جلد اس سے اطلاع دی جائے، اور رجگانے یا رائج گانے کی بھی تحقیق سے مطلع کیا جائے۔ کہ کس لفظ کا استعمال درست ہے، اور مناسب ہوگا۔ اور لغت میں تنگہ کے معنیٰ روپیہ پیسہ دونوں کے ہیں۔ غیاث اور بُرہان سے معلوم ہوا ہے۔ مگر آئین اکبری میں درجہ تنگہ کا روپیہ کے بعد اور پیسہ یعنی دام کے پہلو معلوم ہوتا ہے۔ اب حضور کی تحقیق پر اس کا فیصلہ ہے''۔

اور اسی فقرۂ مہر کے لئے بست پنج ہزار راجگانے یا رائج گانے ویک دینار زرِ سرخ سلطانی کے تطبیق بزرگانِ سلف نے صدی آخری ہجری میں نقود حال سے کر کے لکھا ہے کہ ایک ہزار و بست و چار روپیہ باید یا بست و پنج روپیہ ہوتا ہے۔ اگر توجہ کر کے اس کا حساب بھی ٹھیک کر دیا جائے تو ہم مسلمانوں کی رفاہ کے واسطے بڑا ذریعہ ہو۔ اور حضور کو اس کا ثواب ملے گا۔ انشاء اللہ جواب اس عریضہ کا بیرنگ بھیجا جائے، محصول یہاں دے دیا جائے گا۔ نشان یہ ہے، آرہ شاہ آباد، مطبع نورالانوار پھاٹک سادات بلگرام نزدیک سید فرزند احمد بلگرامی کو پہنچے۔

خاکسار صفیر بلگرامی

۲ر جون ۱۸۸۳ء رجب ۱۳۰۰ھ از آرہ

مکتوب سر سید احمد خان بنام سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

مخدومی جناب سید فرزند احمد صفیر تخلص بلگرامی، تسلیم

عنایت نامہ پہونچا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی مقدمہ مہر کا ہے جس میں ''تنگہ'' کی تحقیقات منظور ہے۔ آپ مجھ کو اس کی تحقیق سے معاف فرمائیے، مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ کتب تاریخ پر غور کرنے سے ہر شخص تحقیق کر سکتا ہے۔ مجھے اِن دِنوں فرصت بھی نہیں، ورنہ ہندوستانی شاعری کے بارے میں لکھتا۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔

خاکسار   سید احمد، علی گڑھ، جون ۱۸۸۳ء

تعجب اور حیرت ہے کہ آثار الصنادید کے مصنف اور سرسید جیسے محقق نے یہ جواب دیا کہ "مجھے معلوم نہیں"، لیکن آگے کا جملہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اُن دنوں بے حد مصروف تھے، اس لئے جواب نہیں دے سکتے تھے، ورنہ یہ کبھی نہ لکھتے: "کتب تاریخ پر غور کرنے سے ...."

یہی سبب ہے کہ صفیرِ بلگرامی کی وفات کے بعد بھی اس لفظ کی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا اور اب بوقت نکاح "سکہ رائج الوقت" کا فقرہ "دین مہر" کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے سوا ایک خط مولانا نذیر احمد کا درج کیا جاتا ہے:

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ جواب کارڈ ۲۴ ستمبر ۳

خدا جانے کس کمبخت کی نظر لگ گئی کہ وہ حمائل آج تک کھٹائی میں پڑی ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ مالکِ مطبع نظامی جو اس حمائل کو چھاپتا تھا کسی بازاری عورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے، اور اس نے اس کو لوٹ کر کھکھ کر دیا۔ حمائل چھپی تو سہی مگر اَدھوری۔ اب روپیہ ہو تو وہ تمام ہو۔ میں پیشگی دے چکا ہوں۔ غرض حمائل کا تو ابھی نام نہ لو۔ اس اثناء میں ایک رسالہ ادعیۃ القرآن شائع کیا ہے اور وہ آپ کو بذریعہ بک پوسٹ پہونچے گا۔ یہ تو آپ کی نذر ہے۔ چھ آنے قیمت ہے کوئی خواہاں ہو تو طلب کر لیجئے گا۔ فقط، خاکسار"   نذیر احمد

پتہ اس طرح لکھا ہے:

کواتھ ضلع آرہ

بخدمت شریف سید ابن مرتضیٰ صاحب

کواتھ شاہ آباد (بخط انگریزی)

یہ خط پوسٹ کارڈ پر تحریر ہے۔ اس پر چاندنی چوک دلی کی مہر ۲۷ ستمبر اور ڈمراؤن کی مہر ۲۹ ستمبر ۱۹۰۳ء ثبت ہے۔ یہ خط اسی رُوز یا دوسرے رُوز کواتھ پہنچ کر مکتوب الیہ کو ملا ہوگا۔ یہ خط بھی میرے دادا صاحب (سید آل حسین صاحب سے بڑے تھے) کے نام ہے، موصوف سب رجسٹراری کے عہدے پر فائز تھے اور شخصی وجاہت کے سوا علمی لیاقت بھی عروج پر تھی، سرسید کے مدرسے کے شاگردوں میں تھے۔

اُردو شاعری میں رواجی شاعری کی بہتات ہے۔ اس سے کسی شاعر کا دامن پاک نہیں ہے، لیکن بعض شاعر ایسے ہیں جن کے یہاں تخلیق کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی شاعر دوامی کہلانے کے مستحق ہیں اور چک بست کا شمار ان ہی شعراء میں ہے۔ میں یقین سے نہیں

کہہ سکتا کہ چک بست کی، یہ غزل مطبوعہ ہے یا نہیں لیکن میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

کسے معلوم ہے کہاں رنگ بدلے اب فغاں اپنی
خدا حافظ ہے دل کا، بند ہوتی ہے زباں اپنی
فریب زندگی جس نے نہ دیکھا ہو مجھے دیکھے
نہ سینہ مین ہے دِل اپنا، نہ مُونہہ میں ہے زباں اپنی
صَدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر
ہزاروں پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں اپنی
شفق ہے آسماں پر، لالہ وگل باغ وصحرا میں
دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی

چک بست لکھنوٴ، ۱۸، اکتوبر ۲۳

ممکن ہے یہ غزل کسی سیاسی پلیٹ فارم سے سنائی گئی ہو، کیوں کہ اس کا انداز، پکار پکار کہہ رہا ہے کہ میرا سینہ داغ داغ ہے۔ معلوم نہیں کہ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ملک کے کس گوشہ میں "یوم شہید" منایا گیا تھا یا اپنے وطن کے کسی باغی کو "موت" کی سزادی گئی تھی، جو چک بست کا دل خون بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑا ہے۔

☆☆☆

حضرت علیؑ آئینہ رسولؐ میں

عرب کے ریگ زار، شہر مکہ میں جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں بطن آمنہ صلوٰۃ اللہ علیہا سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش جب ہوئی۔ تو پوری دنیا نُور سے منور ہونے کے لیے بیتاب ہو اٹھی۔ اسی نور محمدیؐ کے ایک ٹکڑے سے حضرت ابوطالب بن عبدالمطلب کے یہاں حضرت فاطمہ بنت اسد کے بطن سے جو بیٹا خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوا۔ وہ رسولؐ اکرم کی آغوشِ رسالت میں پروان چڑھ کر، ماہتاب دِین ہوگیا۔ ولادت کے بعد جب آنکھ کھولی تو خاتم الانبیاءؐ کا چہرۂ انور دیکھا اور شیرِ مادر سے پہلے اشرف المخلوقات اور سردار انبیاءؑ کا لعابِ دہن پیا۔ نام نامی علی ابن طالبؑ رکھا گیا۔ مادر گرامی نے حیدر رکھا۔ رسول اکرمؐ نے ابوتُراب کنیت عطا کی۔ دنیا نے کبھی علی پکارا اور کبھی اسداللہ۔ اور کبھی ابوالحسن سے مخاطب کیا۔ تاریخ نگاروں نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''حضرت علی'' رسولؐ اللہ کے چچا حضرت ابوطالبؑ کے بیٹے تھے۔ ابو طالب اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے مگر رسولؐ خدا کی حمایت کرتے تھے اور کفار قریش پر غیظ و غضب کا اظہار کرتے تھے۔ (صحیح بخاری، احادیث الانبیاء، باب قصہ ابی طالب)

یہی نہیں۔ مورخین کو اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ: ''جب ظلم وستم کے پہاڑ بھی حضرت ابوطالب کو رسولؐ اللہ کی اعانت کرنے سے نہ روک سکے تو کفار قریش کے تمام قبیلوں نے مل کر ایک معاہدہ مرتب کیا کہ محمد اور ان کے خاندان بنی ہاشم اور ابن مطلب سے اخلاقی وسماجی مقاطعہ بھی کر دیا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس معاہدہ کا مضمون منصور ابن عکرمہ نے تیار کیا تھا۔ جسے لکھ کر خانۂ کعبہ کے اندرونی حصہ میں موم جامہ میں لپیٹ کر احتیاط کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد ہی، جناب ابوطالبؑ نے مجبور ہو کر ایک پہاڑی درہ میں اپنے خاندان کے ساتھ پناہ لے لی۔ (جو آج بھی شعب ابی طالب کے نام سے موجود ہے) تین سال کی طویل مدت تک فَقرہ وفاقہ کی حالت اور سُوکھے چمڑے اور پتیاں کھا کھا کر دن گزارے۔ بچے بھوک سے بلبلاتے تو ان کے رُونے کی آوازیں پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا کر دُور پہونچتیں۔ مگر ظالم

کفار قریش کو رحم نہ آتا۔ ادھر جناب ابو طالبؑ نے بھی گویا قسم کھالی تھی کہ خدا کے محبوب اور اس کے رسول کو بے آسرا نہ چھوڑیں گے، ان کی اس اَدا پر خدا نے کرم کیا اور محمدؐ (رسول اللہ) نے تین سال گزرنے کے بعد اپنے نیک سیرت اور فِدائی چچا ابو طالب کو اس کی خوش خبری دی کہ "اے چچا! صرف اللہ کا نام جہاں جہاں باقی ہے۔ وہ حصہ باقی ہے۔"

(طبقات ابن سعد، ج ۱، ق ۱، ص ۱۴۱، و سیر ہشام ج ق ص ۲۰۳)

جناب ابو طالب نے اپنے بھتیجے کی اس بات پر یقین کامل فرماتے ہوئے کفار قریش کو اطلاع پہاڑی دَرّے سے بھجوادی۔ پہلے تو ان سبھوں کو یقین نہ آیا۔ مگر جب خانہ کعبہ جاکر، اس معاہدہ کو دیکھا، تو بیان ابو طالب کو سچا پایا۔ اس لیے مقاطعہ کو ختم کرنا پڑ گیا۔ اس طرح حضرت محمدؐ کی صداقت اور حضرت ابو طالب کی رِفاقت نے حضرت علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب کو اول لمحہ سے فدائے رسولؐ ہونے کا درس دیا۔ اور حضرت علیؑ نے گویا اسلام کی آغوش میں آنکھیں کھولی۔ اس لیے جب حضرت ابو ذر غفاریؓ کو رسولؐ اللہ کے دعویٰ نبوت کی خبریں پہنچیں، تو وہ آپؐ سے ملنے کی خاطر مکہ معظمہ تشریف لائے۔ لیکن وہ رسولؐ اللہ کو پہچانتے نہیں تھے۔ اور کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہتے تھے لہٰذا وہ مسجد ہی میں ٹھہر گئے۔ اور زَم زَم کا پانی پیتے رہے۔ جب رات ہوئی تو ان کے پاس سے حضرت علیؑ کا گزر ہوا۔ حضرت علیؑ نے سوچا کوئی مسافر ہے پھر ان سے مخاطب ہوکر دریافت کیا۔ حضرت ابوذر نے کہا "ہاں میں مسافر ہوں" حضرت علیؑ نے کہا "گھر چلو" وہ حضرت کے ساتھ چل دیئے۔ راستہ میں دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ جب صبح ہوئی تو وہ پھر مسجد آگئے۔ حضرت علی اپنے معمولات میں لگ گئے۔ شام ہوئی تو مسجد میں حاضر ہوئے دوسری رات آگئی۔ پھر ایسا ہی عمل رونما ہوا تیسری رات کو پھر حضرت علیؑ ان کے پاس سے گزرے تو خیال کیا۔ اس شخص کو ابھی تک اپنی منزل نہیں معلوم ہوئی۔ اور جب حضرت نے ابو ذر غفاری سے پوچھا تو انہوں نے اقرار کرتے ہوئے کہا ہاں "تب حضرت علیؑ نے ان سے کہا" "میرے ساتھ چلو" پھر پوچھا تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اگر کسی پر ظاہر نہ کرو تو میں بتاؤں۔ حضرت علیؑ نے کہا میں کسی پر ظاہر نہ کروں گا۔ تب حضرت ابوذر نے کہا۔ ہمیں یہ خبر پہونچی ہے کہ یہاں ایک شخص ہے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ میں اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ تم صحیح جگہ پر پہنچ گئے، میں اس وقت وہیں جارہا ہوں۔ تم بھی میرے پیچھے چلے آؤ۔ جہاں میں داخل ہوں تم بھی داخل ہو جانا۔ اور اگر مجھے کسی شخص

سے اندیشہ ہوگا تو میں کسی دیوار کے قریب رُک جاؤں گا۔ گویا میں یہ ظاہر کروں گا کہ میں اپنی جوتی ٹھیک کر رہا ہوں۔ مگر تم چلتے رہنا۔ الغرض حضرت ابوذر حضرت علیؑ کے ساتھ چلے اور رسولؐ اللہ کی خدمتِ اَقدس میں پہنچ گئے۔ پھر اسلام قبول کرلیا۔ (صحیح بخاری، باب قصہ ابی ذر و صحیح مسلم باب ابی ذر)

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ کا کتنا سچا اثر حضرت علیؑ پر تھا۔ اور آپؐ کی صحبت نے ہی آپ کو ''انسان کامل'' بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہجرت ہوئی تو رسولؐ خدا نے اپنا نائب بنا کر، ساری امانتیں آپؑ کے سپرد کر کے ہجرت فرمائی تھی۔ اور جب رسولؐ اللہ کے ذمہ کی اَمانتوں کو آپ نے حق داروں تک پہنچا دیا تو خود بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے حضرت کے پاس مدینہ پہنچ گئے۔ اور جب اسلام و کفر کے درمیان بدر کے مقام پر پہلا مقابلہ ہوا۔ تو بائیس سال کی عمر میں اس میں آپؑ شریک تھے۔ چنانچے ان مقابلہ کرنے والوں کے سلسلے میں جب حکم خدا ہوا:

یہ وہ دو فریق ہیں جو اپنے رب کے معاملہ میں ایک دوسرے سے لڑے۔
(صحیح بخاری کتاب المغازی، و صحیح مسلم شریف)

تو اسی جنگ بدر کے خاتمے کے بعد رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ کو مال غنیمت سے ایک اونٹنی اور خمس میں سے ایک اونٹنی عطا فرمائی۔

روایت ہے کہ اسی جنگ کے بعد یعنی ہجرت کے دوسرے سال حضرت علیؑ سے حضرت فاطمہؑ کا نکاح حضورؐ اقدس نے فرمایا۔ اور حضرت حارثہ بن نعمان انصاری کے بہت سے مکانات میں سے ایک مکان میں حضرت فاطمہؑ رخصت ہو کر تشریف لائیں۔ جسے حضرت حارثہؓ نے اپنی جانب سے رسولؐ اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

صحیح بخاری اور مسلم کا مشترک بیان ہے کہ ایک دن حضرت علیؑ کسی بات پر حضرت فاطمہؑ سے (خدانخواستہ) ناراض ہو کر مسجد میں جا کر لیٹ گئے۔ اسی اثناء میں رسولؐ خدا۔ تشریف لے آئے اور جناب فاطمہؑ سے پوچھا، تمہارے چچا کے لڑکے کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کیا مسجد میں ہوں گے، ''میرے اور ان کے درمیان ایک بات پر کچھ ناراضگی ہوگئی، جس سے وہ خفا ہو کر مسجد چلے گئے اور یہاں آرام نہ کیا''۔ رسولؐ اللہ نے یہ بات سنی، اُٹھے اور مسجد تشریف لے آئے۔ جہاں حضرت علیؑ لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی چادر سر کی ہوئی تھی اور پیٹھ پر مٹی لگ گئی تھی۔ آپؐ نے ان کی پیٹھ سے مٹی جھاڑنی شروع کر دی اور فرماتے جاتے ''اے

ابوتراب (اے مٹی کے باپ) اٹھو۔ اے ابوتراب اُٹھو (صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس عن علی و صحیح مسلم) حضرت علیؑ نے جو حضورؐ کی آواز سنی اور یہ خطاب سُنا تو خوش ہو گئے۔ اس دن سے حضرت علیؑ کی یہی کنیت مشہور ہو گئی۔ جسے وہ خود بھی بے حد پسند فرماتے تھے۔

اسی طرح باب مناقبِ علیؑ میں حضرت امام بخاری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ "(صحیح بخاری و مسلم شریف) جناب سیدہؑ اپنے گھر میں چکی پیسا کرتی تھیں۔ جس سے اُن کو کافی زحمت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ رسولؐ خدا کے پاس کچھ قیدی آئے حضرت فاطمہؑ اپنے والد ماجد کے پاس گئیں، تاکہ ایک خادمہ حضورؐ سے طلب کریں۔ رسولؐ اللہ اس وقت گھر میں نہ تھے۔ ان کی ملاقات حضرت عائشہؓ سے ہوئی۔ حضرت فاطمہؑ نے اپنے آنے کا مقصد ان سے بیان کیا، اور اپنے گھر واپس چلی گئیں۔ جب رسولؐ اللہ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؑ کے آنے کی اطلاع دی اور مقصد بھی بیان کیا۔ رسولؐ اللہ اسی وقت حضرت فاطمہؑ کے گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب آپؐ وہاں پہنچے تو وہ اور حضرت علیؑ اپنے بستر پر لیٹ چکے تھے۔ حضرت علیؑ نے حضور کو دیکھ کر اٹھنا چاہا مگر آپؐ نے دونوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ وہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ پھر خود حضور بھی ان دونوں کے درمیان جا کر بیٹھ گئے (کہ رسولؐ کا قدم مبارک حضرت علیؑ کے سینۂ مبارک سے چھو رہا تھا، کہ ان کو آپؐ کے پیروں کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی) کچھ لمحہ توقف کے بعد حضورؐ نے فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو اس چیز سے بہتر ہو، جس کا تم نے سوال کیا ہے؟" پھر خود ہی سلسلہ کو باقی رکھتے ہوئے کہا "وہ یہ کہ جب بستر پر لیٹ جاؤ تو ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمدللہ کہہ لیا کرو۔ یہ تم دونوں کے لئے خادم سے بہتر ہے" (صحیح بخاری و صحیح مسلم باب التسبیح) یہی تعلیم آگے چل کر تسبیح اربعہ، کہلائی یا جسے عام زبان میں تسبیح فاطمہؑ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی واقعہ سے رسولؐ اللہ کے دل میں اپنی بیٹی اور حضرت علیؑ کے لئے جو خلوص اور محبت تھا اس کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ بھی کہ حضور کو جناب سیدہؑ کی تکلیف اور مشقت کا احساس شدید بھی تھا لیکن پوری امت کے خیر خواہؐ کا فرض تھا کہ وہ کنیزی کی صفت کی نفی کریں اور اس کام کی ابتدا اپنے گھر سے کریں۔

اسی طرح حضرت امام بخاری نے 'کتاب الجہاد' میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے کہ جب جنگ خیبر کے لئے حضورؐ روانہ ہوئے تو اس وقت حضرت علیؑ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ اس لئے رسولؐ کے ہمراہ سفر نہ کر سکے۔ مگر جب خیبر کی جنگ شروع ہوئی اور کئی دن اسے گزر گئے تو ایک شام رسولؐ خدا نے اعلان کیا کہ 'کل میں اس شخص کے ہاتھ میں علم

دوں گا، جس سے اللہ اور اس کا رسولؐ محبت کرتے ہیں، اور جو خود بھی اللہ و رسول سے محبت کرتا اور اللہ اس کے ہاتھ سے فتح عنایت کرے گا۔ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد) اور ایسا ہی ہوا جب صبح نمودار ہوئی تو رسولؐ خدا نے اپنے اصحاب سے فرمایا ''علیؑ کہاں ہیں؟'' ایک صحابی نے بتایا کہ وہ آخر حصہ شب میں آئے ہیں۔ مگر ان کی آنکھ دکھ رہی ہے۔ اس لئے وہ اپنے خیمہ مین ہیں اور اذیت کی حالت میں ہیں۔ تب حضورؐ نے حضرت سلمہ بن اکوع سے کہا کہ ''حضرت علیؑ کو بلا لاؤ''۔ حضرت سلمہؓ گئے اور ان کو پکڑ کر یعنی سہارا دیکر اپنے ساتھ لے آئے۔ رسولؐ خدا نے اپنا لعاب دہن اُن کی آنکھوں میں لگا دیا۔ اور دعاء صحت بھی کی۔ حضرت علیؑ اسی وقت تندرست ہو گئے گویا ان کو کوئی تکلیف سرے سے تھی ہی نہیں (صحیح مسلم کتاب فضائل علیؑ) پھر اللہ کے رسولؐ نے ان کو علم دیا۔ وہ میدان جنگ میں تشریف لے گئے اور فتح یاب واپس آئے۔ مگر اس ذیل میں یہ واقعہ ذہن و خیال میں رکھنے کے لائق ہے کہ جس وقت جنگ خیبر کے لئے علیؑ نے رسولؐ خدا سے رخصت کی اجازت طلب کی تو دریافت کیا کہ۔ کیا میں ان سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ ہماری مثل (مسلمان) نہ ہو جائیں؟'' رسولؐ خدا نے مسکرا کر فرمایا'' تم جا کر ان کے میدان میں پڑاؤ کرو۔ اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان کو فرائض اسلام کی تعلیم دو۔ اللہ کی قسم اگر اللہ تمہارے ہاتھ پر کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے''۔ (کتاب المغازی عب سہیل) چنانچہ حضرت علیؑ نے حکم رسولؐ کے مطابق عمل کیا۔ مگر یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اور اس کا سردار سپہ سالار مرحب نامی رجز پڑھتا ہوا میدان کارزار میں آیا۔ اور فخریہ کیا:

''خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں۔ میں ہتھیار بند، بہادر اور جنگ آزمودہ، ثابت قدم ہوں۔ اس وقت جب لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے''۔

مرحب کی اس رجز خوانی پر حضرت علیؑ نے توصیف خداوندی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ رجز خوانی فرمائی:

میں وہ ہوں کہ میری ماں (فاطمہ بنت اسد) نے حیدر میرا نام رکھا۔ اس شیر کی طرح جو جنگل میں بہت خوفناک نظر آتا ہے۔ میں دشمن کو ایک صاع کے بدلے اس سے بڑا پیمانہ دیتا ہوں'' (صحیح مسلم۔ باب جہاد)

مقابلہ ہوا۔ حضرت علیؑ نے مرحب کے سر پر ایک ضرب لگائی اور پھر اسے قتل کر دیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے قول صادق کی آبرو رکھی، اور علیؑ کے ہاتھ پر جنگ خیبر فتح ہوئی۔
جنگ خیبر سے پہلے جنگ اُحد رونما ہو چکی تھی۔ جس میں خود حضرت علیؑ شریک تھے۔
اسی طرح بیعت رضوان میں بھی آپ شریک تھے اور جب ''صلح نامہ حدیبیہ'' لکھنے کا وقت آیا تو حضرت علیؑ کو حضورؐ نے کاتب صلح نامہ مقرر فرمایا۔ اس وقت کافروں کے نمائندے سہیل نے ''من محمد رسول اللہ'' لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ تو رسولؐ اللہ نے فرمایا ''اے علی۔ رسول اللہ کاٹ کر، ابن عبداللہ لکھ دو'' اس پر حضرت علیؑ نے عرض کیا ''اے خدا کے رسول یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ محمد رسول اللہ کے اسم گرامی لکھنے کے بعد اسے اپنے قلم سے کاٹ دوں'' تب رسولؐ مقبول نے کاغذ لے کر خود اس لفظ کر مٹا دیا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے پورا صلح نامہ حدیبیہ تحریر فرمایا''۔ (صحیح بخاری کتاب الصلح) اس صلح نامہ پر، مورخین کا اتفاق ہے کہ بعض اصحاب رسولؐ کو اعتراض بھی ہوا مگر خود حضرت علیؑ نے کبھی شک نہ کیا۔ اور بعد میں بھی اتفاق ہے کہ ''صلح حدیبیہ'' کے مطابق جب دوسرے سال رسول اکرمؐ عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لائے تو حضرت علیؑ ہمراہ تھے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الصلح) آگے چل کر امام موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ...... حضورؐ کو حسب عہد نامہ مکہ معظمہ میں تین دن قیام کرتے گزر گئے تو کفار مکہ نے کہا آپ رخصت ہو جائیں''۔ حضرت علیؑ نے حضورؐ سے ذکر کیا تو رسولؐ اللہ نے مکہ معظمہ کو چھوڑ دیا۔ اور جب حضورؐ روانہ ہوئے تو حضرت حمزہؓ کی چھوٹی بیٹی کو علیؑ نے اپنی گود میں اٹھا لیا اور حضرت فاطمہؑ کے پاس جا کر کہا ''اپنے چچا کی اس بیٹی کو سنبھالو''۔ انہوں نے بچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ خبر جب اہل قافلہ کو معلوم ہوئی تو ان میں سے حضرت جعفرؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ نے حضرت علیؑ سے کہا۔ اس بچی کی پرورش کرنے کا حق صرف میرا ہے، مگر آپ اس پر تیار نہ ہوئے اور فرمایا ''یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور میں ہی اسے اٹھا کر لایا ہوں۔ لہٰذا کسی اور کو پرورش کے لئے دینے کے مقابلے میں، خود میرا فرض زیادہ ہے'' حضرت جعفرؓ نے جواب دیا ''اس کی خالہ میری بیوی ہے اور یہ میرے بھی چچا کی لڑکی ہے'' اسی طرح حضرت زیدؓ نے اپنا حق جتاتے ہوئے کہا ''یہ میرے دینی بھائی کی بچی ہے لہٰذا اس کی پرورش اور دیکھ بھال کا حق میرا ہے'' بات یہاں تک بڑھی کہ معاملہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں پہونچا۔ آپ نے فرمایا ''علیؑ کا دعویٰ سچا ہے مگر خالہ کا حق زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اس بچی کی پرورش کا حق جعفر کو زیادہ ہے'' پھر حضرت زیدؓ سے مخاطب ہو کر رسولؐ برحق نے کہا۔ ''تم ہمارے بھائی ہو اور دوست بھی ہو'' اور حضرت علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا''

تم مجھ سے ہو میں تم سے ہوں''۔ اس بات کے بعد حضرت علیؑ نے جناب فاطمہؑ سے بچی کو لے کر حضرت جعفر کی آغوش میں دے دیا۔ اور یہ قضیہ اس طرح تمام ہوگیا۔

رسولؐ خدا کی آغوش تربیت کے پروردہ سیدنا علی ابن ابی طالبؑ کی ذات ستودہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور کی منشاً و مرضی کا کس حد تک پاس و خیال حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے۔ اور آپؑ کے ہر لفظ کے مقصد کا کس طور سے آپ علم رکھتے تھے کہ خود حضورؐ کے عہد کے اکابرین کو بھی اس کا احساس نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو معدودے چند اشخاص ہی اس وصف سے متصف تھے، وہ بھی کسی حد تک۔ یہ واقعہ اس کی نادر مثال ہے۔

حضرت امام بخاری کے باب علامت النبوۃ اور صحیح مسلم کی کتاب صلاۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ ایک دن حضورؐ اکرم کے ساتھ ہم سفر تھے اثناء راہ پانی قافلہ والوں کی چھاگل اور برتنوں تک کا ختم ہوگیا۔ یہاں تک کہ پانی کا ایک قطرہ بھی پینے کے لئے کسی کے پاس نہ رہا۔ ہمراہیوں نے رسولؐ اللہ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے اسی جگہ قیام کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اور حضرت علیؑ کو بلا کر ارشاد کیا ''پانی تلاش کریں'' حضرت علیؑ معہ اپنے دو ایک ساتھیوں کے پانی کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔ تھوڑے راستہ ہی پر ایک عورت ملی جو اپنی سواری پر دو پکھالے لٹکائے جا رہی تھی۔ آپؑ نے اسے رُوک کر، دریافت کیا کہ پانی کہاں سے ملے گا؟'' اس نے جواب دیا'' پانی یہاں کہاں ہے'' حضرت علیؑ نے دریافت کیا'' تمہارے گھر اور پانی کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟'' اس عورت نے کہا'' بس یہ سمجھو، ایک دن اور رات کا سفر کرنے کے بعد پانی مل پایا ہے۔ چنانچہ میں کل اسی وقت پانی جہاں ملتا ہے، وہاں تھی''۔ حضرت علیؑ نے فکر مند لہجہ سے کہا'' تکلیف تو ہوگی مگر تم زحمت کر کے اگر ہمارے رسولؐ تک چل سکو، تو مہربانی ہوگی۔ اس عورت نے پوچھا، کون رسولؐ؟ وہی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بے دین ہیں؟ ہمارے خداؤں کو برا کہتے ہیں؟'' آپ نے نرم لہجہ میں فرمایا۔ ہاں، جن کو تم ایسا خیال کرتی ہو۔ وہی ہمارے رسولؐ ہیں'' وہ عورت حضرت علیؑ کے ارشاد پر رضامند ہوگئی اور آپ اسے لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے اس سے بات شروع کی، تسلی آمیز کلمات کہے۔ وہ بہت حد تک مطمئن ہوگئی۔ تب حضورؐ نے لوگوں سے کہا'' جس قدر پانی پی سکتے ہو، شکم سیر ہو کر پی لو۔'' سب نے ایسا ہی کیا۔ جن مسافروں کے پاس برتن تھے، انہوں نے پیا بھی اور برتنوں کو بھرا بھی۔ وہ عورت حیرت سے یہ ماجرا دیکھتی رہی۔ اس کی تبدیلی پر حضرت علیؑ نے اُسے مخاطب کیا اور کہا۔'' پریشان نہ ہو۔ ہمارے

نبیؐ سے ناامید نہ ہونا''۔ ایسا ہی ہوا، اس لئے کہ جب پکھالوں کا منہ بند کیا گیا تو اس عورت نے دیکھا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ بھری ہوئی ہیں۔ (صحیح بخاری و مسلم شریف قضاء الصلاۃ) وہ عورت خوش خوش اپنی منزل کی سمت رَواں دَواں ہوگئی۔

اسی طرح فتح مکہ سے پہلے جب حضور اکرمؐ نے مکہ پر حملہ کرنا چاہا تو ایک شخص جس کا نام 'حاطب' تھا۔ اس نے کفار مکہ کو رسول اللہؐ کے اس ارادہ سے مطلع کردیا۔ اور اس کے لئے ایک بوڑھی عورت کو آلہ کار بنا کر، کفار مکہ کو ایک خط کے ذریعہ حملۂ رسولؐ کی اطلاع بھیج دی۔ مگر حضرتؐ کو حاطب کے غلام نے اس امر کی اطلاع جا کر دے دی۔ اس اطلاع پر رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ اور حضرت مقدادؓ وغیرہ کو حکم دیا کہ ''تم لوگ روضۂ خاخ جاؤ۔ وہاں تم کو ایک بوڑھی عورت ملے گی۔ اس کے پاس وہ تحریر ہے۔ تم اس مکتوب کو اس سے لے لینا'' رسولؐ خدا کے حکم کی تعمیل میں قافلہ حضرت علیؑ کی نگرانی میں روانہ ہوگیا۔ اور تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے روضۂ خاخ تک پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے رسولؐ مقبول کی نشان دہی کے مطابق اس بوڑھی عورت کو دیکھا۔ حضرت علیؑ نے اس کے پاس جا کر کہا ''وہ خط نکال، جسے تو مکہ لے کر جارہی ہے'' عورت نے انکار کرتے ہوئے کہا ''میرے پاس کوئی خط نہیں ہے'' اس کے انکار پر حضرت علیؑ نے حکم دیا کہ اسے سواری سے اُتار لیا جائے اور اس کے پالان کی تلاشی لی جائے۔ چنانچہ تلاشی لی گئی مگر وہاں کچھ نہ ملا۔ تب حضرت علیؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''ٹھیک ہے، مگر قول رسول بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ خط اس عورت کے پاس ہی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اس ذات کی قسم جس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ تو خط نکال، ورنہ ہم تیرے کپڑے پھاڑ دیں گے اور تلاشی لے کر ہی دم لیں گے''۔ ایسی نازک صورت حال جب اس عورت نے دیکھی تو اپنے بالوں کے جوڑے سے خط نکال کر حضرت علیؑ کے حوالے کردیا۔ (صحیح بخاری۔ باب الجاسوس عن علیؑ و صحیح مسلم باب فضائل اہل بدر) آپ نے خط اور اس عورت کو لاکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کردیا۔ اس طرح اس بڑے فتنہ کا سد باب ہوا اور حضورؐ نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور مکہ فتح ہوگیا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل غور ہے کہ رسولؐ اللہ نے ۱۰ھ میں جب مدینہ سے مکہ مکرمہ حج کے واسطے اختیار کرنے کا ارادہ فرمایا اور جب آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے تو ان لوگوں کو جو قربانی کا جانور ساتھ نہیں لائے تھے عمرہ کرنے کے احرام کھول دینے کا حکم جاری کیا۔ اس وقت حضرت علیؑ نہیں تھے مکہ مکرمہ جب آئے تو حکم رسولؐ کی اطلاع ملی۔ آپؑ اس وقت خدمت میں حاضر

ہوئے اور اپنے لئے دریافت فرمایا۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا ''ہاں: تم نے جو کچھ سنا ہے درست ہے''۔ پھر گویا ہوئے ''مگر تم نے کس چیز کا احرام باندھا تھا؟ حضرت علیؑ نے عرض کیا ''میں نے تو یہ نیت کی کہ اے اللہ جس چیز کا ہمارے نبی اکرم نے باندھا ہے، میں بھی ویسا ہی احرام باندھتا ہوں۔ یہ سن کر خاتم الانبیاءؐ نے فرمایا''۔ میرے ساتھ قربانی کا جانور ہے، (تمہارے ساتھ بھی قربانی کا جانور ہوگا) اس لئے تم بھی احرام نہ کھولو۔ ہاں اگر میرے ساتھ قربانی کا جانور نہ ہوتا، تو میں بھی عمرہ کر کے، احرام کھول دیتا''۔ چنانچہ تاریخ کا بیان ہے، ۱۰؍ذی الحجہ کو حضرت ختمی مرتبتؐ نے ۱۶۳؍اونٹوں کی قربانی بہ نفس نفیس فرمائی اور ۱۳۷؍اونٹ حضرت علیؑ نے نحر کئے۔ (صحیح مسلم۔ باب حجتہ النبیؐ و باب یوم النحر)

اس لئے کہ رسولؐ اللہ نے ان کو اپنی قربانی میں شریک کرلیا تھا۔ پھر حضورؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ قربانی کا گوشت، اس کی کھال، سب لوگوں میں تقسیم کردیں۔ اور قصائی کو اس کی مزدوری کے عوض ان چیزوں میں سے کچھ نہ دیں۔ حضرت علیؑ نے حکم رسولؐ کے مطابق عمل کیا۔

اس ذیل میں صاحب کتاب صحیح مسلم کی یہ بھی روایت ملتی ہے کہ رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ سے یہ فرمایا تھا۔ ''ہر اونٹ میں سے ایک ایک ٹکڑا لے کر سب کو یکجا کر کے پکالیا جائے۔'' چنانچہ اس ارشاد نبویؐ کے مطابق جب سالن تیار ہوگیا تو حضورؐ اقدس اور حضرت علیؑ نے ایک ساتھ گوشت کھانے مین شرکت کی اور اس کا شوربا پیا۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ۸ھ میں اللہ کے حکم سے آپؐ نے جنگ وجدل کے بغیر مکہ فتح کیا تھا۔ اور اسلام میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ اور خود رسولؐ اللہ نے اپنی چھڑی سے کعبہ میں جو بتوں کے انبار لگے تھے، ان کو گرائے، اور جو بلند و بالا تھے ان کو علی مرتضیٰ کو اپنے کندھے پر سوار کرا کے گروانا شروع کیا اور یہ آیت تلاوت کرتے جاتے:۔ ''حق آ گیا۔ باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا تھا''۔

اس کے بعد ۹ھ میں حج فرض ہوگیا، اور حضرت علیؑ کو سورۃ برات کی چالیس آیات لے کر مکہ معظمہ روانہ کیا، کہ حضرت ابوبکرؓ کی سربراہی میں جو حجاج بغرض حج گئے ہوئے ہیں ان کو جا کر بتادیں کہ:

''اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کے اندر داخل نہیں ہوگا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہیں کریگا''۔

اس طرح حدود حرم میں کفار کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ جس کا سلسلہ آج تک کیا قیامت تک باقی رہے گا۔ مگر ۹ ھ میں یعنی دور اسلامی میں پہلا حج ۸ ھ میں اور قدیم طرز پر اور ۹ ھ میں دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقہ اور کفار نے اپنے طریقہ پر کیا۔ ان میں رسولؐ اللہ نے شرکت نہیں کی تھی، مگر جب تیسرا حج ۱۰ھ میں ہوا تو وہ خالص اسلامی طریقہ پر ہوا۔ یعنی جب شرک کا خاتمہ ہو گیا۔ تب نبی اکرمؐ نے حج کیا۔ جسے 'حجتہ الوداع' بھی کہتے ہیں۔ گویا اسلام کے بعد حضورؐ نے اول و آخر یہی حج فرمایا، کہ اس کے بعد اس سال ماہ صفر کی ۲۸ کو وفات ظاہری واقع ہوگئی۔

صاحب تصنیف صحیح مسلم شریف نے کتاب الزکوٰۃ کے تحت یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ۔ ایک دن حضرت ربیعہؓ اور حضرت عباسؓ نے آپس میں کہا کہ ہم اپنے بیٹوں (عبدالمطلب اور (فضل) کو رسولؐ اللہ کی خدمت میں بھیجیں۔ تا کہ حضورؐ ان کو بھی کسی جگہ کا عامل مقرر کر دیں اور ان کو بھی دوسروں کی کچھ مال ملے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت علیؑ وہاں تشریف لے آئے ان لوگوں نے حضرت علیؑ سے بھی مشورہ کیا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ "ان لڑکوں کو رسولؐ اللہ کے پاس نہ بھیجنا۔ اللہ کی قسم رسولؐ اللہ ایسا نہیں کریں گے۔"

"حضرت ربیعہ نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا کہ۔ یہ بات تم حسد کی وجہ سے کہہ رہے ہو حالانکہ ہم نے تو رسولؐ اللہ کی دامادی کے شرف پر بھی تم سے حسد نہیں کیا۔ حضرت علیؑ نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی "اچھا تو تم ان بچوں کو بھیج کر دیکھ لو"۔ یہ کہہ کر حضرتؑ نے چادر بچھائی اور لیٹ گئے۔ پھر فرمایا: میں ابوالحسن ہوں۔ سید ہوں۔ اللہ کی قسم یہاں سے اس لمحہ تک نہیں ہلوں گا، جب تک تمہارے بیٹے رسولؐ خدا کے پاس سے واپس نہیں آجاتے"۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ربیعہ اور عباسؓ اپنے لڑکوں کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آئے اور کہا۔ "رسولؐ اللہ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا ہے"۔

اور رسولؐ اللہ نے ان کو عامل نہیں بنایا۔ اس طرح قول علیؑ سچا ثابت ہوا۔ اس واقعہ سے ہمیں حضرت علیؑ کے فیصلے اور بصارت ذہنی کا علم ہی نہیں ہوتا بلکہ ایقان اور ایمان رسولؐ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ہم اگر بصیرت کی آنکھ رکھتے ہوں اور کشادہ ذہن کے مالک ہوں تو یہ خوشی اس امر کا اقرار کریں گے کہ ہمارے نبیؐ کو اولاد کی تربیت و تعلیم کا موقع اگرچہ نہیں ملا۔ لیکن یہ ساری کمی، آپؐ نے تربیت جناب علیؑ اور اولادِ علیؑ، کی پرداخت کر کے، دُور فرما دی تھی۔ یہ درست

ہے کہ ہمارے حضورؐ خیر امت تھے مگر یہ بھی حق ہے کہ آپ نے اپنی ذریات کے ساتھ، علیحدہ اور خصوصیت سے توجہ دی تھی۔ یوں تو حضورؐ کی شفقت ہر عامی کے ساتھ تھی مگر علیؑ کے ساتھ جو رَوابط اور اُلفت تھی۔ اس کی دوسری مثال صفحۂ تاریخ پر نظر نہیں آتی۔

چنانچہ مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے جو کچھ ذکرِ علمی کتب میں پایا۔ اس کو اساس بنا کر، اور ان کو نگاہِ حق سے دیکھ کر، ہدیۂ قارئین کیا ہے۔ غلو اور بے جا واقعات سے صرفِ نظر کرنے کے باوجود، اہم اور چیدہ واقعات سے جو تصویرِ علیؑ بنتی ہے۔ اس کے پس پشت عکسِ رسولؐ برحق صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو خانۂ کعبہ کا دَر جب آغوش کھول دے اور حضرت ابوطالبؑ کے بیٹے کی ولادت باسعادت اس کے بطن میں ہو۔ پھر وہ بچہ اپنی ماں کے دُودھ کے بجائے، اوّل بار لعابِ رسولؐ چُوس کر، آنکھ کھولے، اور چہرۂ نورؐ کی تابانی سے مشرف ہو۔ نیز جب انگلی پکڑ کر ۱۳/رجب المرجب سے لے کر، عہدِ جوانی تک، حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہم رکاب رہے، جنگ اور صلح، سفر اور حضر، حج اور قربانی، فیصلے اور عدالتوں۔ ہجرت اور اَمانت میں برابر کا شریک ہو۔ خدائی اِحکام کو اس کی اپنی منزلت اور رسولؐ کے فرمان کو اپنی قدروں کے دائرے میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ پھر اپنے بچوں۔ اصحابِ اہل علم اور اہل ایمان کو اس کی سمت متوجہ کرنا اپنا فریضہ خیال کرتا ہو۔ ایسے مردِ مومن کی شخصیت کو سمجھنا، اس قدر آسان نہیں'' پھر ہمارا فرض ہے کہ حضرت علیؑ کو سیرت رسولؐ اور قول نبی کے دائرے میں رکھ کر دیکھیں۔ اس لئے کہ اللہ نے جو کچھ کہنا چاہا۔ وہ ہمارے رسولؐ برحق کے واسطے سے ہم تک پہنچوا دیا۔ اسی طرح نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور ممات ظاہری کے بعد، جو کچھ رسولؐ خدا نے اپنی امت سے کہنا چاہا۔ اس کے لئے دانشورانہ طور پر کوئی دوسرا، حضورؐ کی نظر میں سوائے علیؑ مرتضیٰ کے، اور نہ تھا۔ اس بات کے بیشتر ثبوت اور شواہد متذکرہ واقعات میں مل جائیں گے، اسی طرح اور بہت سی باتیں واُمور ہیں جن کی نشان دہی ان سطور میں کی جاتی ہے کہ ان میں وہ دینی فیصلے، قوتِ ارادی کی طاقت، علمی مباحث اور نظری فیصلے بھی ہیں۔ جن کا کسی ایک ذات میں جمع ہونا، سوا توفیق الٰہی کے اور فرمان محمدیؐ کے، ممکن نہ تھا۔ اب ہم ان کو اہم اور سچے واقعات کا نام دیں، یا بصیرت علیؑ کہیں۔ کوئی فرق نہ ہوگا۔ اس لئے آیئے ان سچے موتیوں سے دین کی مالا بنائیں اور زادِ آخرت کے طور پر اپنے دل میں ان کو آویزاں کر لیں۔ ہاں دلِ مردِ مومن کا ہونا شرط ہے، اور محبت اور الفت رسولؐ کی رمق کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ حضرت علیؑ کو ہم، رسول اللہؐ

کی منزل چاہت تسلیم کرتے اور اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ بقول شاعر:

بے حُبّ اہل بیت، عبادت حرام ہے

اس لئے کہ صحیح ترین حدیث میں ہے کہ جس نے آل علیؑ سے محبت کی، اس نے گویا علیؑ سے محبت کی اور جس نے علیؑ سے محبت کی۔ اس نے گویا رسولؐ برحق سے محبت کی اور جس نے رسولؐ برحق سے محبت کی اس نے یقیناً اللہ جل شانہ سے محبت کی۔ اس کی معرفت کو پہچانا۔ اُس کی وَحدانیت کا اقرار کیا۔ اور میں کہتا ہوں جس نے بھی وحدانیت کا اقرار کیا۔ گویا وہ نارِ جہنم سے بَری ہونے کا خواہاں ہوا۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ ہم اگرچہ معصیت کے انبار تلے دبے ہوئے ہیں، مگر چوں کہ اللہ اور محمدؐ پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ اس لئے دیر یا سویر ہماری بخشائش بھی ہوگی۔ لیکن اللہ کو پہچانتے اور اس کی رحمت کے زیرِ سایہ آنے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی کو اپنا شعار بنائیں۔ اُن کی خوشی پر، اپنے فاسد جذبات وخیالات کو سبقت نہ کرنے دیں۔ بہر کیف، اب وہ واقعات جن میں ہم کو دین بھی ملتا ہے اور طاعت کا طریقہ بھی، بندگی بھی ملتی ہے اور کیف بھی اس کا مطالعہ کریں۔

۱۔ ایک بار حج کے موقع پر حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم نے حکم دیا کہ عمرہ اور حج کی نیت ایک ساتھ نہ کی جائے۔ یہ اطلاع جب گوشِ علیؑ تک پہنچی تو آپ نے بلاخوف اس کی تردید کی اور فرمایا۔ لبیک بعمرۃ حجتۃ (صحیح بخاری۔ باب مناسک حج تمتع) پھر تاکید کی کہ عمرہ اور حج کی نیت ایک ساتھ کی جائے۔

۲۔ ایک بار ایک صحابی سے علیؑ مرتضیٰ نے فرمایا۔ جب میں رسولِ خدا کی کوئی حدیث بیان کروں، اس وقت حضورؐ کی طرف کوئی غلط بات یا جھوٹ منسوب کرنے سے بہتر ہے کہ میں آسمان سے نیچے گر پڑوں (صحیح بخاری کتاب الصلاۃ)

۳۔ رسولِ خدا سے رفاقت واطاعت کا یہ حال تھا کہ جنگ تبوک کو روانگی کے وقت بعض ضروری مصالح کی بنا پر حضورؐ نے حضرت علیؑ کو مدینہ منورہ میں قیام کے لئے فرمایا۔ حضرت علیؑ نے خاموشی اختیار کر لی۔ مگر جب خود رسولؐ اللہ نے احساس فرمایا اور تسلی وتشفی کے کلمات کہے تو حضرت علیؑ نے بخوشی قیام فرمایا۔ (صحیح مسلم۔ باب من فضائل علی) دراصل علیؑ مرتضیٰ سے نارفاقت مصطفیٰ برداشت کے قابل نہ تھی۔ مگر حکم وارشادِ نبیؐ کی تعمیل فرض تھی۔ وہ کی۔

۴۔ رسولؐ اللہ نے ایک بار فرمایا تھا کہ۔ میری وفات کے بعد ایک ایسا شخص سر اٹھائیگا، جس کے ایک ہاتھ میں کلائی نہ ہوگی۔ اور بازو مثل پستان کے ہوں گے۔ (عبداللہ بن وہب اس لشکر کا سپہ سالار تھا اور امیر شام کی طرف سے اس نے جنگ کی تھی) حضرت علیؑ نے اس لشکر

سے منشاء نبویؐ کے مطابق جہاد کیا اور فتح کے بعد حکم دیا کہ اس آدمی کی لاش تلاش کی جائے۔ جس کے ایک کلائی نہ ہو۔ دو دفعہ کی تلاش بسیار کے بعد بھی ایسی لاش نہ ملی تو ڈھونڈنے والوں نے حضرت علیؑ تک یہ بات پہنچائی۔ مگر ان کی بات سن کر علیؑ مرتضیٰ نے فرمایا ''بخدا امت سے رسولؐ خدا نے غلط بات نہ کہی ہوگی'' اس کے بعد پھر تلاش کا حکم دیا اور خود بدولت بھی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ کئی لاشوں کے نیچے سے وہ لاش دبی ہوئی نکلی جس کی حضرت کو تلاش تھی۔ تب آپ نے بے ساختہ فرمایا ''اللہ نے سچ فرمایا ہے اور اس کے رسولؐ نے بھی سچ بات کہی تھی۔''

۵- ایک بار حضرت ابوجحیفہؓ نے حضرت علیؑ سے دریافت کیا: کیا آپ کے پاس کوئی کتاب (خاص) ہے۔ ''حضرت علیؑ نے فرمایا: قرآن کے سوا ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں۔ ہاں، ہمارے پاس وہ فہم (شعور) ہے جو ایک مسلمان کو خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اور پھر ہمارے پاس وہ ہے جو اس (صحیفہ) میں ہے۔ (صحیح مسلم۔ باب کتاب الحج اور صحیح بخاری کتاب العلم) حضرت جحیفہؓ نے پوچھا: اے علیؑ! اس صحیفہ میں کیا ہے؟'' حضرت علیؑ نے کہا: ''اس میں دیت کے مسائل، قیدی چھڑانے کے مسائل اور کوئی مسلمان، کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے، جیسے مسائل شرعی درج ہیں۔ (نجاشی۔ کتاب الرجال، ص ۳) بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ وہ صحیفہ تھا جو وصال رسولؐ کے بعد علیؑ مرتضیٰ نے تیار کیا تھا۔ جس میں قرآن مجید کو اس کی اپنی تنزیل کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔ مگر خلیفہ اول کے ارشاد پر جب جمع قرآن کا کام شروع ہو گیا تو آپ نے محض تطہیر و حرمت کلام اللہ کی خاطر اسے عام نہ کیا اور اپنی حیات آخر تک اسے منظر عام پر نہ لائے۔

۶- ایک شخص نے حضرت علیؑ سے سوال کیا ''وہ کیا بات ہے۔ جس کو رسولؐ نے آپ کے علاوہ سب سے خفیہ رکھا؟'' حضرت علیؑ نے برجستہ جواب دیا ''اللہ کے رسولؐ نے ۴ باتیں مجھ سے کہیں تھی'' اس شخص نے پوچھا وہ کون سی باتیں تھی؟'' حضرت علیؑ نے کہا'' قول رسولؐ ہے کہ اللہ اس شخص پر لعنت کرتا ہے جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے۔ اللہ اس شخص پر بھی لعنت بھیجتا ہے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے۔ اور اللہ کی اس شخص پر بھی لعنت ہے، جو کسی بدعتی کو ٹھکانا دے، اور اللہ کی اس شخص پر بھی لعنت ہے جو زمین کی حدود کو بدل دے یعنی دوسرے کی زمین کو اپنی زمین میں شامل کر لے۔'' (صحیح مسلم باب تحریم)

۷- ابن سعد کی روایت ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک دن فرمایا کہ خدا کی قسم، بسم اللہ، سے لے کر، والناس، تک یعنی از اول تا آخر قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں، جس کو میں

نہ جانتا ہوں کہ وہ کس وقت اور کس جگہ اور کس موقع پر اور کس کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ (نیابع المودة ص ۲۸۷)

۸- امام فخر الدین رازی کا بیان ہے کہ علیؑ کے علم میں کسی کو شک نہیں، وہ تمام صحابہ سے اَعلم ہیں۔ وہ اصل خلقت میں نہایت ذکی اور طلب علم میں غایت درجہ بلند تھے۔ اور حضرت رسولؐ جو کہ افضل الفضلاء، اعلم العلماء تھے، ان کی تربیت وارشاد میں افضل ہو گئے تھے کہ علیؑ بچپن سے ہی آغوش تربیت آں حضرتؐ میں رہے۔ اور جب جوان ہوئے تو آپؐ کے داماد ہو گئے اور کبھی کسی امر میں مانع نہ ہوئے۔

۹- ایک گفتگو میں امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے ایک صحابی سے کہا کہ "مجھے جو علم خدا کی جانب سے ملا ہے، اس کے مطابق میں اہل توریت کا فیصلہ توریت کے مطابق انجیل والوں کا انجیل کے مطابق، اور زبور والوں کا زبور کے مطابق اور اہل قرآن کا قرآن پاک کے ارشاد کے بہ موجب فیصلہ وحکم جاری کروں گا۔ یہاں تک کہ قیامت میں یہ کتابیں خود اس بات کہ شہادت دیں گی۔"

۱۰- حافظ ابونعیم اصفہانی کا شمار اکابر علماء وفاضل میں ہوتا ہے، انہوں نے اپنی کتاب، انزل من القرآن فی علی، میں حضرت ابن عباس سے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے کہ۔ ایک دن حضرت رسولؐ نے وضو کے لئے پانی طلب فرمایا۔ اور وضو سے فارغ ہونے کے بعد حضرت علیؑ کا ہاتھ تھام کر اپنے سینۂ مبارک پر رکھا اور کلام اللہ کی آیت کا یہ ٹکڑا پڑھا "انما انت منذر" پھر اپنا ہاتھ علیؑ کے سینہ پر رکھا اور فرمایا۔ "اے علیؑ، تم خلائق کو نُور عطا کرنے والے اور راہِ ہدایت دینے والے اور قاریان قرآن کے امیر ہو۔"

اس روایت کی تصدیق ابو بردہ اسلمی نے بھی شواہد التنزیل میں کی ہے۔ دراصل حضرت علیؑ مرتضیٰ کے یہاں مجاہدانہ اور مفسرانہ شان کی جو بہتات ہے اور مسکونوں، غریبوں، ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنے کا جو جذبہ تھا، وہی شعار اسلامی ہے، اب خواہ حالت نماز ہو، یا مصروف جنگ ہوں۔ گھر کے اندر ہوں یا تخت امانت وخلافت پر متمکن ہوں۔ اس عمل خیر کا اظہار ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی بھر آسودہ حال رہنے کا جو نسخۂ کیمیا امت خیر الوریٰ کے سامنے پیش کیا۔ وہ لباس سادہ میں مستور رہنا اور خشک جو کہ روٹی پانی مین بھگو کر، طعام کرنا شعار بنالیا تھا۔ اس سلسلے کا یہ واقعہ خوب ہے کہ:

ایک روز حضرت عمر بن حریثؓ حضرت علیؑ کے ناشتہ کے وقت ان کی خدمت میں

حاضر تھے۔ حضرت فضہؑ ایک مہر بند تھیلا لے کر آئیں۔ حضرت نے وہ مہر توڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بغیر چھنے ہوئے آٹے کی خشک روٹی ہے۔ اسے علیؑ مرتضٰی نے ایک برتن میں پانی لے کر بھگویا اور نمک کے ساتھ کھانا شروع کر دیا۔ میں نے جب حضرت فضہؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں تو آٹا چھان کر پکایا کرتی تھی مگر مولا نے منع کر دیا اور بعد میں مُہر لگا کر روٹی رکھنے کا حکم عطا کیا۔ میری یہ گفتگو سن کر علیؑ مرتضٰی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اے عمر بن حریثؓ! اجل نزدیک آ پہنچی ہے'' پھر دست مبارک اپنے چہرے پر پھیرتے ہوئے ارشاد کیا۔ ''میں اس اپنی اس ریش کو آگ سے آشنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے مجھے یہ خشک روٹی ہی مرغوب ہے۔''

مالکِ اَرض وسما نے ۲۱ر رمضان المبارک کو شہر کوفہ کی مسجد جامعہ میں بحالت نماز حضرت علیؑ کو اپنے پاس بلالیا۔ آپ نے ۱۹ر رمضان المبارک کی صبح مسجد کوفہ میں آخری بار اَذان بلند کی۔ نمازیوں کو جگایا اور نماز جماعت کی اقتدا شروع کی۔ کہ ابن ملجم نامی ایک اعرابی نے حالت سجدہ میں آپ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ زہر آلود تلوار کا حملہ پھر رسول اللہ کے آغوش کے پلے کو، دوبارہ سجدہ کرنے کی مہلت نہ دے سکا۔ مگر جب طبیعت کو ذرا قرار آیا تو شکر ربی کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا:

''بخدا علی کامیاب ہوا''

اور اس امر کی شہادت تاریخ نگار دینے کے لئے آمادہ ہیں کہ عبادت و ریاضت میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ چنانچہ ایک بار حضرت امام زین العابدینؑ نے جو عبادات خداوندی ریاضت میں مشہور تھے، فرمایا تھا۔ حضرت علیؑ کی ایک شب میں ہزار تکبیروں تک کا شمار لوگوں نے کیا ہے۔ اسی لئے آپ کو قائم اللیل وصائم الدہر کا بھی خطاب دیا گیا ہے۔ آپ کے آرام کے واسطے ایک چمڑے کا ٹکڑا تھا اور کوئی سامان آرائش گھر مین نہ تھا۔ علیؑ مرتضٰی زندگی کے آخری ایام تک اپنی پیٹھ پر جَو، گیہوں اور خرمہ لاد کر رات کی تاریکی میں غریب اور مفلس اشخاص کو پوشیدہ طور پر دے آتے۔ اور کسی کو بھی علم نہ ہوتا بلکہ علیؑ مرتضٰی کی وفات کے بعد لوگوں کو اس بات کا علم ہو سکا کہ ہماری امداد جن ہاتھوں سے ہوا کرتی تھی وہ اب ہمارے درمیان نہ رہی۔ یہی سلسلہ اولادِ علی کو ورثے کے طور پر ملا۔ جس کا سلسلہ عہد موعودؑ تک باقی رہا بلکہ اب بھی جاری ہے۔

☆☆☆

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے معروف محقق، سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کی کتھا

(از جناب اقبال خورشید، سب ایڈیٹر روزنامہ ایکسپریس کراچی، ۸ر فروری ۲۰۱۲ء)

جب انہوں نے اپنی کتاب زندگی کی ورق گردانی شروع کی، تو سماں یہ تھا کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!''

85 سالہ اس محقق کے لفظوں میں بسی پھولوں سی مہک اور لہجے میں دوڑتی زندگی کی رمق سامع کو ایک نئی دنیا سے متعارف کرواتی ہے۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے سید مرتضیٰ

> ☆ پاکستان اور ہندوستان، دونوں ہی ملکوں میں اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے کام ہو رہا ہے، لیکن پاکستان کا کینوس زیادہ وسیع ہے کہ یہاں تقسیم کے بعد موضوعات ومسائل کی کئی جہتیں سامنے آئیں، جن پر اہل علم نے قلم اٹھایا۔ آج ہندوستان کے تمام بڑے دانشور اردو کو دیوناگری رسم الخط میں ڈھالنے کے خیال کی مخالفت کر رہے ہیں۔

حسین بلگرامی یوں تو وزارتِ اطلاعات اور وزارتِ تعلیم سے متعلق رہے، تاہم پیشہ ورانہ کام یابیوں سے زیادہ اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو اہم گردانتے ہیں، جن کی پاک وہند کے علمی وادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔ اس سفر میں انہوں نے عظمت اللہ بے خبر پر کام کیا، اقبال کے کلام کو توجہ کا مرکز بنایا، غالب کے ضمن میں چند انوکھے تجربات کیے، تاہم اصل کارنامہ ''اکابرِ بلگرام'' کے حالات وخدمات قلم بند کرنا تھا۔ اپنے اسلاف کے احوال زیست کے تعاقب میں مشکلات تو پیش آئیں لیکن وہ مصمم ارادہ کر چکے تھے، سو منزل پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ اس عمر میں بھی بلگرامی صاحب کی صحت قابل رشک ہے، جس کا بنیادی سبب ان کو خوش مزاجی، شائستگی وشگفتگی ہے، جو قدیم اخلاقی روایات کی عکاسی ہے۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی ۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء کو کواتھ، ضلع شاہ آباد بہار میں پیدا ہوئے۔ وہ ''تاریخ بلگرام'' کے مصنف، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے پڑپوتے ہیں، جو اسد اللہ خاں غالب اور مرزا دبیر کے شاگرد رہے۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ان کے والد، سید ابو

محمد بلگرامی کی کواتھ میں زمیں تھیں، سوان کا ابتدائی بچپن وہیں گزرا۔ سات بھائی، تین بہنوں میں ان کا نمبر چوتھا ہے۔ علمی وادبی ماحول وراثت میں ملا، سو خرافات سے دُور رہے۔ کھیلوں میں فٹ بال سے دل چسپی تھی۔ خاندانی طریق کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر اَتالیق کے زیر نگرانی حاصل کی۔ پھر سہسرام کا رخ کیا،

اردو کا خاتمہ ہندوستان کے مفاد میں نہیں!
ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی تحقیق میں صرف کی

جہاں چچا وکالت کرتے تھے۔ وہاں مدرسہ خانقاہ کبیریا میں زیر تعلیم رہے۔ ان ہی دنوں علمی دوستی نے دل میں قلمی اخبار نکالنے کی خواہش جگائی۔ کمر کس کر میدان عمل میں کود پڑے۔ مضامین جمع کرنے کا ذمہ ان کے کاندھوں پر تھا، جنھیں ساتھی طالب علم کلیم سہسرامی تحریری شکل دے دیتا۔ وہ اخبار مدرسے کے پرنسپل کو بھی دکھایا، جسے انھوں نے بہت پسند کیا۔

اب انھوں نے پٹنہ کا رُخ کیا، اور مدرسۂ سلیمانیہ سے مولوی کا کورس کیا۔ پھر انگریزی تعلیم کی جانب آ گئے۔ دہلی پہنچے، جہاں پھوپھا مقیم تھے۔ پنجاب بورڈ کے تحت اعلیٰ نمبروں سے ایک امتحان پاس کیا، جو اس زمانے میں آٹھویں کے مساوی تھا۔ میٹرک کا مرحلہ طے کرنے کے بعد ان کا پیشہ ورانہ سفر شروع ہوا، اور وہ راشننگ آفس، دہلی سے بہ طور انسپکٹر ۴۵ روپے ماہ وار پر منسلک ہو گئے۔ خاندان خوش حال تھا، سو کم تن خواہ کے باوجود کسی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر تنہا یہ رقم بھی کافی تھی۔ ملازمت کے دوران تعلیمی سلسلہ ضرور منقطع رہا، لیکن علمی وادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ چند برس کے وقفے کے بعد دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا حصہ بن گئے، جہاں سے سندیں حاصل کیں۔ خاندانی اقدار کے طفیل ابتدا ہی سے اہل علم سے وابستگی رہی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر عبدالعلیم صدیقی، پروفیسر سید عابد حسین اور سابق صدر ہندوستان، ڈاکٹر ذاکر حسین سمیت کئی دانش وروں سے رابطہ رہا۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں خاصے سرگرم رہے، اور ایک کارکن کی حیثیت سے فعال کردار اَدا کیا۔ ماضی بازیافت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلم لیگ حقیقتاً ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ ''یوں تو مسلمانوں کی اور بھی تنظیمیں تھیں، لیکن وہ مسلم لیگ جتنی طاقت وَر نہیں تھیں، جب کہ کانگریس میں شامل زیادہ تر مسلمان نیشلسٹ تھے۔'' ان کے بہ

قول، قیام پاکستان کے وقت ان کے وہی احساسات تھے، جو ہندوستان میں بسنے والے دیگر مسلمانوں کے تھے، کہ یہ ایک اجتماعی معاملہ تھا۔

تقسیم کے تعلق سے کہتے ہیں۔ ''یہ تو ہونا ہی تھا۔ دیکھیں، بہار میں فسادات ہوئے، بنگال میں فسادات ہوئے کانگریس نے بھی اس تقسیم کو تسلیم کیا'' قیام پاکستان کے بعد خاندان کے کئی افراد نے ہجرت کی، لیکن انہوں نے ملازمت اور دیگر وجوہات کی بناء پر وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ البتہ پاکستان آنا جانا رہا۔ بتاتے ہیں، جس روز ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی تھی، اتفاقاً ٹھیک اسی روز انہوں نے واگہہ بارڈر عبور کر کے پاکستان میں قدم رکھا تھا۔

۱۹۵۸ء میں وہ منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، نئی دہلی سے منسلک ہوگئے۔ پریس کے معاملات کی دیکھ ریکھ ان کے کاندھوں پر تھی۔ اس زمانے کی یادیں کھنگالتے ہوئے وہ ایک واقعہ کا خصوصی طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ان کے بہ قول، جب لیاقت علی خان کا قتل ہوا، وزیر اعظم آفس سے فون آیا کہ کوئی ایسا آدمی بھجوایا جائے، جو اردو اور انگریزی لکھنا جانتا ہو۔ یوں تو اردو زبان سے واقفیت رکھنے والے کئی تھے، لیکن انفارمیشن آفیسر، جگن ناتھ آزاد نے ان کا انتخاب کیا۔ وہ وزیر اعظم ہاؤس پہنچے۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ جواہر لعل نہرو کے سامنے کھڑے تھے، جو اس وقت میز پر بکھرے کاغذات میں الجھے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ''ڈکٹیٹ'' کروانا شروع کیا۔ بتاتے ہیں، ''جواہر لعل نہرو کا اپنا مخصوص انداز تھا، وہ خود کو بہت زیادہ دُہراتے تھے۔'' خیر، ڈکٹیشن کے بعد لکھا ہوا پڑھ کر سنایا، جسے وزیر اعظم نے مناسب خیال کیا۔ انہوں نے وَرق آگے بڑھا دیا کہ ''اس پر دستخط کر دیں!'' جواہر لعل نہرو نے تحریر کے نیچے دستخط کر دیے۔ بعد میں یہی بیان جاری ہوا۔ اس واقعے کا بہت چرچا ہوا۔ ان کے بہ قول، ''لوگوں نے کہا، یہ کام بلگرامی صاحب کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا کہ وزیر اعظم سے دستخط کروا لے! دراصل میں نے اس لیے دستخط کروائے کہ وہ ایک اہم واقعے کے حوالے سے تحریری صورت میں جاری ہونے والا سرکاری بیان تھا، جو ریکارڈ وغیرہ نہیں ہوا تھا۔''

چند برس بعد وہ صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، خواجہ احمد فاروقی بلکہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی خواہش پر سکریٹری، ڈپارٹمنٹ آف اردو کی حیثیت سے اس ادارے کا حصہ بن گئے۔ چند سال وہاں بیتے۔ جب پروفیسر عبدالعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، ان کے کہنے پر وہ ۱۹۶۹ء میں اس جامعہ سے منسلک ہوگئے۔ وہیں سے ۱۹۹۰ء میں ریٹائر

ہوئے۔ان برسوں میں بھر پور پیشہ ورانہ زندگی گزاری۔ چند برس وزارت تعلیم سے بھی منسلک رہے۔ گو کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمت کی پیش کش ہوئی تھی، لیکن وہ خود کو کلی طور پر تحقیق کے لئے وقف کر چکے تھے، سو انکار کر دیا۔ ریٹائرمینٹ کے بعد کی زندگی تحقیق میں صرف کر رہے ہیں۔

اس پورے عرصے میں علمی و ادبی سطح پر سرگرم رہے۔ تحقیقی مضامین باقاعدگی سے اخبارات و جراید میں شایع ہوتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں انہوں نے پاک و ہند کے نامور ادیبوں کے حالات زندگی، ان کے دستِ قلم سے لکھوانے، اور انہیں محفوظ کرنے کا انوکھا سلسلہ شروع کیا۔ اس ضمن میں ہندوستان میں مقیم ادیبوں سے ملاقات کی۔ پاکستان کو اپنا مسکن بنانے والے قلم کاروں سے رابطہ کیا۔ ان کے پاس ساڑھے تین سو سے زائد ادیبوں کے، ان کے تحریر کردہ خطی تذکرے محفوظ ہیں، جن میں ابن انشاء، ابراہیم جلیس، ساحر لدھیانوی، نادم سیتاپوری، مخدوم محی الدین، جمیل جالبی، سجاد ظہیر اور مشفق خواجہ ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی وغیرہ سمیت کئی اہل قلم و دانش ورشامل ہیں۔ اس منصوبے کو کتابی صورت دینے کا قوی ارادہ ہے لیکن تحقیقی معاملات میں ایسے الجھے ہیں کہ یہ کام اب تک مکمل نہیں ہوسکا۔

تخلیقات کی بات کی جائے تو ان کی ایک کتاب ''انشائے بے خبر'' کے عنوان سے شائع ہوئی، جسے ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ کہتے ہیں، اردو ادب میں غالب کے خطوط کو ابتدا ہی سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے، تاہم تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس معاملے میں عظمت اللہ بے خبر کو اولیت حاصل ہے، جو غالب سے پہلے کے زمانے کے ہیں۔ اسی خیال کے تحت یہ کتاب مرتب کی۔

ایک کتاب ''بال جبرئیل مع مقدمہ و فرہنگ'' کے نام سے منظر عام پر لائے۔ ان کے بہ قول، علامہ اقبال کے مجموعے ''بال جبرئیل'' میں ایسی کئی تلمیحات ہیں، جو کسی طور آسان نہیں، اسی لیے عوام کی ذہنی استعداد کو سمجھتے ہوئے اس کتاب کی فرہنگ مرتب کی۔ غالب کا کلام، مطالعے و تحقیق دونوں ہی کا محور رہا۔ اپنی کتاب ''مکالمۂ غالب'' میں انہوں نے غالب کے خطوط کو مکالموں میں تبدیل کر کے ڈرامے کی شکل دینے کا انوکھا تجربہ کیا۔ ''غالب نُما'' میں غالب کی جاذب نظر اور اہم تحریروں کو یک جا کر دیا ہے۔ دونوں ہی کتابوں کی علمی و ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی۔

وہ چار حج اور سات عمرے کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ پہلی بار حج سے

لوٹنے کے بعد خیال آیا، دَوران حج لوگ صحیح ارکان اَدا نہیں کر پاتے، سو ''اعمال عمرہ وحج'' کے نام سے ایک کتابچہ مرتب کیا۔ عراق اور شام کا سفر کیا، تو ''اعمال وزیارت عراق'' اور ''اعمال وزیارت شام'' کے نام سے کتابیں مرتب کیں، جن میں ان مقامات کی تاریخ بھی بیان کی۔ چوں کہ تعلق خاندان زید شہید سے ہے، سو اپنے جدامجد کی بابت ''حالات جناب زید شہید'' نامی ایک کتاب لکھی۔ پاک وہند کے مختلف جریدوں میں ان کے مضامین شایع ہوتے رہے ہیں، جن کا مجموعہ زیرطبع ہے۔

پھر ''اکابر بلگرام'' کی حیات وخدمات قلم بند کرنے کا خیال آیا۔ یہ منصوبہ ''اکابر بلگرام'' کے عنوان سے شایع ہونے والی، دوحصوں میں مشتمل کتاب کی صورت مکمل ہوا، جس میں مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی 143 نادر روزگار شخصیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ حصہ اول کا دیباچہ پروفیسر کبیر احمد جائسی اور حصہ دوم کا دیباچہ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے لکھا۔ مرتضیٰ حسین بلگرامی کے مطابق قصبہ بلگرام کو ضلع ہردوئی (اترپردیش) کا دل کہا جاتا ہے کہ یہ ایک مردم خیز علاقہ ہے، جسے سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں سید محمد صغریٰ زیدی الواسطی نے فتح کیا تھا۔ ان کے بہ قول، ''یہاں کے اکابرین فقط زبان وبیان یا علم ادب ہی پر قدرت نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان میں صوفیاء کی ایک جمعیت کثیر بھی تھی۔ چوں کہ میرا تعلق اسی خانوادے سے ہے، اس لیے نئی نسل کو اسلاف کی بابت معلومات فراہم کرنے کے ارادے سے اس منصوبے پر کام شروع کیا۔''

مرتضیٰ حسین بلگرامی کے مطابق آج پاکستان اور ہندوستان، دونوں ہی ملکوں میں، اپنے اپنے انداز میں اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے کام ہورہا ہے، لیکن پاکستان کا کینوس زیادہ وسیع ہے کہ یہاں تقسیم کے بعد موضوعات ومسائل کی کئی جہتیں سامنے آئیں، جن پر اہل علم نے قلم اٹھایا۔ مزید کہتے ہیں، ''ہندوستان میں سرکاری سطح پر پہلے ہندی، اور اب سنسکرت کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، جب کہ پاکستان میں درس گاہوں کی سطح پر اردو موجود ہے۔ گو کہ یہاں دیگر زبانیں بھی ہیں، لیکن اردو ان کے ساتھ چلنے، انہیں خود میں شامل کرنے کی قوت رکھتی ہے۔'' ان کے مطابق ہندوستان میں اردو کو ختم کرنے کی کوششیں ۱۹۴۷ء ہی میں شروع ہوگئی تھیں، لیکن اس معاملے میں ہندوؤں سے زیادہ وہاں کے مسلمان قصوروار ہیں، جو اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے۔ ان کے نزدیک اردو کا خاتمہ ہندوستان کے مفاد میں نہیں۔ اس ضمن میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کی مثال پیش کرتے ہیں،

جو اردو کے بغیر چل ہی نہیں سکتی کہ تمام گیت اور مکالمے اردو ہی میں ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مدارس کی وجہ سے ہندوستان میں اردو آج بھی زندہ ہے، اس زبان سے ملازمتوں کے مواقع بھی منتھی ہیں۔ اور اس زاویے سے ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں ڈھالنے کے خیال پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج ہندوستان کے تمام بڑے دانش ور اس خیال کی مخالفت کر رہے ہیں، اور اس نظریے کے حامل گروپ کو شدید مخالفت کا سامنا ہے۔

وہ خوش ہیں کہ انہیں قدر آور شخصیات کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ عزت واحترام سے نوازا گیا۔ تحقیقی سفر سے بھی زندگی کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ زندگی میں دکھ بھی کئی آئے۔ دہلی یونیورسٹی کے زمانے میں انہیں بلاسبب معطلی کا کرب سہنا پڑا تھا۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لئے کئی قد آور شخصیات سامنے آئیں، بالآخر مسئلہ ان کے حق میں حل ہو گیا، لیکن ان دنوں کی یاد انہیں افسردہ کر دیتی ہے۔

۱۹۴۹ء میں شادی ہوئی۔ خدا نے ایک بیٹی، پانچ بیٹوں سے نوازا۔ بیٹی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بتاتے ہیں، تمام بیٹے شادی شدہ ہیں، اور اب وہ دادا، نانا کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ خاندان کو بھرپور وقت دیا۔ چوں کہ بچے بہ آسانی گھر کے علمی ماحول سے ہم آہنگ ہو گئے تھے، سو کبھی سختی برتنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ زندگی سے مطمئن ہیں۔ لکھنے پڑھنے ہی سے مستقبل کے منصوبے منتھی کیے ہوئے ہیں۔

عام طور سے شیروانی پہنتے ہیں، اور اسے مسلمانوں کے مزاج کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ سادہ غذا پسند ہے۔ کہتے ہیں، ساری زندگی چائے، کوفی، سگریٹ اور بیڑی کا ہاتھ نہیں لگایا! گذشتہ کئی برسوں سے ہر صبح قرآن پاک کی تلاوت کرنا معمولات کا حصہ ہے۔ جس کی ابتداء مدینہ منورہ سے ۱۹۸۷ء میں کی تھی۔ مطالعہ وسیع ہے، سو پسند کے پیش نظر کسی ایک شاعر یا افسانہ نگار کا نام لینا ممکن نہیں۔ البتہ، اچھی شاعری پسند ہے۔

☆☆☆

اقلیم ادب کی رائے

پروفیسر کبیر احمد جائسی:

سابق استاد اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اکابرین بلگرام (حصہ اول)

اسی طرح حسان الہند علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کے بارے میں اتنا مواد فراہم کر دیا گیا ہے کہ اگر اس کو پھیلا کر لکھا جائے تو بلا مبالغہ اوسط حجم کی ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے اور یہ کوشش خاص طور سے قابل ستائش ہے کہ مرتب نے علامہ آزادی بلگرامی کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ خود علامہ آزاد بلگرامی کے افکار و تحریر سے ترتیب دیا ہے۔ اس تذکرۂ آزاد میں ان کے سفر کے احوال، شاعری پر ایک نظر اور جملہ تصانیف کا بھر پور تعارف کرا کے اپنے بعد کے لوگوں کو ترغیب دی ہے کہ اس موضوع پر ابھی بہت کام کرنے کی گنجائش ہے مگر اس وادی میں قدم رکھنے کے لیے۔

شرط اول قدم این است کہ مجنوں باشی

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی:

پروفیسر شعبۂ انگریزی وڈاریکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اکابرین بلگرام (حصہ دوم)

(۱) زیر نظر تذکرے کا ایک اور روشن پہلو یہ بھی ہے کہ فاضل مرتب تحقیق اور تدوین کے جدید معیارات اور آداب سے واقف ہیں، اپنی خوش عقیدگی اور ممدوحین سے اپنے والہانہ تعلق کے باوصف ان کی یہ کاوش ہے کہ مستند معلومات منظر عام پر آئیں۔ وہ روایات میں اختلاف اور اس کے مفسرات اور انسلاکات کے بھی شناور ہیں، لہٰذا بعض مقامات پر مختلف یا مخالف نقطۂ ہائے نظر کی پُر جوش اور مسکت تردید بھی ملتی ہے۔ البتہ فاضل مرتب کی اصل جولانگاہ تاریخی حقائق اور واقعات سے نتائج اخذ اور مستنبط کرنا ہے، جس میں وہ کامیاب اور کامران رہے ہیں، موصوف ہند-اسلامی تہذیب کے مظاہر، اقدار اور روایات کے پاسدار اور امین ہیں۔ یہ فکر ان کی تذکرہ نگاری پر مستولی ہے۔

(۲) اس پُر مغز اور لذیذ حکایت کی توسیع اور توضیح ہے اس میں شامل چند موقر اور نادر روزگار شخصیات یہ ہیں۔ شاہ سید العارفین، سید لطف اللہ شاہ لدھا بلگرامیؒ، علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی (اور ان کے دو ہم نام نامور متاخرین)، میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی، سید آل امامؒ، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سید وصی احمد فانی بلگرامی، فوق بلگرامی،، ڈاکٹر سید انعام احسن حریف مارہروی، سید غلام حسنین قدر بلگرامی، سید افتخار عالم آزاد بلگرامی، شاہ سید علی احسن، احسن مارہروی، سید سرور علی بلگرامی ثم سوامی مارہروی، سید محمد عباس بلگرامی، سیدہ فاطمہ کبری عرف اولیاء بی بی، سیدہ حجاب بلگرامی، سید آل عبا زیدی مارہروی (آوارہ) اور دیگر اکابر بلگرام وغیرہ ہیں۔

اس تصنیف کے فاضل مرتب کہنہ مشق صاحب قلم ہیں، دس (۱۰) سے زائد کتابوں اور بے شمار مضامین کے مصنف، زبان اور بیان اور اسلوب کی شگفتگی، آمد کی کیفیت، گو بعض مقامات پر اس کے ڈانڈے عایت بے تکلفی اور غیر رسمی اور گفتگو کے اسلوب سے مل جاتے ہیں، مگر زبان اور محاورے کی صحت اور نزاکتوں سے آہنگی، برمحل اشعار کا انتخاب، اپنے ممدوحین کے نمایاں خدوخال کو سلیقے اور حزم و احتیاط کے ساتھ اُجاگر کرنا اور پورے تذکرے کو ایک لڑی میں پروئے رکھنا اس تصنیف کے مزید امتیازی اور خوش کن پہلو ہیں۔

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸	۱۷	اندز	انداز
۱۲	۱۹	اصلاح	کی صلاح
۱۶	۷	ڑھائی	ڈھائی
۸۶	۱۴	بہار	بہا
۸۷	۱۹	ط	مربوط
۸۸	۱۰	صغیر	صفیر
۹۰	۲۷	باغت	بلاغت
۹۲	۲۲	بابر	باہر
۱۲۸	۱۸	مظلم	مظلمہ
۱۶۹	۷	قف	واقف
۱۷۱	۱۹	خل	دخل
۱۷۶	۱۷	کو	کا
۲۱۷	۱۳	جیس	جیسی
۲۲۳	۲۴	کی	کو
۲۲۴	۵	تشرف	تشریف
۲۲۸	۱۱	میں	اسے کاٹ دیں
۲۵۵	۲۷	کرادار	کردار
۲۵۶	۲	ب	عیب
۲۵۶	۴	اشوب	پرُآشوب
۳۱۲	۵	ممدوچین	ممدوحین



پروفیسر عبدالسلام، یونیورسٹی بک پر دستخط کرتے ہوئے



صدر ہندوستان گیانی ذیل سنگھ اور مرتضیٰ حسین بلگرامی، مغل گارڈن،



صدر ہند گیانی ذیل سنگھ، مرتضیٰ حسین بلگرامی سے محو کلام (کنووکیشن مسلم یونیورسٹی)



علی گڑھ بچوں کا گھر: مرتضیٰ حسین خطبہ دیتے ہوئے ہمراہ امان اللہ خاں وغیر



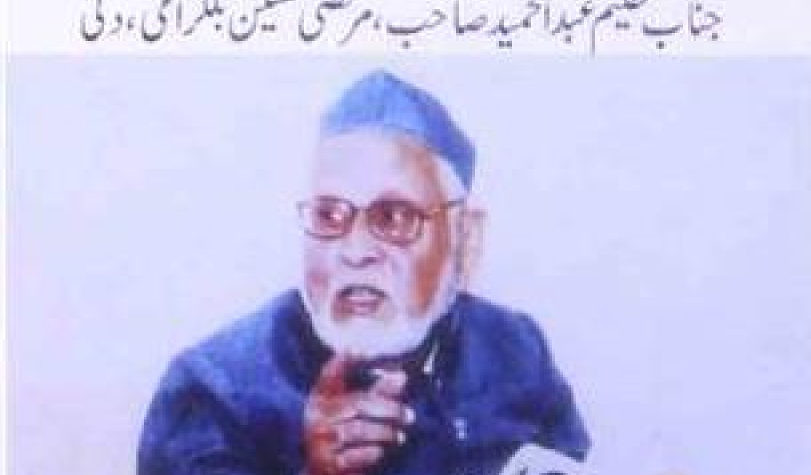
وزیر اعلیٰ بہار عبدالغفور (طالب علم وی ایم ہال) استقبالیہ مرتضیٰ حسین بلگرامی



جناب حکیم عبدالحمید صاحب، مرتضیٰ حسین بلگرامی، دلی



غالب اکیڈمی، دلی - گورنر ہریانہ برنی صاحب
و سید حامد وائس چانسلر اور پروفیسر آل احمد سرور و مرتضیٰ حسین بلگرامی

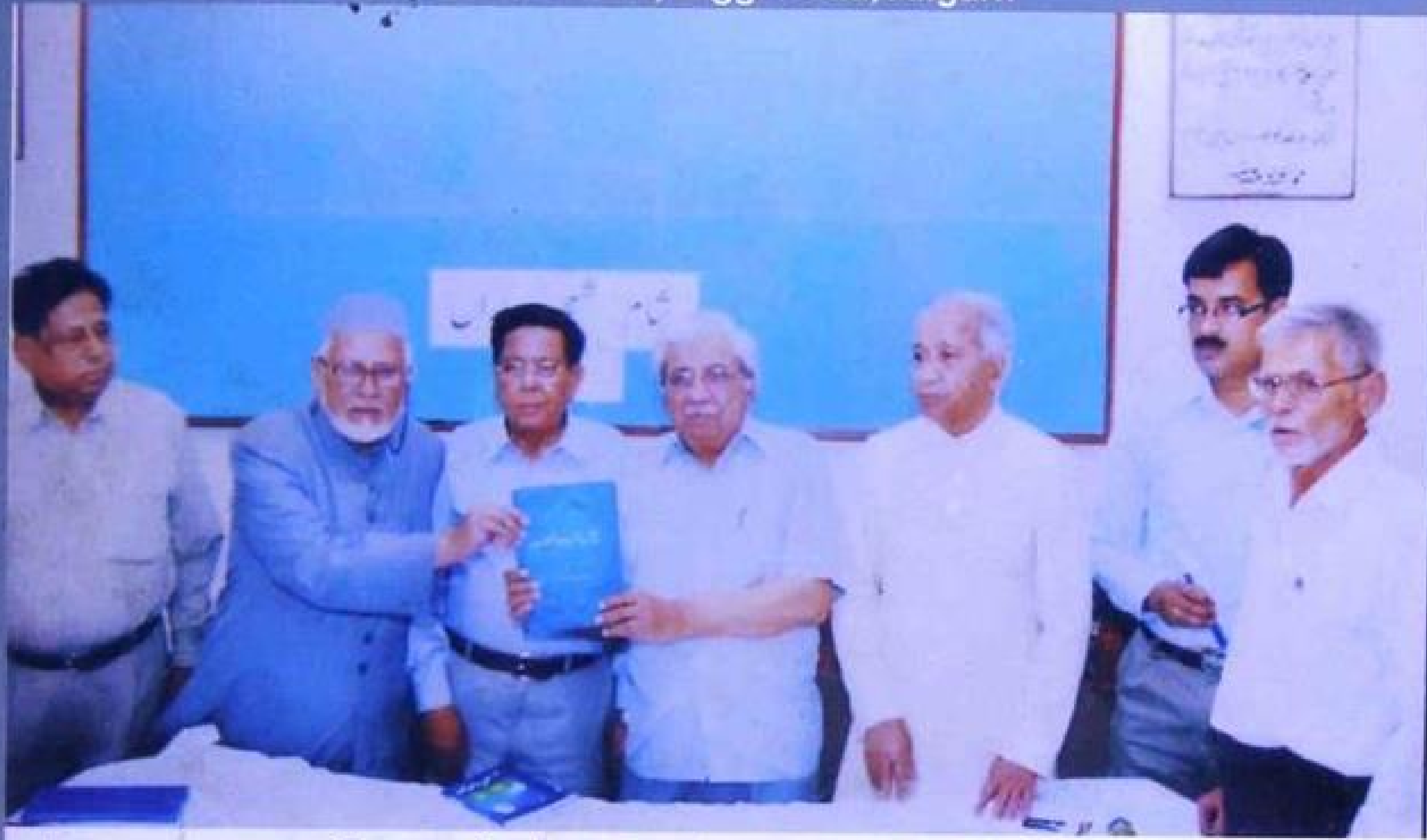


مرتضیٰ حسین بلگرامی انٹرویو دیتے ہوئے، شہر کراچی

Meer Ghalib Ke Hareef

By : S. Murtaza H. Bilgrami

Book Centre, Diggi Road, Aligarh



عون محمد　رضا حیدر　حکیم ظل الرحمٰن　صدیق الرحمٰن قدوائی　خلیق انجم　مرتضی حسین　شاہد ماہلی

روز اجراء تذکرہ جلوہ خضر و تاریخ بلگرام (صفیر بلگرامی)، غالب انسٹی ٹیوٹ، دلی



رسم اجرا کتاب راس مسعود: پروفیسر ذکیہ صدیقی، سید مرتضی حسین بلگرامی، مخاطب بہ نائب صدر ہندستان جناب حامد انصاری
اور نواب ابن سعید چھتاری وغیرہ، وائس پریسیڈنٹ ہاؤس (نئی دہلی)